Registered No. L. 4584

وری ۱۹۴۲ء | جلد ۶ عدد ۱

وری ۱۹۴۲ء | جلد ۶ عدد ۲

۷۸۶

اشاعت خاص

شرح جاوید نامہ

ماہنامہ

پیغامِ حق

اِصلاحی اور اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا مجموعہ

مرتبہ

سیّد محمّد شاہ ایم۔اے

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چار روپے

قیمت پرچہ ہذا بارہ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

پیغام حق مارچ ۱۹۳۷ء میں جاری کیا گیا تھا مگر ایڈیٹر کی مسلسل علالت اور بعض دیگر مجبوریوں کی وجہ سے ۱۹۳۷ء میں صرف چار پرچے نکل سکے ۱۹۳۸ء میں تین اور ۱۹۳۹ء میں دو۔ بفضل خدا اب دو اڑھائی سال سے رو بصحت ہوں اور جنوری ۱۹۴۰ء سے پیغام حق مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ الحمد للہ کہ اس دوران میں ایک پرچہ کا بھی ناغہ نہیں ہوا۔ ہاں، اس قدر ضرور ہوا کہ کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے جنوری و فروری کا پرچہ قدرے تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ خدا کو منظور ہوا تو آئندہ حسب سابق بروقت شائع ہوتا رہے گا۔

پیغام حق کا مقصد جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہے اس مقصد کو بر لانے کے لئے کبھی تو علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے افکارِ قرآنیہ کی تشریح و توضیح کی جاتی ہے اور کبھی براہِ راست قرآن و حدیث کے بعض مطالب پر مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ پیغام حق کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس ادارہ کی مساعی استحسان کی نگاہوں سے دیکھی جانے لگی ہیں۔

اس پرچہ میں مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری شیخ الحدیث جامعہ دارالسلام عمر آباد (مدراس) کا ایک فاضلانہ مضمون جاوید نامہ کی شرح پر شائع کیا جا رہا ہے۔ جاوید نامہ حضرت علامہ ڈاکٹر اقبال کی ایک قیمتی فارسی کتاب ہے۔ اس کی شرح کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی خدا کا شکر ہے کہ سید صاحب موصوف نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ شرح کا ایک حصہ اس پرچہ میں شائع ہو رہا ہے۔ بقایا انشاء اللہ العزیز دو قسطوں میں چھپ جائے گا۔ اس کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے دو مضمون بھی اس پرچہ میں دیئے جا رہے ہیں۔ اُن کا مطالعہ انشاء اللہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔

اس پرچہ سے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ قرآنِ مجید کے مطالب مسلسل بیان کرنے شروع کریں۔ راقم الحروف نے آج

سے چند سال پہلے قرآنِ مجید کا بامحاورہ اردو ترجمہ لکھا تھا اور مطالب کو واضح کرنے کے لئے حاشیہ پر تفسیری نوٹ لکھے تھے۔ اِس ترجمہ کو "مطالب الفرقان فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے لاہور کی مشہور بلاک ساز کمپنی پیکو آرٹ پریس نے شائع کیا ہے چونکہ تفسیری نوٹ بالکل آسان اور سادہ اردو میں لکھے گئے تھے اور تسلسل مضامین اور ربط آیات کو پیش نظر رکھنے کی بہت کوشش کی گئی تھی اِس لئے یہ کوشش بہت حد تک کامیاب بھی ہوگئی۔ مگر کمپنی نے اِس نسخہ قرآن کا ہدیہ پنتالیس ۴۵ اور پچیس ۲۵ روپے رکھ دیا جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی حاصل کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ اِس کے باوجود ہزارہا کی تعداد میں یہ نسخہ قرآن پاک لوگوں کے گھروں میں پہنچ گیا ہے۔

کچھ عرصہ سے راقم الحروف کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو قرآن مجید کے لفظی تراجم کی ضرورت نہیں بلکہ مطالب قرآن کی ضرورت ہے۔ نیز اپنا تجربہ بھی یہ بتا رہا ہے کہ قرآنِ مجید کا ایک ایسا لفظی ترجمہ جو روحِ قرآنی کو بالکم کاست ظاہر کردے تقریباً ناممکن ہے۔ اردو زبان میں لکھنے والے علمائے کرام میں سے حضرت مولانا ابو الکلام آزاد ایک ایسے جید عالم ہیں جن کو اردو اور عربی دونوں زبانوں پر ایک جیسا عبور ہے فی الحقیقت اُن کا ادبی ذوق اتنا بلند ہے کہ سرزمین ہند میں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے اِس کے باوجود اُنہوں نے قرآنِ مجید کا جو ترجمہ لکھا ہے وہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا تفسیری بامحاورہ ترجمہ ہے اور حق یہ ہے کہ آج تک اُردو زبان میں جس قدر تراجم شائع ہو چکے ہیں افادی لحاظ سے یہ اُن سب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

قرآنِ مجید کے اُردو تراجم لفظی اور بامحاورہ بہت شائع ہو چکے ہیں۔ جو حضرات اُن سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں وہ بآسانی اُٹھا سکتے ہیں اور اٹھا رہے ہیں۔ مگر میرے علم میں مطالب قرآن کو بیان کرنے کی غرض سے اب تک آزاد ترجمہ (FREE TRANSLATION) شائع نہیں ہوا جس کے مطالعہ سے وہ حضرات بھی فائدہ اُٹھا سکیں جو عربی زبان نہیں جانتے یا وہ جو مسلمان نہیں ہیں۔ اس وقت ہم مسلمانوں کے اندر ایک جماعت ایسی بھی ہے جن کو قرآنِ کریم کے نفسِ مضمون (TEXT) ہی کا علم نہیں ہے۔ وہ اتنا تو جانتے ہیں کہ قرآن پاک ایک الہامی کتاب ہے۔ خدا کا کلام ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک

پہنچا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ اس کے اندر کیا لکھا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے ایسے بھائیوں کو اُن کی اپنی زبان میں یہ بتا دوں کہ قرآن کے اندر کیا ہے۔ علاوہ ازیں میرے علم میں غیر مسلمانوں میں بھی ایک بڑی اکثریت ایسی ہے جو یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ قرآن کہتا کیا ہے مگر اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو اس قدر آسان زبان میں لکھی گئی ہو جو غیر مسلم حضرات پڑھ سکتے ہوں اور وہ قرآن پاک کے مطالب کو پیش کرتی ہو۔ اس ضرورت کے پیش نظر میں نے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور خدا کے فضل و کرم سے اس پرچہ سے سولہ صفحے "مطالب القرآن" کے پیغام حق میں شائع کرنے شروع کروں گا۔

یہ مطالب القرآن اُس مطالب الفرقان سے بالکل جدا چیز ہے جو میں نے ہیکو آرٹ پریس کو لکھ کر دیا تھا۔ اس میں لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کے مطالب ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید کا عربی متن بھی نہیں دیا گیا۔ اس کی دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ رسالہ میں عربی متن کی اشاعت سے قرآن مجید کے احترام میں کچھ فرق آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر غیر مسلموں تک یہ چیز پہنچانا مقصود ہے تو اُن کے لئے عربی متن کی ضرورت نہیں۔ تاہم جو حضرات عربی متن کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیں اُن کی سہولت کے لئے آیات کے نمبر گول دائرہ میں لکھ دیئے ہیں۔ نیز رکوع وغیرہ کے نشانات بھی قائم رکھے ہیں۔

میں نے اپنی حد تک مطالبِ قرآنیہ کو سمجھنے اور اُن کے واضح کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات میری سمجھ میں آئے ہی نہ ہوں اور بعض کو میں نے غلط سمجھا ہو۔ اس کے لئے میں اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اُس سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے اس ناچیز بندے کو اپنے کلام پاک کے سمجھنے کی توفیق عطا کرے اور صراط مستقیم پر چلنے کی ہمت و جرأت ارزانی کرے۔ "وَيَرْحَمَ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِيْنًا۔"

جن بھائیوں کو میرے اغلاط اور میری تحریر کے اسقام نظر آئیں اُن سے میری درخواست ہے کہ وہ مجھے ان سے مطلع فرمائیں تاکہ جب یہ "مطالب القرآن" کتابی شکل میں شائع ہو تو اُس وقت اس میں کوئی سقم باقی نہ ہو۔ میں ایسے تمام ہمدردوں اور محسنوں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں گا۔

خواجۂ من! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش

اے کہ ز من فزودۂ گرمئ آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را

با دلِ ما چہا کنی! تو کہ بہ بادۂ حیات
مستئ شوق مے دہی آب و گلِ پیالہ را

غنچۂ دلِ گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے
تازہ کن از نسیمِ من داغِ درونِ لالہ را

می گذرد خیالِ من از مہ و مہر و مشتری!
تو بہ کمیں چہ خفتۂ، صید کن ایں غزالہ را

خواجۂ من! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را

(ز بورِ عجم) (اقبال)

فقہ اسلامی میں اجتہاد

اسلامی قانون کوئی ساکن اور منجمد قانون نہیں ہے کہ ایک خاص زمانہ اور خاص حالات کے لیے اس کو جس صورت پر مرتب و مدوّن کیا گیا ہو، اُسی صورت پر وہ ہمیشہ قائم رہے، اور حالات، مقامات اور زمانہ کے بدل جانے پر بھی اُس صورت میں کوئی تغیر نہ کیا جا سکے۔ جو لوگ اس قانون کو ایسا سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ وہ اسلامی قانون کی روح ہی کو نہیں سمجھے ہیں۔ اسلام میں دراصل شریعت کی بنیاد حکمت (WISDOM) اور عدل (JUSTICE) پر رکھی گئی ہے۔ تشریع (قانون سازی) کا اصل مقصد بندگانِ خدا کے باہمی معاملات اور تعلقات کی تنظیم اس طور پر کرنا ہے کہ ان کے درمیان مزاحمت اور مقابلہ کے بجائے تعاون اور امداد باہمی اور ہمدردانہ اشتراکِ عمل ہو۔ ایک دوسرے کے متعلق ان کے فرائض اور حقوق ٹھیک ٹھیک عدل اور توازن کے ساتھ مقرر کر دیے جائیں۔ اور اجتماعی زندگی میں نہ صرف یہ کہ ہر شخص کو اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرنے کے پورے مواقع ملیں، بلکہ وہ دوسروں کی شخصیت کے نشوونما میں بھی مددگار ہو، یا کم از کم دوسروں کی ترقی میں مانع و مزاحم بن کر موجبِ فساد نہ بن جائے۔ اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے فطرتِ انسانی اور حقائق اشیاء کے اُس علم کی بنا پر، جو اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں چند ہدایات دی ہیں، اور اس کے رسول نے اسی کے دیے ہوئے علم سے اُن ہدایات کو عملی زندگی میں نافذ کر کے ہمارے سامنے ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ یہ ہدایات اگرچہ ایک خاص زمانے اور خاص حالات میں دی گئی تھیں اور ان کو ایک خاص سوسائٹی کے اندر نافذ کرایا گیا تھا، لیکن ان کے الفاظ سے، اور اُن طریقوں سے جو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عمل کا جامہ پہنانے میں اختیار فرمائے تھے، قانون کے چند ایسے وسیع اور ہمہ گیر اصول نکلے ہیں جو ہر زمانے اور ہر حالت میں انسانی سوسائٹی کی عادلانہ تنظیم کے لیے یکساں مفید اور قابلِ عمل ہیں اسلام میں جو چیز ثابت (PERMANENT) اور ناقابل تغیر و تبدل ہے وہ یہی اصول ہیں۔ اب یہ ہر زمانے کے مجتہدین کا کام ہے کہ عملی زندگی میں جیسے جیسے حالات اور حوادث پیش آتے جائیں، ان کے لیے شریعت کے اصولوں سے احکام نکالتے چلے جائیں، اور معاملات میں اُن کو اِس طور پر نافذ کریں کہ شارع کا اصل مقصد پورا ہو۔ شریعت کے اصول جس طرح ثابت اور غیر متبدل ہیں اُس طرح وہ قوانین ثابت اور غیر متبدل نہیں ہیں جن کو انسانوں نے اُن اصولوں پر متفرع کیا ہے، کیونکہ وہ اصول خدا نے بنائے ہیں، اور یہ قوانین انسانوں نے مرتب کیے ہیں، وہ تمام ازمنہ و امکنہ اور احوال و حوادث کے لیے ہیں، اور یہ خاص حالات اور خاص حوادث کے لیے۔

تجدید کے لیے چند ضروری شرطیں پس اسلام میں اس امر کی پوری وسعت رکھی گئی ہے کہ تغیر احوال اور خصوصیات حوادث کے لحاظ سے احکام میں اصول شرع کے تحت تغیر کیا جا سکے، اور جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی جائیں اُن کو پورا کرنے کے لیے قوانین مرتب کیے جا سکیں۔ اس معاملے میں ہر زمانے اور ہر ملک کے مجتہدین کو اپنے زمانی اور مکانی حالات کے لحاظ سے استنباطِ احکام اور تفریع مسائل کے پورے اختیارات حاصل ہیں، اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کسی خاص دور کے اہل علم کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لیے وضع قانون کا چارٹر دے کر دوسروں کے اختیارات کو سلب کر لیا گیا ہو۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ہر شخص کو اپنے منشا اور اپنی اہواء کے مطابق احکام کو بدل ڈالنے اور اصول کو توڑ مروڑ کر اُن کی الٹی سیدھی تاویلیں کرنے، اور قوانین کو شارع کے اصل مقصد سے پھیر دینے کی آزادی حاصل ہو۔ اس کے لیے بھی ایک ضابطہ ہے اور وہ چند شرائط پر مشتمل ہے۔

پہلی شرط فروعی قوانین مدون کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ

[مزا]ج شریعت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بات صرف قرآن مجید کی تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں [تد]بر کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے[۱]۔ ان دونوں چیزوں پر جس شخص کی نظر وسیع اور عمیق ہو گی وہ شریعت کا مزاج شناس [ہو] جائے گا، اور ہر موقع پر اس کی بصیرت اس کو بتا دے گی کہ مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ اس [شر]یعت کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے، اور کس طریقہ کو اختیار کرنے سے اس کے مزاج میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے گی۔ اس بصیرت کے ساتھ احکام میں جو تغیر و تبدل کیا جائے گا وہ نہ صرف [م]ناسب اور معتدل ہو گا، بلکہ اپنے محلِ خاص میں شارع کے اصل مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ اتنا [ہ]ی بجا ہو گا جتنا خود شارع کا حکم ہوتا۔ اس کی مثال میں بہت سے واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ [م]ثلاً حضرت عمر کا یہ حکم کہ دورانِ جنگ میں کسی مسلمان پر حد نہ جاری کی جائے، اور جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شرب خمر پر معاف کر دینا، اور حضرت عمر کا یہ فیصلہ کہ قحط کے زمانے میں کسی سارق کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ یہ امور اگرچہ بظاہر شارع کے صریح احکام کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، لیکن جو شخص شریعت کا مزاج داں ہے وہ جانتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں حکم عام کے امتثال کو چھوڑ دینا مقصود شارع کے عین مطابق ہے۔ اسی قبیل سے وہ واقعہ ہے جو حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کے ساتھ پیش آیا۔ قبیلہ مُزَینہ کے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ حاطب کے

---

۱ یہاں اشارۃً یہ کہہ دینا بیجا نہ ہو گا کہ اس زمانہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ہماری دینی تعلیم سے قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ خارج ہو گیا ہے اور اس کی جگہ محض فقہ کے کسی ایک سسٹم کی تعلیم نے لی ہے اور تعلیم بھی اس طرح دی جاتی ہے کہ ابتدا ہی سے خدا و رسول کے منصوص احکام اور ائمہ کے اجتہادات کے درمیان حقیقی فرق و امتیاز طالب علم کے پیش نظر نہیں رہتا۔ حالانکہ کوئی شخص جب تک حکیمانہ طریق پر قرآن میں بصیرت حاصل نہ کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا بغور مطالعہ نہ کرے، اسلام کے مزاج اور اسلامی قانون کے اصول کو نہیں سمجھ سکتا۔ اجتہاد کے لیے یہ چیز ضروری ہے اور تمام عمر فقہ کی کتابیں پڑھتے رہنے سے بھی یہ حاصل نہیں ہو سکتی۔

غلاموں نے اس کا اونٹ چرا لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پہلے تو ان کے ہاتھ کاٹے جانے کا حکم دے دیا پھر فوراً ہی آپ کو تنبہ ہوا اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان غریبوں سے کام لیا مگر ان کو بھوکا مار دیا اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز بھی کھالے تو اس کے لیے جائز ہو جائے۔ یہ کہہ کر آپ نے ان غلاموں کو معاف کر دیا اور ان کے مالک سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اسی طرح تطلیقاتِ ثلاثہ کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ نے جو حکم صادر فرمایا وہ عہد رسالت کے عملدرآمد سے مختلف تھا، مگر چونکہ احکام میں یہ تمام تغیرات شریعت کے مزاج کو سمجھ کر کیے گئے تھے اس لیے ان کو کوئی نامناسب نہیں کہہ سکتا۔ بخلاف اس کے جو تغیر اس فہم اور بصیرت کے بغیر کیا جاتا ہے وہ مزاج شرع میں بے اعتدالی پیدا کرتا ہے اور مُفضی الی الفساد ہو جاتا ہے۔

دوسری شرط | مزاج شریعت کو سمجھنے کے بعد دوسری اہم شرط یہ ہے کہ زندگی کے جس شعبہ میں قانون بنانے کی ضرورت ہو اس کے متعلق شارع کے جملہ احکام پر نظر ڈالی جائے اور ان میں غور و فکر کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ ان سے شارع کا مقصد کیا ہے، شارع کس نقشہ پر اس شعبہ کی تنظیم کرنا چاہتا ہے، اسلامی زندگی کی وسیع تر اسکیم میں اس شعبۂ خاص کا کیا مقام ہے، اور اس مقام کی مناسبت سے اس شعبہ میں شارع نے کیا پالیسی اختیار کی ہے۔ اس چیز کو سمجھے بغیر جو قانون بنایا جائے گا، یا پچھلے قانون میں جو حذف و اضافہ کیا جائے گا وہ مقصود شارع کے مطابق نہ ہوگا اور اس سے قانون کا رخ اپنے مرکز سے منحرف ہو جائے گا۔ قانون اسلامی میں ظواہر احکام کی اہمیت اتنی نہیں ہے جتنی مقاصد احکام کی ہے۔ فقیہ کا اصلی کام یہی ہے کہ وہ شارع کے مقصد اور اس کی حکمت و مصلحت پر نظر رکھے۔ بعض خاص مواقع ایسے آتے ہیں جن میں اگر ظواہر احکام پر (جو عام حالات کو مدنظر رکھ کر دیے گئے تھے) عمل کیا جائے تو اصل مقصد فوت ہو جائے۔ ایسے وقت میں ظاہر کو چھوڑ کر اس طریق پر عمل کرنا ضروری ہے جس سے شارع کا مقصد پورا ہوتا ہو۔ قرآن مجید میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جیسی کچھ تاکید کی گئی ہے، معلوم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر بہت زور دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود آ[illegible] ظالم و جابر امراء کے مقابلہ میں خروج سے منع فرمادیا کیونکہ شارع

کا اصل مقصد تو فساد کو صلاح سے بدلنا ہے۔ جب کسی فعل سے اور زیادہ فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور صلاح کی امید نہ ہو تو اس سے احتراز بہتر ہے۔ علامہ ابن تیمیہ کے حالات میں ہے کہ فتنۂ تاتار کے زمانہ میں ایک گروہ پر ان کا گذر ہوا جو شراب و کباب میں مشغول تھا۔ علامہ کے ساتھیوں نے ان لوگوں کو شراب سے منع کرنا چاہا۔ مگر علامہ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ اللہ نے شراب کو فتنہ و فساد کا دروازہ بند کرنے کے لیے حرام کیا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ شراب ان ظالموں کو ایک بڑے فتنے یعنی قتل نفوس اور نہب اموال سے روکے ہوئے ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں ان کو شراب سے روکنا مقصودِ شارع کے خلاف ہے ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ حوادث کی خصوصیات کے لحاظ سے احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے۔ مگر تغیر ایسا ہونا چاہیے جس سے شارع کا اصل مقصد پورا ہو نہ کہ الٹا فوت ہو جائے۔

اسی طرح بعض احکام ایسے ہیں جو خاص حالات کی رعایت سے خاص الفاظ میں دیے گئے تھے۔ اب فقیہ کا کام یہ نہیں ہے کہ تغیر احوال کے باوجود انہی الفاظ کی پابندی کرے۔ بلکہ اس کو ان الفاظ سے شارع کے اصل مقصد کو سمجھنا چاہیے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے حالات کے لحاظ سے مناسب احکام وضع کرنے چاہئیں۔ مثلاً حضور نے صدقۂ فطر میں ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو، یا ایک صاع کشمش دینے کا حکم فرمایا تھا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس وقت مدینہ میں جو صاع رائج تھا اور یہ اجناس جن کا حضور نے ذکر فرمایا یہی بعینہٖ منصوص ہیں۔ شارع کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ عید کے روز ہر مستطیع شخص اتنا صدقہ دے کہ اس کا ایک غیر مستطیع بھائی اس صدقہ میں اپنے بال بچوں کے ساتھ کم از کم عید کا زمانہ خوشی کے ساتھ گذار سکے۔ اس مقصد کو کسی دوسری صورت سے بھی پورا کیا جا سکتا ہے جو شارع کی تجویز کردہ صورت سے اقرب ہو۔

تیسری شرط | پھر یہ بھی ضروری ہے کہ شارع کے اصول تشریع اور طرز قانون سازی کو خوب سمجھ لیا جائے تاکہ موقع و محل کے لحاظ سے احکام وضع کرنے میں انہی اصولوں کی پیروی اور اسی طرز کی تقلید کی

جاسکے۔ یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ انسان مجموعی طور پر شریعت کی ساخت اور پھر فرداً فرداً اس کے احکام کی خصوصیات پر غور نہ کرلے۔ شارع نے کس طرح احکام میں عدل اور توازن قائم کیا ہے۔ کس کس طرح اس نے انسانی فطرت کی رعایت کی ہے۔ دفع مفاسد اور جلب مصالح کے لیے اس نے کیا طریقے اختیار کیے ہیں۔ کس ڈھنگ پر وہ انسانی معاملات کی تنظیم اور اُن میں انضباط پیدا کرتا ہے۔ کس طریقہ سے وہ انسان کو اپنے بلند مقاصد کی طرف لے جاتا ہے اور پھر ساتھ ساتھ اس کی فطری کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اس کے راستہ میں مناسب سہولتیں بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ سب امور تفکر و تدبّر کے محتاج ہیں اور ان کے لیے نصوص قرآنی کی لفظی و معنوی دلالتوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کی حکمتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ جو شخص اس علم اور تفقُّہ سے بہرہ ور ہو وہ موقع و محل کے لحاظ سے احکام میں جزوی تغیر و تبدل بھی کرسکتا ہے اور جن معاملات کے حق میں نصوص موجود نہیں ان کے لیے نئے قوانین بھی وضع کرسکتا ہے۔ کیونکہ ایسا شخص قانون سازی میں جو طریقہ اختیار کرے گا وہ اسلام کے اصول تشریع سے منحرف نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں صرف اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم ہے مگر اجتہاد سے کام لے کر صحابہ نے اس حکم کو عجم کے مجوسیوں، ہندوستان کے بت پرستوں اور افریقہ کے بربری باشندوں پر بھی وسیع کردیا۔ اسی طرح خلفاء راشدین کے عہد میں جب ممالک فتح ہوئے تو غیر قوموں کے ساتھ بکثرت ایسے معاملات پیش آئے جن کے متعلق کتاب و سنت میں صریح احکام موجود نہ تھے ـــــ صحابۂ کرام نے ان کے لیے خود ہی قوانین مدون کیے اور وہ اسلامی شریعت کی اسپرٹ اور اس کے اصول سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔

چوتھی شرط احوال اور حوادث کے جو تغیرات، احکام میں تغیر، یا جدید قانون سازی کے مقتضی ہوں ان کو دو حیثیتوں سے جانچنا ضروری ہے۔ ایک یہ حیثیت کہ وہ حالات بجائے خود کس قسم کے ہیں ان کی خصوصیات کیا ہیں اور ان کے اندر کونسی قوتیں کام کررہی ہیں۔ دوسری یہ حیثیت کہ اسلامی قانون کے

نقطۂ نظر سے ان میں کس کس نوع کے تغیرات ہوئے ہیں اور ہر نوع کا تغیر احکام میں کس طرح کا تغیر چاہتا ہے۔

مثال کے طور پر اسی سود کے مسئلہ کو لیجیے جو اس وقت زیرِ بحث ہے معاشی قوانین کی تدوین جدید کے لیے سب سے پہلے زمانۂ حال کی معاشی دنیا کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم گہری نظر سے معاشیات، مالیات اور لین دین کے جدید طریقوں کا مطالعہ کریں گے۔ معاشی زندگی کے باطن میں جو قوتیں کام کر رہی ہیں ان کو سمجھیں گے۔ ان کے نظریات اور اصول سے واقفیت حاصل کریں گے، اور ان اصول و نظریات کا ظہور جن عملی صورتوں میں ہو رہا ہے ان پر اطلاع حاصل کریں گے۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ زمانۂ سابق کی بہ نسبت ان معاملات میں جو تغیر ہوئے ہیں ان کو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے کن اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے، اور ہر قسم پر شریعت کے مزاج اور اس کے مقاصد اور اصول تشریع کی مناسبت سے کس طرح کے احکام جاری ہونے چاہئیں۔

جزئیات سے قطع نظر کرکے، اصولاً ان تغیرات کو ہم دو قسموں پر منقسم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ تغیرات جو درحقیقت تمدنی احوال کے بدل جانے سے رونما ہوئے ہیں اور جو دراصل انسان کے علمی و عقلی نشو و ارتقا، اور خزائنِ الٰہی کے مزید اکتشافات، اور مادی اسباب و وسائل کی ترقی، اور حمل و نقل اور مخابرات (CAMMUNICATIONS) کی سہولتوں، اور بین الاقوامی تعلقات کی وسعتوں کے طبعی نتائج ہیں۔ ایسے تغیرات اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طبعی اور حقیقی تغیرات ہیں ان کو نہ تو مٹایا جا سکتا ہے اور نہ مٹانا مطلوب ہے، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے اثر سے معاشی احوال اور مالی معاملات اور تجارتی لین دین کی جو نئی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں، ان کے لیے اصولِ شریعت کے تحت نئے احکام وضع کیے جائیں تاکہ ان لائے ہوئے حالات میں مسلمان اپنے عمل کو ٹھیک ٹھیک اسلامی طرز پر ڈھال سکیں۔

(۲) وہ تغیرات جو دراصل تمدنی ترقی کے نتائج نہیں ہیں، بلکہ دنیا کے معاشی نظام اور مالی معاملات پر ظالم سرمایہ داروں کے حاوی ہو جانے کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں۔ وہی ظالمانہ سرمایہ داری جو عہدِ جاہلیت میں پائی جاتی تھی، اور جس کو اسلام نے صدیوں تک مغلوب کیے رکھا تھا، اب دوبارہ معاشی دنیا پر غالب آگئی ہے، اور تمدن کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے کام لے کر اُس نے اپنے اُنہی پرانے نظریات کو نت نئی صورتوں سے معاشی زندگی کے مختلف معاملات میں پھیلا دیا ہے۔ سرمایہ داری کے اس غلبہ سے جو تغیرات واقع ہوئے ہیں وہ اسلامی قانون کی نگاہ میں حقیقی اور طبیعی تغیرات نہیں ہیں، بلکہ جعلی تغیرات ہیں جنھیں قوت سے مٹایا جا سکتا ہے، اور جن کا مٹا دیا جانا نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ مسلمان کا اصلی فرض یہ ہے کہ اپنی پوری قوت ان کے مٹانے میں صرف کر دے اور معاشی نظام کو اسلامی اصول پر ڈھالنے کی کوشش کرے۔ سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرنے کا فرض کمیونسٹ سے بڑھ کر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔ کمیونسٹ کے سامنے محض روٹی کا سوال ہے، اور مسلمان کے سامنے دین و اخلاق کا سوال۔ کمیونسٹ محض صعالیک (PROLETARIATES) کی خاطر جنگ کرنا چاہتا ہے، اور مسلمان تمام نوع بشری کے حقیقی فائدے کے لیے جنگ کرتا ہے جس میں خود سرمایہ دار بھی شامل ہیں۔ کمیونسٹ کی جنگ خود غرضی پر مبنی ہے اور مسلمان کی جنگ للّٰہیت پر۔ لہٰذا مسلمان تو موجودہ ظالمانہ سرمایہ داری نظام سے کبھی مصالحت کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ مسلم ہے اور اسلام کا پابند ہے تو اس کے خدا کی طرف سے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس ظالمانہ نظام کو مٹانے کی کوشش کرے، اور اس جنگ میں جو ممکن نقصان اس کو پہنچ سکتا ہو اسے مردانہ وار برداشت کرے۔ معاشی زندگی کے اس شعبہ میں اسلام جو قانون بھی بنائے گا اس کی غرض یہ ہرگز نہ ہوگی کہ مسلمانوں کے لیے سرمایہ داری نظام میں جذب ہونے اور اس کے ادارات میں حصہ لینے اور اس کی کامیابی کے اسباب فراہم کرنے میں سہولتیں پیدا کی جائیں، بلکہ اس کی واحد غرض یہ ہوگی کہ مسلمانوں کو اس

گندگی سے محفوظ رکھا جائے، اور تمام اُن دروازوں کو بند کیا جائے جو مسلمان کو ناجائز سرمایہ داری کی طرف لے جاتے ہیں۔

تخفیفات کے عام اصول | اسلامی قانون میں حالات اور ضروریات کے لحاظ سے احکام کی سختی کو نرم کرنے کی بھی کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔ چنانچہ فقہ کے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات اور المشقۃ تجلب التیسیر[۱] قرآن مجید اور احادیث نبوی میں بھی متعدد مواقع پر شریعت کے اس قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ۔۴۰) اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں ڈالتا۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲۳) اللہ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی نہیں کرنا چاہتا۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج۔۱۰) اس نے تم پر دین میں سختی نہیں کی ہے۔

وفی الحدیث: احب الدین الی اللہ تعالیٰ الحنفیۃ السمحۃ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین وہ ہے جو سیدھا سادھا اور نرم ہو۔

ولا ضرر ولا ضرار فی الاسلام۔ اسلام میں ضرر اور ضرار نہیں ہے۔

پس یہ قاعدہ اسلام میں مسلم ہے کہ جہاں مشقت اور ضرر ہو وہاں احکام میں نرمی کر دی جائے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر خیالی اور وہمی ضرورت پر شریعت کے احکام اور خدا کی مقرر کردہ حدود کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ اس کے لیے بھی چند اصول اور ضوابط ہیں جو شریعت کی تخفیفات

---

[۱] ضرورتوں کی بنا پر بعض ناجائز چیزیں جائز ہو جاتی ہیں، اور جہاں شریعت کے کسی حکم پر عمل کرنے میں مشقت ہو وہاں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔

پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اوّلاً یہ دیکھنا چاہیے کہ مشقت کس درجہ کی ہے۔ مطلقاً ہر مشقت پر تو تکلیف شرعی رفع نہیں کی جاسکتی، ورنہ سرے سے کوئی قانون ہی باقی نہ رہے گا۔ جاڑے میں وضو کی تکلیف، گرمی میں روزے کی تکلیف، سفر حج اور جہاد کی تکالیف، یقیناً یہ سب مشقت کی تعریف میں آتی ہیں۔ مگر یہ ایسی مشقتیں نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے تکلیفات ہی کو سرے سے ساقط کر دیا جائے۔ تخفیف یا اسقاط کے لیے مشقت ایسی ہونی چاہیے جو موجب ضرر ہو، مثلاً سفر کی مشکلات، مرض کی حالت، کسی ظالم کا جبر و اکراہ، تنگ دستی، کوئی غیر معمولی مصیبت، فتنۂ عام، یا کوئی جسمانی نقص۔ ایسے مخصوص حالات میں شریعت نے بہت سے احکام میں تخفیفات کی ہیں اور ان پر دوسری تخفیفات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ثانیاً تخفیف اسی درجہ کی ہونی چاہیے جس درجہ کی مشقت اور مجبوری ہے۔ مثلاً جو شخص بیماری میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے اس کے لیے لیٹ کر پڑھنا جائز نہیں۔ جس بیماری کے لیے رمضان میں دس روزوں کا قضا کرنا کافی ہے اس کے لیے گیارہواں روزہ قضا کرنا درست نہیں۔ جس شخص کی جان شراب کا ایک چلّو پی کر یا حرام چیز کے ایک دو لقمے کھا کر بچ سکتی ہے، وہ اس حقیقی ضرورت سے بڑھ کر کچھ پینے یا کھانے کا مجاز نہیں۔ اسی طرح طبیب کے لیے جسم کے پوشیدہ حصوں میں سے جتنا دیکھنا واقعی ضروری ہے اس سے زیادہ دیکھنا جائز نہیں۔ یہی قاعدہ تمام ان صورتوں میں جاری ہوگا جن میں مشقت اور ضرورت کی بنا پر احکام میں تخفیف کرنی مطلوب ہو۔

ثالثاً کسی ضرر کو دفع کرنے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار نہیں کی جاسکتی جس میں اُتنا ہی یا اس سے زیادہ ضرر ہو۔ بلکہ صرف ایسی تدبیر کی ضرورت ہے جس کا ضرر نسبتہً کم ہو۔ اسی کے قریب قریب یہ قاعدہ بھی ہے کہ کسی مفسدہ سے بچنے کے لیے اُس سے بڑے یا اُس کے برابر کے مفسدہ میں مبتلا ہونا جائز نہیں۔ البتہ یہ جائز ہے کہ جب انسان دو مفسدوں میں گھر جائے تو بڑے مفسدہ کو دفع کرنے کے لیے چھوٹے مفسدہ کو اختیار کرلے۔

رابعاً جلب مصالح پر دفع مفاسد ہر حال میں مقدم رکھا جائے گا۔ شریعت کی نگاہ میں بھلائیوں کے حصول کی بہ نسبت برائیوں کو دور کرنا، اور ماموارت و واجبات کو ادا کرنے کی بہ نسبت حرام سے بچنا اور فسا کو دفع کرنا زیادہ اہم ہے۔ اسی لیے وہ مشقت کے موقع پر ماموارت کی تخفیف میں جتنی فیاضی دکھاتی ہے، اتنی فیاضی ممنوعات اور منہیات کی اجازت دینے میں نہیں دکھاتی۔ مثلاً سفر اور مرض کی حالت میں نماز روزے اور دوسرے واجبات کے معاملہ میں جتنی تخفیف کی گئی ہے اتنی تخفیف نجس اور حرام چیزوں کے استعمال میں نہیں کی گئی۔

خامساً مشقت اور ضرر کے زائل ہوتے ہی تخفیف بھی ساقط ہو جاتی ہے، مثلاً بیماری رفع ہو جانے کے بعد تیمم کی اجازت باقی نہیں رہتی۔

یہ چند اہم اصول ہیں جن کو اجتہاد اور تفریع احکام میں ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۵۵ھ۔ اپریل ۱۹۳۶ء)

شرح جاوید نامۂ اقبال

مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری عمر آباد (دکن)

علامہ اقبال مرحوم کی تمام کتابوں میں سے جاوید نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے آن کا مطالعہ قرآن زیادہ نمایاں ہے اس شاہکار میں "جدید جاہلیت" کی تمام علمی وعملی گمراہیوں پر ناقدانہ روشنی ڈالتے ہوئے ایک بہترین تبصرہ کیا گیا ہے، دورِ حاضر کی تمام غلط کاریوں، غلط نگاریوں، اور گوناگون خام خیالیوں کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے اور باطل کے اُن تمام پردوں کو چاک کر ڈالا ہے جو غیر اسلامی ذہنیت لے دماغوں پر ڈال رکھے تھے، اس تخریب کے بعد تعمیر کا سامان بھی فراہم کیا ہے اور اسلامیات کی سچی تفسیر کرتے ہوئے اُن معنوی تحریفات کے خلاف زبردست احتجاجی آواز بلند کی ہے جو ضعیف الاعتقاد لوگوں کی طرف سے مغرب زدگی کی بنا پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں یا ان علمائے سُو کی جانب سے نمودار ہوتی ہیں جو اسلامی عقاید، اسلامی افکار اور اسلامی حقائق کی بلندی کو اپنی کوتاہ علمی کے باعث حاصل کرنے سے قاصر ہیں اور اپنی خیرہ نگاہوں کے باعث اس کی سچی روشنی سے فیض یاب نہیں ہوسکتے درحقیقت "جاوید نامہ" دہریت، مادہ پرستی یا جدید اعتزال کے زہر قاتل کا ایک بے مثل تریاق ہے اقبال نے اس کے ذریعہ اسلامی زندگی کی جدید تشکیل کا سامان فراہم کرکے ہماری نئی نسل کو غیر اسلامی اندازِ فکر و نظر اور غیر اسلامی کردار و عمل دونوں سے بچانے کی زبردست کوشش کی ہے ہم مسلمان نوجوانوں سے خاص طور پر درخواست کرتے ہیں کہ وہ ضرور اقبالیات کا مطالعہ کریں خصوصیت سے "جاوید نامہ" ضرور پڑھیں۔

جاوید نامہ کی ابتدا ایک عجیب مناجات سے ہوتی ہے جس میں "صاحب شکوہ" نے اپنی شکوہ سنجی کی پوری شان باقی رکھی ہے۔

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست؟   این سپہر نیلگوں حیران کیست؟

اس شعر میں آیۂ تسخیر سے مراد قرآن عزیز کا وہ حصّہ ہے جس میں انسان کے لئے قوئی عالم کی تسخیر کا ذکر کیا گیا ہے چنانچہ اس کو قرآن نے بہت سے مقامات پر بیان فرمایا ہے۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	اللہ نے مسخر کر دیا جو کچھ آسمان و زمین میں ہے تمہارے فائدے کے لئے غور و فکر کرنے والے لوگوں کے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:-

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ	اور اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور بادلوں سے مینہ برسایا اور اُس سے تمہارے کھانے کو میوے پیدا کئے۔ اور جہاز تمہارے تابع کر دیئے ہیں تاکہ وہ سمندروں میں اس کے حکم سے چلتے رہیں اور اسی خدا نے تمہارے لئے دریاؤں کو مسخر کر دیا ہے اور سورج اور چاند بھی مسخر کر دیئے ہیں (کہ ایک خاص نظام کے تحت گردش کرتے ہیں) اور رات دن کا الٹ پھیر بھی تمہارے فائدہ کے لئے ہے اور تمہیں اس خدا نے وہ سب چیزیں عطا کر دی ہیں جو تم نے اُس سے مانگیں اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو ہرگز گن نہ سکو گے

ان دو آیتوں کے علاوہ بے شمار آیتیں اس مضمون کی مل سکتی ہیں جن سے تسخیر کی حقیقت معلوم ہوگی مگر مزید تفصیل کے لئے اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تسخیر کا لفظ ایک جامع مفہوم ادا کر رہا ہے جس کے تحت ہر چیز

کا طوعاً کرھاً ہر طرح سے تابع و مسخر ہونا ضروری ہے انسان کی کائنات دما فیہا کے ساتھ جو خاص نسبت ہے اس کو واضح کرنے کے لئے اس سے اعلیٰ تعبیر ممکن ہی نہیں قرآن مجید کی ان صراحتوں سے پیشتر انسانی عظمت کا تصور اس سے کہیں کم تر تھا اور تمام مذاہب و اقوام کا تصورِ انسان کے متعلق نہایت ناقص تھا لیکن قرآن مجید نے انسان کے لئے "تسخیر کائنات" کا اعلان کر کے نہ صرف اس کی عظمت کا اعلان فرمادیا بلکہ انسانی عقل کے لئے ایک بلند ترین نصب العین بھی متعین کر دیا اسی میں تمام کائنات کی قوتوں اور ان پر تصرف کا مفہوم مضمر ہے آگ، بجلی، پانی وغیرہ پر جو انسان کی حکمرانی ہے وہ اسی تسخیر کا توضیحِ عام ہے اور ابھی معلوم نہیں کہ کائنات کے کون کون سے رازہائے سربستہ کھلنے والے ہیں۔

سَتُبْدِیْ لَکَ الْاَیَّامُ مَا کُنْتَ جَاهِلاً   وَیَأْتِیْكَ بِالْاَخْبَارِ مَا لَمْ تُزَوِّدِ

آگے چل کر اقبال اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ مغربی قوموں کے اکتشافات پر جو لوگ سر دھن رہے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہئیے کہ "حکمتِ اشیا" فرنگی زاد نہیں ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت "لذت ایجاد" ہے جو خدا نے انسان میں ودلیعت کر دی ہے۔

رازدانِ عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ کہ بود؟   مستِ آن ساقی و آں صہبا کہ بود؟
برگزیدی از ہمہ عالم کرا؟   کردی از رازِ درون محرم کرا؟
اے ترا تیرے کہ مارا سینہ سفت   حرف "ادعونی" کہ گفت وبا کہ گفت؟

ان اشعار میں اُن قرآنی آیتوں کی طرف اشارات کئے گئے ہیں جن میں خلافت آدم کا تذکرہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو منصبِ خلافت الٰہیہ سے نوازنا چاہا تو فرشتوں سے برسبیل تذکرہ فرمادیا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں فرشتوں نے نیاز مندانہ طور پر عرض کیا کہ سابقہ خدمتیں برابر انجام دی جا رہی ہیں، تسبیح و تقدیس و تحمید وغیرہ میں ہم برابر مصروف ہیں یہ نئی خدمت بھی ہمارے سپرد کر دی جائے ہم ہر طرح حاضر ہیں اس پر ارشاد باری ہوا کہ تکوینی اسرار کا علم تم کو نہیں اور وہ مصالح جو آدم کی تخلیق اور اس کی

خلافت ارضی سے متعلق ہیں تمہارے بس کی بات نہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر آدم کی برتری و خصوصیت جتلائی۔ و تعلیم اسما یعنی "حقائق اشیا" کی تعلیم فطری دے کر فرشتوں سے دریافت کیا کہ بتلاؤ "اسما مسمیات" کیا ہیں ؛ فرشتوں نے صاف عرض کردیا کہ ہمیں تو اسی قدر علم ہے جس قدر تو نے عطا فرمایا ہے اور وہ ہماری فطری استعداد کے مطابق ہے پھر آدم نے حکم الٰہی سے ان کو سب کچھ بتلا دیا، جب فرشتوں کا اور آدم کا تکوینی فرق واضح ہوگیا تو ارشاد ہوا "سجدہ کرو" سب نے سر نیاز جھکا دیا مگر ابلیس نے سرکشی کی اور سجدہ سے انکار کر دیا اُسے درگاہ الٰہی سے نکال دیا گیا بہرحال مذکورہ اشعار میں "تعلیم اسما" کی طرف اشارہ ہے جس سے مراد کائنات مادی کے وہ تمام حقائق ہیں جن کو دریافت کرنے کی صلاحیت و استعداد اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کردی تھی ادراک عقل، احساسات، دنیا کی مفید و مضر چیزوں کی خاصیتیں انسانی زندگی کے وہ تمام لوازم جو انسان اپنی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ فراہم کرتا جائے گا سب اس میں داخل ہیں دوسرے شعر میں ان آیات کریمہ کے مضمون کے طرف راہنمائی کی گئی ہے جن میں انسانی شرافت و فضیلت کا بیان ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات اور کائنات کی ساری چیزوں پر انسان ہی کو خلیفۃ اللہ بنا کر فضیلت دی گئی ہے، تیسرے شعر میں ایک خاص انداز کے ساتھ دریافت کیا جاتا ہے کہ حرف "ادعونی" کس سے کہا گیا ہے، اور ان آیات کریمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

فَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ	پس اے پیغمبر اسلام! جب تم سے میرے متعلق میرے بندے دریافت کریں
قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا	تو کہدو کہ بے شک میں قریب ہوں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں پس
دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ	انہیں میری باتیں مان لینی چاہئیں اور مجھ پر ایمان لانا چاہیئے تاکہ وہ لوگ
لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (سورہ بقر)	رشد و ہدایت پائیں،

اس کے بعد پوری حقیقت چند لفظوں میں بے نقاب کر ڈالی کہ تیرا ہی روئے زیبا میرا ایمان اور میرا قرآن ہے لیکن میری جان نازک تو نے اپنے جلوہ سے محروم رکھا ہے!

روئے تو ایمان من قرآن من　　جلوہ داری دریغ از جان من

لیکن اس کے باوجود اقبالؒ نے انسانی بے لسبی کو بھی اس طرح ظاہر کیا ہے کہ آج زیر گردون "خلیفۃ اللہ" ہونے کے باوجود اپنے وجود کو غربت میں محسوس کر رہا ہوں پس تو پھر "اِنِّیْ قَرِیْب" کہکر میری مہجوری و دوری کو ختم فرمادے اور مجھے اپنی بے پایاں رحمت سے قریب کرے۔

زیر گردوں خویش را یابم غریب　　زاں سوئے گردون بہ گو "اِنِّیْ قَرِیْب"

مناجات کے بعد تمہید آسمانی شروع ہو جاتی ہے جس میں "حقائق عزیزیہ" بتلانے کے بعد کہا جاتا ہے

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را　　اوست سید جملہ موجودات را

یعنی جو جمال ذاتِ الٰہی کے عشق و محبت کا متوالا ہو جاتا ہے وہ تمام موجودات کا سردار کہلاتا ہے یعنی ساری کائنات اس کے آگے سربسجود رہتی ہے اور وہ ان سے خدمت لینے لگتا ہے، مقصود یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جانا چاہئے چونکہ غیر اللہ کی تمام قوتیں اس کی خادم ہیں ان میں سے کسی کے آگے اس کو اپنا سر نیاز جھکا کر خود کو ذلیل کرنا نہیں چاہئے یہی حقیقت ہے جس کو قرآن نے پیش کیا ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ　　تمام جنوں اور انسانوں کو میں نے اپنی "عبادت" ہی کے لئے
اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔　　پیدا کیا ہے۔

پھر تمہید آسمانی کی ابتدا شروع ہو جاتی ہے جس میں عارف رومی کی روح آشکارا ہو کر "اسرار معراج" کی دل پذیر شرح کرتی ہے اور "زندہ رود" ساز رومی سے مست ہو کر بے اختیار ایک غزل گانے لگتا ہے پھر وہی رومی اور "زندہ رود کی" گفتگو شروع ہو جاتی ہے جس میں موجود و ناموجود اور شواہد ثلثہ" اور مقام تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کے حقائق واضح کئے جاتے ہیں اور بتایا جاتا کہ جب سلطان (چارٹر) تمہارے قبضہ میں آ جائے گا تو زمین کیا چیز ہے آسمان کو بھی توڑ سکتے ہو پھر ایک عجیب غریب ل فرزند جاں نواز نکتہ بتایا جاتا ہے

نکتۂ الّا بسلطان یاد گیر ورنہ چوں مور و ملخ در گل بمیر

یعنی قرآن کی تعلیم

یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اے جن وانس کے گروہ! اگر تم آسمان وزمین کے کناروں

اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے نکل بھاگنے کی قدرت رکھتے ہو تو بھاگ جاؤ مگر سلطان

فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ۔ (خدائی چارٹر) کے بغیر بھاگ ہی نہ سکوگے۔

کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ کے ملک اور اس کی وسیع سلطنت کی حدود سے کہیں نہیں بھاگ سکتا جب یہ حقیقت آشکارا ہو گئی تو انسان کو اپنے خالق حاکم، اور مالک حقیقی سے پورا وابستہ ہو جانا چاہیئے اور اگر ایسا نہ ہوا تو مور و ملخ کی طرح دنیاوی زندگی ختم کر کے مرجانا پڑے گا اور مجازات کے روحانی عالم میں "یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا" کہہ کر حسرت وندامت سے مادی زندگی کے برباد ہونے پر اور روحانی زندگی کی محرومی اور ناکامی پر کف افسوس ملنا پڑے گا۔

ان حقائق کے بعد عارف رومی کی روح نے زندگی کی تفسیر کی ہے اور عقل و عشق کا موازنہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ آدمی وہی ہے جس میں "دید دوست" کی تمنائے بے پایاں ہو جو اس کو سرا نظر بنا دے اور زمان ومکان کو اپنے احوال جان کر سمجھنے لگے پھر جسم وجان کی حقیقت آشکارا کی گئی ہے زمان و مکان کی روح زرواں، مسافر کو عالم علوی کی سیاحت پر لے جاتی ہے اور انجم کی زمزمہ سنجیاں شروع ہو جاتی ہیں اور زمزمۂ انجم کی تان اس پر ٹوٹ جاتی ہے۔

ضرب قلندری بیار سد سکندری شکن رسم کلیم تازہ کن رونق ساحری شکن

فلک قمر میں پہنچ کر بہت سے عجیب و غریب غار نظر آتے ہیں ایک غار میں وہ عارف ہندی خلوت گرفتہ ہے جس کو ہندوستان والے "جہاں دوست" کہتے ہیں "جہاں دوست" رومی سے دریافت کرتے ہیں تمہارے ساتھ کون شخص ہے رومی اپنے ساتھی کا تعارف ایک انوکھے انداز میں کراتے ہیں پھر جہاں دوست

اور رومی میں مکالمہ شروع ہو جاتا ہے عارف ہندی اپنی نو باتیں پیش کرتے ہیں اور جلوہ سروش" کی جلوہ فرمائی کے بعد" نوائے سروش" کی نغمہ سنجیاں شروع ہو جاتی ہیں" نوائے سروش" میں اقبال نے قرآن کے فہم و تدبر کا وہ بے مثل نمونہ پیش کر دیا ہے جس کو خود انہوں نے آزمالیا ہے جن لوگوں کو قرآن کے علوم و حقائق کا صحیح ذوق ہے وہ ضرور اس سے لطف اندوز ہوں گے مگر جو شخص حجابوں کی دنیا میں زندہ ہا وہ اسی طرح حجابوں کے آغوش میں مرکر فنا ہو جائے گا۔ دنیا کی مادی زندگی اور عقبیٰ کی روحانی زندگی دونوں تیرے لئے حجابات بن گئے ہیں حالانکہ چاہئے تھا کہ اپنی دنیاوی زندگی میں تو حجاباتِ نظر کو اُٹھا دیتا اور آخرت میں خود بخود تیری مادی نظر کے حجابات اُٹھ جاتے اور تیری نگاہیں روحانی مناظر کے لطف سے محظوظ ہوتیں، اس کے بعد اقبال نے اپنے فہم قرآن کا حال بتایا ہے کہ،

چوں سر رازی را ز دیدہ فرو شستم تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر

یعنی جب میں نے پیچ و تاب رازی سے نجات پائی، متکلمانہ قیل و قال اور لفاظیوں کے جنگ و جدال سے نکل کر قرآن عزیز اور اس کے فطری اسلوب استدلال کو سمجھنا شروع کیا تو مجھ پر یہ رازِ حقیقت آشکارا ہو گیا کہ قرآن میں تقدیر امم پوشیدہ ہے اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہت سی قوموں کو رفعت و سربلندی عطا فرماتا ہے اور اسی کی وجہ سے سینکڑوں امتیں حضیض ذلت میں جا گرتی ہیں یعنی جن قوموں نے اپنے خود ساختہ طریق فکر و عمل کو چھوڑ کر اللہ کی کتاب کو اپنی اجتماعی زندگی کا پروگرام بنالیا وہ کامیاب و کامران ہوئیں اور جنہوں نے فطرت کے اصول حقہ سے انحراف کیا وہ خائب و خاسر ہوئیں،

اس دور میں اور ہر دور میں قرآن کی پیش کی ہوئی حقیقتوں سے دور رہنے کا سبب جس نے قرآن کے عملی پہلو سے لوگوں کو دور رکھا ہے یہ ہے کہ عام طور پر عہد نبوت، عہد صحابہ، اور عہد تابعین کے بعد لوگوں نے قرآن کے فہم کے لئے ایک پست معیار قائم کر لیا اور یہ چیز قرآن کے محاورات، اس کی ترکیبوں اور معانی و مطالب کے فہم تک میں قائم ہو گئی، اور عہد سلف کے بعد سے جتنے "مفسرین قرآن" پیدا ہوئے ان کا فکری معیار ایک

روبہ تنزل طریق کے طرف جاتا رہا نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ جب براہ راست قرآن کا فہم و تدبر متروک ہوگیا اور" خام فلسفیت" یا اعتزال کی وجہ سے مسلمان معقولین پر اس دور کے" عقلی علوم" کا تسلط ہوگیا تو انہوں نے قرآن کی سیدھی سادھی بے میل فطری تعلیمات کو بھی معقولیانہ انداز سے دیکھنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کو انسانی علوم پر ڈھالا جانے لگا جب" ارباب اعتزال" نے یہ ہنگامہ آرائیاں برپا کیں تو ان کے مقابلہ میں پہلے دو جماعتیں پیدا ہوئیں پہلے گروہ نے سلفیت کا دامن مضبوطی سے تھام لیا، اور دوسرے گروہ نے مدافعت اسلامی کے نام پر ارباب اعتزال سے ردوکد اور بحث مناظرہ کرنا شروع کر دیا اور انہیں کے طرز استدلال کو قبول کر کے اعتزال سے پیدا ہونے والے شبہات کا جواب دینا شروع کیا اور اپنے عقاید تو سلفیانہ رکھے مگر اس کے لئے طرز تعبیر میں ان فلسفیانہ موشگافیوں کو استعمال کیا جن کے باعث" جدلیات" کا ایک وافر حصہ اسلامی لٹریچر میں پیدا ہوگیا یہ گروہ جب اپنے ذاتی عقائد کا اظہار کرتا تو اپنا مسلک سلفی بتلاتا اور جب سلفی عقاید پر اعتراضات ہوتے تو معترضین کا جواب دینے کے لئے غیر شعوری طور پر ان اصول استدلال کو تسلیم کر لیتا جو روح قرآن سے کلی طور پر اپنے مزاج طبعی کے لحاظ سے الگ تھلگ تھے ، اس لئے اس طبقہ نے جس قدر غیروں کے شکوک و شبہات کو فنی و علمی شکل دے دی ہے اس قدر جوابات کی" دنیائے نو" کی تعبیر نہیں کی اور بسا اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ جس قدر سلجھانے کی کوشش کی گئی الجھاؤ بڑھتا ہی گیا اور اس چیز کا پورا استیصال ان سے نہ ہو سکا جس کے لئے انہوں نے کمر ہمت باندھی تھی اسی طبقہ کو متکلمین کا گروہ کہتے ہیں اور ان کے سب سے بڑے نمائندے علامہ فخر الدین رازی ہیں ان دو طبقوں کے بعد عالم اسلامی میں ایک تیسرا ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے متکلمین کے اصول ان کے مسلمہ کلیات اور تمام عقلی ضوابط پر ایک زبردست تنقیدی نظر ڈالی اور ان کو کانٹ چھانٹ کر از سر نو ایک" جدید فلسفہ" کی بنیاد رکھی پھر ان تمام شکوک و شبہات کو جو متکلمین کے یہاں زبردست سمجھے جاتے تھے حل کر کے رکھ دیا اور یونانی عقلی علوم کی ذہنی مرعوبیت کا طلسم ٹوٹ گیا اس طبقہ میں" منصب تجدید" امام ابن تیمیہ کو حاصل ہے یہ چند سطریں ناگزیر تھیں تاکہ

"چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر"

کو سمجھ لیا جائے اب شعر کا مطلب سمجھئے، علامہ اقبال اپنے تکلم سے "سلفیت" اور عرفان حقیقت کی طرف سفر کا نتیجہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب متکلمین کے وضعی طریقوں کو چھوڑ کر قرآن کے فطری طرز استدلال پر تدبر کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس میں "تقدیر امم" پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد وادی "یرغمید" کی طرف حرکت ہوتی ہے جس کو فرشتے "وادی طواسین" کے نام سے یاد کرتے ہیں یہاں عارف رومی شعر کی حقیقت پر کلام فرماتے ہیں کہ اس کی کونسی قسم مفید ہے اور کونسی غیر مفید و مضر ہے۔

شعر را مقصود اگر آدم گری است شاعرے ہم وارث پیغمبری است

اس کے بعد اقبال عارف رومی سے "پیغمبری" کی حقیقت دریافت کرتا ہے اور وہ اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں

گفتم از پیغمبری ہم باز گوے سرّ او با مرد محرم باز گوے
گفت اقوام و ملل آیات اوست عصر ہائے ما ز مخلوقات اوست
از دم او ناطق اندر سنگ و خشت ما ہمہ مانند حاصل او چو کشت
پاک سازد استخواں و ریشہ را بال جبریلے دہد اندیشہ را
ہائے و ہوئے اندرون کائنات از لب او نور و نجم و نازعات
آفتابش را زوالے نیست نیست منکر او را کمالے نیست نیست
رحمت حق صحبت احرار او قہر یزداں ضربت کرار او
گرچہ باشی عقل کل از وے حرم زانکہ او بیند تن و جاں را بہم

عارف رومی سے اقبال نے پیغمبری کی حقیقت دریافت کی عارف رومی نے کہا کہ قومیں اور ملتیں پیغمبری کی نشانیاں ہیں ہمارے تمام زمانے پیغمبری ہی سے بنے ہوئے ہیں، پیغمبری وہ چیز ہے کہ سنگ و خشت بھی اس کے دم سے ناطق بن جاتے ہیں، پیغمبری لہلہاتی ہوئی کھیتی ہے اور انسانیت اس کا حاصل، پیغمبری

استخواں و ریشہ کو پاک کر دیتی ہے اور فکر و اندیشہ کو "بال جبریل" عطا کرتی ہے کائنات میں یہ سب کچھ ہاؤ ہو پیغمبری ہی کے طفیل سے ہے نجم، نور، اور نازعات کی تعلیمات بھی پیغمبری ہی سے ملتی ہیں اس شعر میں بتایا گیا ہے کہ قرآنی تعلیمات رسول ہی کی زبانی انسانوں تک پہنچتی ہیں جس سے کائنات کے اندر ہنگامہ آرائیاں نظر آتی ہیں مثلاً سورہ نجم اگرچہ ایک مختصر سی مکی سورت ہے مگر اس میں نبوت اور نبوت محمدی کی حقیقت کو ایک دل نشیں طریقہ پہ سمجھایا گیا ہے اور اسی طرح سورۂ نور میں بتایا گیا ہے کہ قرآن عزیز کی فطری تعلیم سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے انسان کو رذائل سے مجتنب ہو کر فضائل سے آراستہ ہو جانا چاہئے تاکہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی بارگاہ قدس تک پہنچنا آسان ہو اور "نازعات" میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی محض مادی زندگی ہی نہیں بلکہ یہ مادی زندگی ایک روحانی زندگی کا پیش خیمہ ہے یہاں اعمال انسانی میں جو کچھ بھی خیر و شر ہوگا آخرت کی روحانی زندگی میں اس کی جزا ملے گی اور مجازات اعمال کو ثابت کرنے کے لئے قوموں کے عروج و زوال سے استشہاد کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس فطری تعلیم کے انکار کے باعث فرعون اور فرعونیوں کو ہلاکت سے دوچار ہونا پڑا۔

پیغمبری کا آفتاب جہاں تاب کبھی زوال پذیر نہیں ہوتا پیغمبری کا منکر درجۂ کمال پر نہیں پہنچ سکتا صاحب رسالت کے فیضان محبت سے مستفید ہونے والوں کی محبت رحمت حق ہے اور پیغمبر کی ضرب اللہ کا قہر و غضب ہے اگر انسان عقل کل بھی بن جائے پھر بھی نبوت کی راہ نمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ تن و جان کو بہم دیکھنا اور روحانیت و مادیت میں ایک مناسب امتزاج پیدا کرنا جس سے انسان کی خودی ترقی یافتہ ہو جائے انہیں کا کام ہے اس کے بعد "طواسین رسل" کے نام سے مہاتما گوتم بدھ، زردشت، حضرت مسیح، اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں یہاں گوتم اور زردشت کو نبی قرار دیا گیا ہے اس لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالے نے ہر زمان و مکان، ہر قوم و ملک، ہر خطہ زمین پر اپنی طرف سے حق کا پیغام پہنچانے والا

اپنے رسولوں اور نبیوں کو بھیجا ہے جنہوں نے انسان کو، اللہ کی ذات وصفات کی توحید، اعمال انسانی کی مجازات، اس مادی دنیا کے بعد ایک روحانی اخروی زندگی کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ انسانی تخلیق وتکوین کا مقصد محض حیوانی خواہشات اور نفسانی جذبات کی تسکین ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبے میں ایسی پاکیزہ عملی حالت پیدا کر لیتی ہے جو اللہ کی خوشنودی کا باعث ہو اور اس کے لئے خود اسی نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ انسانی زندگی کا دستور العمل دے دیا ہے تاکہ انسان اپنی انفرادی، اجتماعی، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی، ہر حالت میں عدل وقسط کا پابند ہو جائے چنانچہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس سلسلۂ نبوت ورسالت کی آخری کڑی تھے جن پر دین اسلامی کی تکمیل اور نعمتِ الٰہی کا اتمام ہو چکا اور قیامت تک اقوام وملل اور ممالک ودول کے لئے آپ کی تعلیمات خضر راہ ہیں۔ باقی جو کچھ ہے وہ صرف سراب زندگی ہے،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَ	اے پیغمبر اسلام! ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسولوں کو بھیجا
رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ	ہے جن میں سے بعض کا قصہ تم کو سنایا اور بعض کا نہیں، رسولوں
وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ	کو خوشخبری سنانے والے اور اعمال کے بُرے نتائج سے ڈرانے
بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (نساء ع ۲۲)	والے بنا کر اس لئے بھیجا گیا ہے کہ لوگوں پر اللہ کی حجت

باقی نہ رہے (اللہ کی عزت وحکمت کا تقاضا ہی یہ تھا) کیوں کہ وہ عزیز وحکیم ہے، ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن	اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے ایسے رسولوں کو بھیجا ہے
قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ	جن کا قصہ تم کو سنا دیا ہے اور بعضوں کا نہیں سنایا، کسی
عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ	رسول کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر
إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ	کوئی آیت لاسکے، جب اللہ کا حکم آچکتا ہے تو حق کے

الحق وخسر ھنالک المبطلون (مومن ع ۸)　ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اہل باطل اس موقع پر ناکام ہو جاتے ہیں۔

ایک جگہ اس طرح فرمایا گیا ہے:۔

لقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔　"اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا اور حکم دیا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی اطاعت سے اجتناب کرو"

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے کہا جاتا ہے،

انا ارسلنک بالحق بشیرا ونذیرا وان من امۃ الا خلا فیھا نذیرا۔　"اے پیغمبر اسلام! ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی اللہ کا رسول نہ آچکا ہو"

ان تمام قرآنی صراحتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسولوں کی دو قسمیں ہیں، بعض کا ذکر قرآن عزیز نے کر دیا ہے خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی اور بعض وہ ہیں جن کا قرآن نے ذکر نہیں کیا، مگر یہ صاف فرما دیا ہے کہ ہر امت میں اللہ کا رسول بھیجا گیا ہے کیونکہ رسولوں کو بھیجنے کے بعد ہی اللہ کے بندوں پر اللہ کی حجت تمام ہو سکتی ہے، جن رسولوں، اور نبیوں کی تفصیلی حالت قرآن نے بیان کی ہے ان پر اسی تفصیل کے مطابق ایمان لانا چاہئے اور جن کا کوئی ذکر اجمالی بھی نہیں کیا گیا ہے ان پر مطلق ایمان لانا چاہئے کہ ہر جگہ اللہ کے نبی آچکے ہیں، مگر ہمیں یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں ہے کہ جس علم کی تفصیل سے اللہ نے ہمیں بے بہرہ رکھا ہم اس کی راز کشائی کے درپے ہو جائیں اور محض تاریخی طور پر حکم لگائیں کہ فلاں نبی تھے فلاں رسول تھے، جیسا کہ مہاتما گوتم بدھ، اور زرتشت کے متعلق ہم صاف طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ نبی تھے کیونکہ ان کی تصریح قرآن نے نہیں کی، اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ برے تھے ممکن ہے کہ وہ نبی ہی ہوں، یا کسی نبی کی امت کے صلحاء ہوں کیونکہ ان کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سچائی اور نیکی کی تعلیم دی تھی، ایمان، عمل صالح،

اور معجزات اعمال پر زور دیا تھا، بہرحال جو لوگ ان کو نبی کہتے ہیں وہ مجرد زعم ہے، محض تاریخ کی شہادت کافی نہیں ہے اور وہ بھی بہت سے اختلافات میں الجھی ہوئی ہے، زردشت کے متعلق خود ان کی ہستی، اور ان کے ظہور کا زمانہ بھی ایک مختلف فیہ مسئلہ بن گیا ہے، بعضوں نے تو اس تاریخی ہستی ہی کا انکار کر دیا ہے اور بعض نے شاہ نامہ کی روایت کو ترجیح دی اور گشتاسپ والا قصہ تسلیم کر لیا ہے بعضوں نے ان کا زمانہ ایک ہزار برس قبل مسیح قرار دیا، بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس تک بڑھا دی، اس طرح محل کی تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر، بعضوں نے خراسان، بعضوں نے میڈیا، اور شمالی ایران قرار دیا، اسی طرح اور شخصوں کا بھی حال ہے۔ لہٰذا ہم کو ان حضرات کی نبوت و رسالت پر حکم لگانا آسان نہیں ہے اور عقاید کے باب میں قطعی دلائل کے بغیر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

ہاں بعض صوفیا کرام کے مکاشفات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نبی تھے، محض کشف کوئی دلیل و حجت نہیں بلکہ اگر شرعی دلائل کے معارض ہو تو چھوڑ دینے کے قابل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا رجحان بعض صوفیا کے مکاشفات اور مؤرخین کے رجحانات کی طرف ہے مگر حقیقت حال وہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے۔

"طاسین مسیح" میں مصلح روس، حکیم طالسطائی کا ایک خواب ذکر کیا گیا ہے جس میں امت مسیح کی شکایت کی گئی ہے پھر طاسین محمد میں روح ابوجہل کا حرم کعبہ میں نوحہ ایک عجیب پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے، جس سے اسلامی تحریک کا مزاج طبعی اور اس کا ابتدائی اٹھان معلوم ہو جاتا ہے۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ — از دم او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاک قیصر و کسریٰ سرود — نوجوانان را ز دست ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است — ایں دو حرف لا الٰہ خود کافری است
تا بساط دین آبا در نورد — با خداوندان ما کرد آنچہ کرد

پاش پاش از ضربتش لات و منات انتقام از وے بگیر اے کائنات!
دل بغائب بست و از حاضر گسست نقش حاضر را فسونِ او شکست
دید بر غائب فرو بستن خطا است آنچہ اندر دیدہ می ناید کجا است
پیش غائب سجدہ بردن کوری است دینِ نو کور است و کوری دوری است
خم شدن پیش خدائے بے جہات بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰت
مذہب او قاطعِ ملک و نسب از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست با غلامے خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرار عرب نشناختہ با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمران با اسودان آمیختند آبروئے دودمانے ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است خوب می دانم کہ سلماں مزدکیست
ابن عبداللہ فریبش خوردہ است رستخیزے بر عرب آوردہ است
عترتِ ہاشم ز خود مہجور گشت از دو رکعت چشم شان بے نور گشت

ان اشعار میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو قرآن اور حامل قرآن کی وجہ سے سرزمین عرب میں ظاہر ہوا اور پھر انسانیت کی ایک جدید تشکیل کی کہ جس میں جامد و متحرک ہر قسم کے بتوں کی فرمانروائی ختم کر دی گئی اور ایک خدائے حکیم و قدیر کے ساتھ انسانیت کو وابستہ کر دیا۔ انسانیت کا فضل و شرف ملک و نسب سے ہٹا کر اللہ کی وابستگی پر رکھا اور تمام انسانوں میں توحید الٰہی کی بنیاد رکھی کہ "احرار عرب" اور "کلفتانِ حبش" دونوں مل جل کر بھائی بھائی ہو گئے جس کی وجہ سے انسانیت ہلاکت سے نکل کر کامیابی کے راستہ پر پڑ گئی چنانچہ اللہ تعالٰے نے فرمایا:۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا "تمام مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو اور جدا جدا

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔

مت ہو جاؤ اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے پس اُس نے تمہیں ہلاکت سے بچا لیا اللہ اسی طرح تم سے اپنی آیتیں بیان کر دیتا ہے تاکہ تم لوگ ہدایت پر آ جاؤ۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے اس "کلمہ جامعہ" کا ذکر فرمایا ہے کہ جس کے ذریعہ اللہ نے انسانیت پر احسان فرمایا اور اس کی عداوتوں کو مٹایا اور دلوں میں الفت پیدا کر دی جس سے اخوت کی بنیاد مستحکم ہو گئی اور اخوت سے پہلے جو خطرناک حالت پیدا ہو گئی تھی اس سے بچا لیا۔
اسی طرح قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی فضیلت تقویٰ پر ہے اور اس کے سوا کسی چیز پر نہیں۔ جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ

"لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شعوب و قبائل پر بنایا ہے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لو اور بے شک اللہ کے ہاں تم میں بزرگ وہی ہے جو تم سب سے زیادہ متقی ہو، یقیناً اللہ علم والا، خبردار ہے۔

یہاں صاف صاف اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ "شعوب و قبائل" محض باہمی، تعارف کا ذریعہ ہیں اور اللہ کے نزدیک بزرگی و برتری صرف صاحب تقویٰ کو حاصل ہے اسلام نے ہر قسم کی قومیتیں خواہ وطنی ہوں یا نسلی ہوں سب کو مٹا کر ایک نئی "بین الاقوامی انقلابی جماعت" پیدا کی

ہے جس کا کام قرآن کے انقلابی جہانی نظریہ کو انسانیت کی فلاح کے لئے رائج کرنا ہے اس لئے ضروری تھا کہ جاہلیت کے تمام تصورات سے الگ اپنی تعمیر کا نقشہ پیش کیا جائے اب پھر ایک مرتبہ اشعار مذکورہ پڑھو کہ طرح روح ابوجہل آج بھی نوحہ خواں ہے، اور اس "مساوات اسلامی" کی حقیقت کے بے نقاب ہونے سے کسی طرح آج زرپرست، اور زرپسند انسان گھبرا رہے ہیں، اور دنیا کے موجودہ غیر اطمینان بخش دور میں اگر اس "اسلامی مساوات" کو پیش کیا جائے تو کیا دنیا اپنی سیرابی کا سامان اس آب حیات کے ذریعہ نہیں کر سکتی؟ اب وقت نہیں ہے کہ اسلامی مساوات، اخوت اور اس پر قائم ہونے والی اجتماعی فلسفہ و تمدن کی عمارت کو اس وقت تک موخر کر دیا جائے جب تک کہ "نسلی مسلمان" سدھر نہ جائے بلکہ اب پھر سے "ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ" کی دعوت عام طور پر دیتے رہنا چاہئے جن لوگوں کے دلوں میں استعداد قابلیت ہوگی وہ ادھر کھینچ کر آئیں گے، خواہ موجودہ "نسلی مسلمان" ہو یا دوسری "غیر مسلمان" قوموں کے سعید صالح افراد، مگر کتنی افسوس ناک ہے یہ حالت کہ وہ جس کے پاس یہ "آب حیات" موجود ہے وہ اقوام عالم کی امامت کے بجائے غیروں کی امامت میں دوڑے چلا جا رہا ہے، اور شعوری یا غیر شعوری کسی نہ کسی طرح اس کو درست بھی سمجھتا ہے۔ لیکن امید ہے کہ اسلام کا عمومی پیام پھر ایک بار اسی طرح زندگی بخش ثابت ہوگا جس طرح پہلے ہو چکا ہے اور وہ تمام سعید روحیں آملیں گی جن کے اندر اسلامی انقلاب کی تڑپ موجود ہے۔

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک		بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی

جب زندہ رود کو اس کا رہنما فلک عطارد میں لے جاتا ہے، تو وہاں سید السادات مولانا سید جمال الدین افغانی اور ترکوں کے بہترین سپہ سالار حلیم پاشا کی روحوں سے ملاقاتیں نصیب ہوتی ہیں "رومی" زندہ رود کا تعارف دونوں سے کراتے ہیں، زندہ رود سے حضرت افغانی دنیائے جدید بالخصوص مسلمان ملکوں کے حالات دریافت فرماتے ہیں، پھر علامہ افغانی جواب دیتے ہیں اور "دین" و "وطن" کا مسئلہ

سمجھاتے ہیں، "اشتراکیت" و "ملوکیت" کے طلسم کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

اس کے بعد "زندہ رود" سعید حلیم پاشا سے ہم کلام ہوتا ہے، غازی مرحوم اہل شرق و اہل غرب کے اختلافات اور نفسیاتی رجحانات پر نہایت دل افروز تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ افرنگیوں کا شعلہ "نم خوردہ" ہوچکا ہے ان کی آنکھیں اگرچہ تیز ہیں مگر پہلو میں دل مردہ ہوچکے ہیں کمال اتاترک نے یورپین قوموں کی تقلید و نقالی کر کے جو "تجدد" کا ثبوت دیا ہے اس کی پوری اصلیت آشکارا کر دی جاتی ہے کہ ترکوں نے جس کو "جدید" سمجھا حقیقت میں وہ ایک بالکل "ضلال قدیم" ہے اس تقلید کے باعث ترکیہ اپنے مرکز اصلی "اتحاد اسلامی" سے ہٹ گئی ہاں! پھر سے "ملت ترکیہ" کے "تجدد" کی نہیں "تجدید" کی اگر ضرورت ہو تو ان خیر خواہی کی باتوں کو محفوظ رکھو، اور سوچو کہ کب تک دوسروں پر تکیہ کرو گے!

چو مسلمانان اگر داری جگر! در ضمیر خویش و در قرآن نگر!
صد جہانِ تازہ در آیاتِ او عصرہا پیچیدہ در آناتِ او
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است ہر جہاں اندر بر او چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآن جہانے دیگرش

اگر تم مسلمانوں کی طرح جگر رکھتے ہو تو تم اپنے ضمیر اور قرآن ان ہی دو چیزوں کو ٹٹول کر دیکھو یعنی اپنے فطری انداز سے غور کرو کہ تم میں اور قرآن میں کیوں لگاؤ نہیں ہے قرآنی ہدایات کے علمی و عملی پہلو کیوں نگاہوں سے اوجھل ہوگئے کہ تمہاری حیات اجتماعی پر غیر اسلامی نظریات و افکار نہ صرف خارجی طور پر مسلط ہو چکے ہیں بلکہ ذہن و دماغ کی پوری فکری صلاحیت مفقود ہو چکی ہے جو کچھ سوچا جاتا ہے اپنے ضمیر کی روشنی میں نہیں بلکہ دوسروں کے مستعار فکر سے سوچا جاتا ہے بس اس کو چھوڑ دو اُس ضمیر سے سوچو جو اسلام کے سانچے میں ڈھلا ہو، پھر قرآن سے وابستہ ہو جاؤ یہ تمہاری زندگی میں کامیابی

ہے۔ قرآن کو "اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" یا دستورِ کہن "نہ سمجھو اس کی آیتوں میں سینکڑوں نئے نئے جہاں آباد ہیں اس کی آیتوں میں بہت سے زمانے پیچیدہ ہیں جن میں اگر ایک "عصر قرآنی" بھی پالو تو "عصر حاضر" کی کرب دبے چینی اور اجتماعی پریشانی کو رفع کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ تمہارے سینہ میں اگر معنی رس دل موجود ہے تو ان حقائق پر غور و خوض کرو۔

مومن کی حقیقت کیا ہے؟

وہ خدائے تعالیٰ کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے اس کا وجود "خلافت الہیہ" کے قیام کا ضامن ہے ہر دورِ زندگی اس کے لئے ایک لباس کی طرح عارضی چیز ہے جس زمانے میں جو لباس چاہیے استعمال کرتا ہے یہاں تک کہ ہر دور میں اس کو نئے لباس کی ضرورت ہوتی ہے "یعنی مومن" کے اندر اتنی لچک ہوتی ہے کہ وہ اپنی ایمانی قوت سے ہر زمانے کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ جب چاہتا ہے زمانیات سے وابستہ ہوتا ہے اور جب چاہتا ہے زمانیات کی چادر اتار پھینک دیتا ہے یعنی وہ زمانے پر حکمران ہوتا ہے "زمانہ اس پر حاکم و آمر نہیں بن سکتا۔ اگر ایک زمانہ پرانا ہو جاتا ہے تو چونکہ مومن قرآن سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے ہر دم اس کو قرآنی علوم سے نیا نیا زمانہ ملتا رہتا ہے۔

سید جمال الدین افغانی سے گفتگو

اس کے بعد "زندہ رود" سید افغانی سے گفتگو شروع کرتا ہے اور سوال کرتا ہے۔

زورق ما خاکیاں بے ناخدا است کس نداند عالمِ قرآن کجا است

نہ تو ہم خاکدانِ فانی پر رہنے والوں کی کشتی کا کوئی ناخدا ہے۔ اور نہ ہمیں قرآنی عوالم میں سے کسی کی خبر ہے؟ اور کوئی یہ جاننے والا تک نہیں کہ "عالم قرآن" ہے کیا؟

اس پر سید افغانی "زندہ رود" سے مخاطب ہوکر فرمانے لگتے ہیں، اور عالم قرآن کی تشریح کرتے ہیں۔

وہ عالم ابھی تک ہمارے سینوں میں گم ہے اور "قُم" کی انتظار میں ہے اس عالم میں خون و رنگ کا امتیاز نہ ہوگا

اس کی شام صبح فرنگ سے زیادہ روشن ہو گی اس میں بادشاہوں اور غلاموں کی تفریق ناپید ہو گی اور اس کی وسعت مومن کے دل کی طرح بے پایاں ہو گی وہ عالم رعنا ایسا ہو گا کہ اس کا فیض یک نظر جاودانی عمر میں تخم ...کرے گا وہ عالم ایک لازوال عالم ہو گا اس کے واردات نو بہ نو ہوں گے اس کے محکم برگ وبار بھی تازہ تازہ ہوں گے اس کا باطن ہر تغیر سے بے غم اور اس کا ظاہر ہر دم انقلاب ہی انقلاب ہو گا یہ عالم تم پوچھتے ہو کہ کہاں پوشیدہ ہے سن لو کہ یہ عالم خود تمہارے اندر پنہاں ہے آؤ اب اس کے محکمات کی تشریح بھی سن لو۔

(۱) پہلے خلافت آدم کو لو۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اور اس کا وجود اسرارِ عشق میں سے ایک بھید ہے اور کسی قسم کے حدود میں وہ محدود نہیں ہو سکتا اور اس کی پوری حقیقت۔

حرف اِنِّی جَاعِلٌ تقدیر او   از زمین تا آسمان تفسیر او

یعنی آدم کی خلافت اور اس کا مقصد تسخیر کائنات کے ذریعہ عرفان الٰہی ہے" اِنِّی جَاعِلٌ" کی شرح کسی قدر اوپر ہو چکی ہے مزید یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ آدم کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عالم رنگ و بو میں نہیں سما سکتا البتہ تمام عالم مادی اس میں سما سکتا ہے آدم کا مرتبہ تمام کائنات اور اس کی اشیاء سے برتر ہے اس کا آخر دم" اصل تہذیب" ہے غرض آدم کی حقیقت کے لئے عشق اور علم دو باتوں کو سمجھ لینا چاہیے اور زندگی اسی سے عبارت ہے اور خلافت آدم کا مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات کا خالق مالک اور مربی خدائے تعالیٰ ہی ہے انسان صرف اس کی طرف سے بہ طور نائب اور خلیفہ کے ان چیزوں میں تصرف کر سکتا ہے اور وہ بھی صرف انہیں چیزوں میں تصرف کر سکتا ہے جن کی اجازت مالک حقیقی نے دے رکھی ہے، اور استعمال بھی مالک کے منشاء و مقصد کے خلاف نہ ہونا چاہیے اگر ایسا نہ ہوا تو "خلیفۃ اللہ" کے بجائے وہ غاصب ہو گا اور اس سے بازپرس کی جائے گی مگر جب تک "خلیفۃ اللہ" کے لئے احکام الٰہی کی تنفید کا موقع نہ ہو اس کی خلافت کا راز سربستہ آشکارا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ دوسری چیز "حکومت الٰہی" ہے یعنی تمام

کائنات اللہ تعالیٰ ہی کی ملوک ہے انسان کو حکومت الٰہی کے قیام کے سوا دوسری چیز کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے اور جب انسان اپنی ظاہری و باطنی تربیت کے بعد اس مقصد کے قیام کے لیے مستعد ہو جاتا ہے تو بندۂ حق بن جاتا ہے اور "مقامات" سے بے نیاز ہوتا ہے اور اس میں حریت و آزادی اس درجہ آجاتی ہے کہ وہ نہ تو کسی غیر اللہ کی طاقت کے آگے سر جھکاتا ہے اور نہ یہ پسند کرتا ہے کہ کوئی اس کا غلام بن کر اس کے آگے سرنیاز خم کرے بلکہ مساوات انسانی کا دنیا میں عملی پیغام پیش کر دیتا ہے ساری زمین اس کا ملک اور اس کے ملک کا آئین "خداداد" ہوتا ہے اس کی رسم و راہ، اس کا دین و آئین اس کا زشت و خوب سب کچھ خدائے تعالیٰ ہی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور اس میں سے وہ "عقل خود بیں" نکل جاتی ہے جو صرف اپنا ہی فائدہ دیکھتی ہے دوسروں کے آرام کا کچھ خیال نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے اس مرد حق کا آئین خداداد (یعنی "دی حق" (قرآن عزیز) تمام نوع انسانی کے سود و بہبود کا دیکھنے والا ہوتا ہے اور تمام انسانوں کے فوائد بحیثیت مجموعی اس کے پیش نظر ہوتے ہیں اور "مرد حق" اس آئین خداداد سے وابستہ ہو کر صلح ہو یا جنگ ہر حال میں عادل ہوتا ہے اور اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ اس کے سامنے رہتا ہے اور عین حالتِ جنگ میں بھی اس کو حکم ہے کہ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ - اب ذرا اس آئین خداداد "قرآن" کے مقابلہ میں انسانی ملوک و سلاطین کے آئین کا "موازنہ کرو" ؎

حاصل آئین و دستور ملوک   دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

آئین ملوکیت کی وجہ سے انسانیت طبقوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک طبقہ زمین داروں کا پیدا ہو جاتا ہے جو جائز و ناجائز اموال کھا کھا کر موٹا تازہ ہوتا ہے تو دوسرا طبقہ نادار کسانوں کا ہے جو صرف ایک "دھواں" بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ انسانی طبقات کی غیر فطری تقسیم ملوکیت کے غیر معتدل نظام کا نتیجہ ہے اگرچہ یہی ملوکیت ذرا ترقی پاتے پاتے اپنی ظاہری شکل میں بہت کچھ طمطراق پیدا کرتی ہے اور "دستور جمہور" کا خوش کن نام اس کو مل جاتا ہے اور حقیقت میں شاطران ملوکیت "ہر زمانہ میں اپنی عجیب عجیب

کمین گاہیں بنا لیتے ہیں اور یہ سب کچھ جمہوریت ایک "ستر دلبراں ہے کہ جس کی تہ میں "انسانیت" متاع سوگراں بن جاتی ہے اس جمہوریت نے بھی رنگ بہ رنگ کے چہرے بدلے ہیں مگر اس سے عبرت کے سوائے کچھ حاصل نہیں بلکہ اس کی تقلید سے آزاد ہو جانا ہی سب سے بڑھ کر دنیائے انسانی کے لئے آزادی ہے اور اس نام نہاد جمہوریت سے آزادی دامن قرآنی سے وابستگی کے بغیر ناممکن ہے ؎

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو　　　دامن قرآن بگیر آزاد شو

افسوس ہے ان لوگوں پر جو دامن قرآن سے وابستگی کے بغیر آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں، خواہ ہندوستانی جمہور کی مغربیت نواز جمہوریت والی آزادی ہو یا "مسلمان" نامی قوم کی قومی جمہوریت ہو جس میں دامن قرآنی سے کوئی لگاؤ نہ ہو، آپ اس کا خواہ کوئی نام رکھ لیں جب تک اس کی بنیاد قرآن کے نظریہ سیاسی پر نہ ہوگی وہ مسلمانوں کے لئے تو ان کے مرض کا علاج نہیں البتہ ممکن ہے چند سرمایہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو جائے جو "اسلامی حکومت" اسلامی حکومت" پکار رہے ہیں ان کو سب سے پہلے اس کی جامع تشکیل کر دینی چاہئے پھر اس کے قیام کے لئے وہی ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جس کے نتیجہ لازمہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آ جائے ورنہ یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

(۳) ارض ملک خدا ہے یعنی جس طرح پہلے جمہوریت و ملوکیت کی پردہ دری کی گئی ہے اور کسانوں اور ناداروں کی حمایت میں آواز اٹھائی گئی ہے ٹھیک اسی طرح پر یہاں زمین کا مسئلہ حل کر دیا جاتا ہے جو موجودہ دور کی سب سے بڑی ہنگامہ خیز تحریک اشتراکیت کی جان ہے یعنی زمیندار اور کسان کی کش مکش دور کرنے کے لئے اشتراکی زاویۂ نگاہ غیر مفید ہے بلکہ قرآنی زاویۂ نگاہ پیش نظر ہونا چاہئے۔

قرآن عزیز نے زمین اور زمین کی تمام چیزوں کو "متاع" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے یعنی یہ تمہارے استعمال کی چیز ہے اس کو تم استعمال کر سکتے ہو اور ملکیت تو صرف خدائے واحد ہی کی ہے تمہارے نفع کے لئے اس نے اپنی ملکیت کی تمہیں اجازت دی ہے۔

حق زمیں را جز متاع ما نہ گفت این متاع بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا! نکتۂ از من بگیر رزق و گور از او بگیر او را مگیر

زمین کو حق تعالیٰ نے جب صرف متاع فرمایا ہے تو اس کو برتنا ضرور چاہئے مگر اس پر "ملکیت" قائم کرکے دوسروں کے حقوق غصب کرنے کسی طرح روا نہیں البتہ اپنا رزق اور اپنی "قبر" دو ضرورتوں کی تکمیل اس زمین سے کی جاسکتی ہے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ یہاں اشتراکیت اور اسلام کا جوہری فرق معلوم کیا جاسکتا ہے اشتراکیت مساوات انسان کی بنیاد صرف "مادیت خالصہ" پر رکھتی ہے اور ایک ظلم کو رفع کرکے دوسرے ظلم کو اس کے قائم مقام بنا دیتی ہے برخلاف اس کے قرآنی نظریہ ہے جو انسانیت کو ایک بلند اجتماعی، مادی اور مابعد الطبیعاتی۔ نصب العین عطا کرتا ہے اور اس کی نگاہ میں پوری کائنات مادی اور اس کا نظام کون و فساد ایک برتر و اعلیٰ ہستی کے ساتھ وابستہ قرار دیتا ہے اور اس طرح زمین داروں کو کسانوں پر ظلم کرنے سے روک دیتا ہے اس جوہری فرق کے بعد ان لوگوں کی غلط کاری واضح ہوگئی جو اسلامیات کو اشتراکیت پر چسپاں کرتے ہیں اور اپنی جگہ خوش ہو رہے ہیں کہ "اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ" حالانکہ انہوں نے دو متضاد چیزوں کو ایک کرکے فساد پیدا کر دیا ہے اور افسوس کہ ان کو اس کا شعور و احساس تک نہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

زمین کے متعلق قرآنی نظریہ واضح ہو چکا۔ جو اس حقیقت سے انکار کرے گا وہ کفر کی حقیقت سے ہم کنار ہوگا، اس واسطے کہ کفر "من یبتغ غیر الاسلام دینا" کے سوائے کچھ نہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور اشتراکی بھی، افسوس ہے کہ ایک عجیب تضاد میں مبتلا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اشتراکیت محض کسی جزوی نظام انسانی کا نام ہے یا ایک "کلی اجتماعی نظام" کا اگر پہلی صورت ہوتی تو خیر ایک حد تک لوگوں کو معذور سمجھا جاتا مگر واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسری صورت ہے یعنی اشتراکی حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ دنیائے انسانیت کی فلاح و صلاح اور اس کی کامیابی کے لئے ایک جامع و مکمل نظام

"اشتراکیت" ہے جو انسانیت کی ہیئت اجتماعیہ کی ایک خاص تشکیل کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف اقتصادی نظام ہے بلکہ اخلاقی سیاسی اور عمرانی پروگرام بھی ہے اور تمام اجزاء میں پورا پورا منطقی ربط و تعلق ہے صرف اس کو اقتصادی نظام قرار دینا اور "مذہب" سے غیر متصادم سمجھنا نظر و فکر کی ایسی پراگندگی ہے کہ جس کا علاج بظاہر مشکل ہے اشتراکیت کا نقطۂ آغاز، کائنات کے سراسر مادی تصور اور اس کے مظہر اتم "شکم پروری" سے شروع ہوتا ہے اور اختتام ایک غیر دینی جمہوری انسانی مساوات پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ صاف کہنا پڑتا ہے۔

باطن الارض للہ ظاہر است ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

اب سمجھ میں آگیا کہ کافر کا لفظ ٹھیک اپنے معنی میں بولا گیا جو اسلام کے چند رسوم کی پابندی کے ساتھ ساتھ کفر کی طاقتوں اور ان کے سیاسی نظریوں سے اتحاد ذہنی یا خارجی رکھتے ہیں وہ حقیقت میں "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" اور "ادخلوا فی السلم کافۃ" کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں اور قرآن کی زبان میں "وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ" کے مصداق ہیں اسلام کے فلسفۂ اقتصاد کا بعض نظریات میں بظاہر اشتراکیت سے مشابہ ہو جانا ہرگز اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اسلام اور اشتراکیت باہم دیگر ہم آہنگ ہیں اور جس طرح ملوکیت پسندانہ ذہنیت رکھنے والوں نے اسلام کو اپنے معبودان باطلہ اور الہہ کاذبہ کی مرضیات کے مطابق ڈھالا ہے اور جب سے آقایان فرنگ کا مفاد جمہوریت کی چیخ و پکار میں مرکوز ہو گیا ہے تو اب اسلام کی جمہوریت کا بھی راگ خوب الاپا جا رہا ہے اسی طرح "اشتراکیت" کو ایک ہنگامہ خیز تحریک انقلاب سمجھ کر اسلام کو اس سے ہم آہنگ کر دینے کی غلط روش اختیار کی گئی ہے، ان سب پر اقبال کہتے ہیں،

اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل است

الحاصل اشتراکیت کا نظریہ زمین کے متعلق بالکل غلط اور غیر فطری امر ہے مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم مادی اشیاء اور اس کی طبعی قدروں سے ناواقف ہیں اور مادیات سے مجرد ہو جانے

کا جو گیا وہ مشورہ دے رہے ہیں۔

اسی لئے سید افغانی نظریہ قرآنی "الارض للہ" کو واضح فرماتے ہوئے صاف کہہ رہے ہیں کہ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ انسان کو اس "کاخ و کوے" سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے بلکہ جہان رنگ و بو کو اپنی ہی دولت سمجھو مگر آذری طریقہ کو چھوڑ کر اپنی مراد پر یعنی مراد قرآنی پر ایک "جہان نو" ضرور آباد کرو چونکہ دل "حریم قرآنی" ہے اس کو کسی غیر کے حوالہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے اور اس کی ضرورت ہے کہ "لاالہ" کو از بر کرلیا جائے تاکہ ایک عالم کو اپنے اندر گم کردیا جائے تاکہ "فقر سلطانی" اور "فقر رہبانی" کا فرق ظاہر ہو جائے۔

چوتھی چیز جس کو سید افغانی محکمات قرآنی سے تعبیر فرما رہے ہیں وہ "خیر کثیر" ہے

گفت حکمت را خدا خیر کثیر	ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

یہاں "وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" پر راہنمائی کی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حکمت خیر کثیر ہے اس کو ہر طرح پالینا چاہیئے وہ ہمارا ہی حق ہے آپ نے پہلے خلافت آدم حکومت الٰہی دونوں کی اجمالی حقیقت معلوم کرلی ہے "خیر کثیر" کو سمجھ لینا کچھ دشوار نہیں وہ تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضروریات زندگی کے لئے کائنات میں فراہم کردی ہیں وہ سب اس کے حق میں خیر کثیر ہیں اور تمام تکونیات کی تحقیق و تدقیق اس کو خالق کائنات سے ہی ہم کنار کرتی جائے گی اور جو حکمت ان چیزوں میں ممد و معاون ہے وہی خیر کثیر ہے اور جب یہ حاصل ہو جائے گی تو پھر عجیب کیفیت ہوگی۔

چشم او بر واردات کائنات	تا بہ بیند محکمات کائنات

کائنات کی محکمات نظر آنے لگیں گی اور "سُبْحَانَكَ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" کی زمزمہ سنجیوں سے زبان شاد کام اور روح مسرور ہوگی مگر کائنات اور اس کے واردات کی تحلیل کے دو منادو رہوا کا ایک تو وجود باری اور اس کی وحدت کے انکار پر دو

اس کے اقرار اور لوازم اقرار پر۔ پہلی صورت میں کافرانہ انداز ہوگا جس میں اپنی بدقسمتی سے اس وقت مادہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والا یورپ عام طور پر مبتلا ہے اور اس کو تمام قوموں میں دماغی راہنمائی کا وہ مقام حاصل ہے کہ اس کا ہر "انکشاف" دنیائے جدید کے لئے وحی کا حکم رکھتا ہے۔ اے کاش مسلمان قرآنی علوم میں سے "علم تذکیر بآلاء اللہ" کی حقیقت کو اس دور میں معلوم کرتے اور ایجادات واختراعات کی اہمیت کو سمجھتے! اور قرآن کے "امور کونیہ" پر بھی اپنی کوششیں صرف کرتے تو انہیں یہ حقیقت بے نقاب ہو کر نظر آتی۔ غرض حکمت اور سائنس اور اسرار کائنات کی تحقیق و تدقیق کی بنیاد "دین" کے نقطۂ آغاز سے ہو تو "پیغمبرانہ" کام ہے ورنہ سوائے کافری کے کچھ بھی نہیں!

دل اگر بندد بر حق، پیغمبری است ورز حق بیگانہ گردد کافری است

اگر حکمت اس معیار پر نہ ہو تو خیر کثیر کی بجائے "شر کثیر" بن جاتی ہے ؎

علم را بے سوز دل خوانی شر است نور او تاریکیٔ بحر و بر است

اس چیز کے سمجھنے کے لئے اس خونی ڈرامہ کا مطالعہ کافی ہے جو اس وقت یورپ کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے کہ کس طرح "سینۂ افرنگ" کے لئے "بے سوزی" مہیا کی گئی ہے اور یہی چیز ہے جس کے باعث ابلیس کو اپنی کارفرمائیوں کا خوب موقع مل جاتا ہے مگر ابلیس اور اس کی کارفرمائیوں کا ختم کر دینا بھی غایت درجہ مشکل ہے یعنی انسان کے اندر خود جب قوت بہیمیہ موجود ہے جو اس کا مظہر اتم ہے تو اس "ابلیس" کو بالکل ختم کر دینا تو نہیں ہو سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ابلیسی قوت یا بہیمیت کو "مسلمان" کرے یعنی اس درجہ اصلاح یافتہ کر دے کہ وہ مقید بن جائے اور اس کی مضرت رسانی جاتی رہے۔

خوش تر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

یعنی ابلیسی قوتوں کو قرآن کی شمشیر سے کشتہ بنا دو تو پھر وہ مسلمان ہو جائیں گی اور اسی

کے ساتھ ساتھ ضرورت ہے "علم با عشق" کی جو "لاہوتیوں" کی نشانی ہے نہ کہ "علم بے عشق" جو طاغوتیوں کی علامت جلی ہے جس کے بعد "بولہب" کو بھی "حیدر کرار" کہا جاسکتا ہے۔

اس محکمات قرآنی کی شرح کو سن کر "زندہ رود" چلا اٹھتا ہے کہ

محکماتش وانمودی از کتاب ہست آں عالم ہنوز اندر حجاب

اگرچہ آپ نے قرآن کے محکمات کو ہویدا کر دیا ہے مگر اب تک وہ عالم حجاب ہی میں ہے حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھا کر صاف چہرہ کشائی کیوں نہیں کی جاتی اور وہ عالم ہمارے ضمیر سے کیوں نمودار نہیں ہو جاتا! اس عالم قرآن کے بجائے ہمارے سامنے ایک ایسا فرسودہ عالم ہے جس کی خاک میں ملتِ اسلامیہ آسودہ ہے تمام مسلمانوں کے سینوں سے "سوز" جاتا رہا کیا ہم یہ سمجھیں کہ مسلمان مر گئے یا قرآن مر گیا! قرآن تو بہرحال حیّ و قیوم کا کلام ہے اور "انا لہ لحافظون" کا وعدہ اس کی حفاظت کا ضامن ہے البتہ مسلمان قومیں مر چکی ہیں گو بہ ظاہر ان میں کچھ زندگی نظر آرہی ہے۔

پرنس سعید حلیم پاشا سے گفتگو

سید افغانی کے بعد پرنس سعید حلیم پاشا ترکی دنیا کی داستان غم سناتے ہیں جو کم و بیش تمام مسلمانوں کو معلوم ہے دین حق کافری سے بھی زیادہ رسوا ہو گیا ہے چونکہ "ملائے سو" اور ملاؤں نے کفر گری شروع کر رکھی ہے ان لوگوں کی قرآن فروشی سے روح الامین کو خود میں نے بھی نالاں پایا ہے۔

از شگرفیہائے آں قرآن فروش دیدہ ام روح الامین را در خروش

زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ نزد او ام الکتاب افسانۂ

بے نصیب از حکمت دینِ نبی آسمانش تیرہ از بے کوکبی

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ملت از قال و اقوالش فرد فرد

ان اشعار میں "علمائے شرار" کی پوری حقیقت کھول دی گئی ہے یعنی ان کو کائنات

علوی سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی قرآن عزیزان کے نزدیک ایک افسانہ کی سی حیثیت رکھتا ہے دین محمدی کی حکمت سے وہ بے بہرہ ہوتے ہیں ان کا آسمان بے کوکبی سے تیرہ وتاریک ہوتا ہے ان کی کم نگاہی کورذوقی ہرزہ گردی اور ان کے "حال و اقوال" سے ملت اسلامیہ پارہ پارہ ہوگئی ہے۔

"علمائے سو" اور "علمائے خیر" کی اگر تفصیل مطلوب ہو تو احیاء العلوم امام غزالیؒ کی پڑھو یا تذکرہ مولانا ابوالکلام" (رفقہ اللہ لما یحب و یرضیٰ) میں اکبری دور کے "علمائے سو" کے حالات کا مطالعہ کرو یا کم از کم اپنے دور کے ان علمائے سو کو دیکھو جو اب تک عقائد میں غیر ضروری باتوں پر اصرار کر رہے ہیں رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب ثابت کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور سینکڑوں ایسی باتیں گھڑ رکھی ہیں جن کا کوئی ثبوت اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت سے نہیں بجائے قرآن کی تعلیم و تبلیغ کے وہ لوگ بے معنی جھگڑوں میں مبتلا ہیں اور اس طرح ان غیر حقیقی مسائل میں الجھ کر قرآن کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا ہے" نزد او ام الکتاب افسانہ" اس لئے ایسے "علماء سو" اور ان کی درسگاہوں کا وجود سب کچھ بے کار ہیں اس واسطے کہ ان کو اسلامی خدمت اور قرآنی تبلیغ کا اہتمام ہی نہیں ہے اور ان کی مثال "کور مادرزاد" اور "نور آفتاب" کی سی ہے۔

مکتب و ملا و اسرار کتاب　　　کور مادر زاد و نور آفتاب

اب ذرا مرد حق کی بھی کچھ علامتیں سن لو جو علمائے خیار میں سے ہوتا ہے کہ وہ جہاں چار سو کی جان ہوتا ہے اس کے افکار مومن کے لئے اسباب زندگی ہوتے ہیں اس کی ہر ہر سانس ملت اسلامیہ کے لئے ثبات کا سبب بن جاتی ہے مختصر یہ کہ قرآن عظیم کی حفاظت اس کا آئین اور حق بات کو کھلم کھلا کہہ دینا ہی اس کا دین ہوتا ہے۔

حفظ قرآن عظیم آئین تست　　　حرف حق را فاش گفتن دین تست

یعنی قرآن عظیم کے علم و عمل کی حفاظت ہی اس کی زندگی کا مقصد وحید بن جاتا ہے اور ہر

وقت حق و صداقت ہی کے لئے اس کی زبان وقف ہو جاتی ہے اس کی طرف حدیث نبوی میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک طبقہ میری امت میں ضرور ایسا رہے گا جو حق پر ثابت قدم رہ کر منصور ہو گا اور اس کا کام اسلام کو ہر دور میں "جاہلیت" سے ممتاز کر کے پیش کرتے رہنا ہو گا۔

ذرا اس مرد حق کے اوصاف جمیلہ بھی سن لیجئے۔

مرد حق از کس نہ گیرد رنگ و بو   مرد حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر   ہر زماں اور اچوں حق شانے دگر
راز ہا با مرد مومن باز گوئے   شرح رمز "کل یوم" باز گوئے

مرد حق کا کام حق سے ہی رنگ و بو حاصل کرنا ہے نہ کسی دوسرے سے اثر پذیر نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کی شئوں و تجلیات کا ہر دم مظہر بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر وقت اس کی ایک نئی شان ہوتی ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کی صفت "کل یوم ھُوَ فِی شَان" کا نمونہ ہوتا ہے اور "تخلق باخلاق اللہ" کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ پھر سید افغانی سلسلہ کلام شروع کرتے ہیں کہ تم کو حدیث مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم یاد ہو تو سمجھ سکتے ہو کہ "دین حق" پھر دنیا میں غریب ہو گیا ہے یعنی جس طرح اسلام ابتدائے بعثت نبوی میں "غربت" کی حالت میں شروع ہوا اسی طرح آج دین پر غربت طاری ہو گئی ہے ذرا "غربت" کا مفہوم بھی ذہن نشین کر لو اور سمجھ لو کہ ہر زمانہ کی "غربت" الگ الگ ہوتی ہے اگر تم اس دور کی "غربت دین حق" کو صحیح طور پر معلوم کر لو گے "تو عصر نو" کو دام میں لا سکتے ہو مگر افسوس ہے کہ آج مشرق و مغرب دونوں پیچ و تاب میں ہیں کوئی بھی اسرار قرآن سے واقف نہیں اگرچہ روسیوں نے "نقش نوی" کی طرح ڈال دی ہے مگر "آب و نان" ہی کے دام میں الجھ کر رہ گئے اور دین کو فراموش کر دیا ہے میری طرف سے ملت روسیہ کو یہ پیغام پہنچا دو۔

منزل و مقصود قرآں دیگر است   رسم و آئین مسلماں دیگر است
در دل او آتش سوزندہ نیست   مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد

یعنی آج کے مسلمان کو دیکھ کر دین حق کو نہ سمجھ کیوں کہ آج کے مسلمان اور اس کی منزل مقصود قرآن سے علیحدہ ہے اور قرآن کے علاوہ ہر دوسری چیز مسلمان کا رسم و آئین بن چکی ہے آج کے مسلمان کے دل میں وہ محبت نبوی کی آتش سوزاں نہیں ہے جس کے باعث آج کا بندۂ مومن قرآن کے ثمرات سے محروم ہے اسی لئے بالکل تہی پیمانہ بن گیا ہے یہی مومن ہے جس نے قیصر و کسریٰ کے طلسم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا مگر افسوس کہ خود ہی پھر تخت ملوکیت پر بیٹھ گیا یہاں تک کہ جوں جوں اس کی سلطنت قوی ہوتی گئی دین کی گرفت ڈھیلی ہوتی رہی اور ملوکیت کے خدوخال نمایاں ہوتے گئے اور خلافت اسلامیہ نے "منہاج نبوت" سے ہٹ کر "ملک عضوض" کی شکل اختیار کرلی۔ یہی وجہ ہے کہ ملوکیت نے زاویۂ نگاہ، عقل، ہوش اور رسم و راہ سب ہی کچھ بدل دیا ہے اب اے ملت روسیہ! تو نے دستورِ کہن سے دل برداشتہ ہو کر ایک طرح دیگر ڈالی ہے اور قیصریت کی ہڈیاں چور چور کر دی ہیں تو تجھے چاہیئے کہ اپنے ضمیر میں نورانیت بھی پیدا کرے اور ہماری سرگذشت سے عبرت حاصل کرے اب تجھے اس "لات و ہبل" قیصریت و کسرائیت، ملوکیت سرمایہ داری کے بتوں کی طرف دوبارہ متوجہ نہ ہونا چاہیئے اب اس "دنیائے پیر" کو ایک ایسی ملت کی ضرورت ہے "جو بشیر و نذیر" دونوں صفتوں سے متصف ہو افرنگ کے آئین اور دین دونوں پرانی چیزیں ہوچکی ہیں اب "دیر کہن" کی طرف نہ جا! ہاں تیرے کرنے کا کام صرف اتنا ہے کہ جہاں تو نے خداوندان کہن کا کام تمام کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے محض اس شکست و ریخت پر ہی بھروسہ نہ کرے بلکہ اس کے بعد تعمیر نو کی بھی ضرورت ہے اس لئے تجھ کو "لا" سے "إلاّ" کی طرف آجانا چاہیئے تاکہ تو نفی سے گذر کر راہ اثبات کو حاصل کرے اور زندہ جاوید ہو جائے اگرچہ تو ایک "نظام عالم" کی تڑپ ضرور رکھتی ہے مگر افسوس ہے کہ اس کے لئے کسی "اساس محکم" کی تلاش نہیں ہے، اب سن ہم بتاتے ہیں کہ وہ "اساس محکم" کیا ہے۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب فکر را روشن کُن از امّ الکتاب

اگر تو نے اے ملت روسیہ! داستان کہن کو دھو دیا ہے اور دماغ سے محو کر دیا ہے تو اپنی قوت فکریہ کو قرآن سے روشن کرے ایسی وہ کتاب ہے جس نے سیہ فام دنیا کو ید بیضا دے کر لا قیصر و لا کسریٰ کا مژدہ سنایا تھا۔ اگر اہل مغرب کے مکر سے آگاہی حاصل ہو تو "روبہی" چھوڑ اور "شیری" اختیار کر اور "روبہی و شیری" کا فرق کیا ہے؟

جذبہ قرآں ضیغمی رُوباہی است نقر قرآں اصل شاہنشاہی است

نقر قرآں اختلاط ذکر و فکر فکر را کامل نہ دیدم جذبہ ذکر

قرآن کے بغیر اگر انسان کو ضیغمی اور شیری مل بھی جائے تو حقیقت میں روباہی اور مکر و فریب ہی کا ایک مظاہرہ ہوگا نقر قرآنی کو نقر رہبانی نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ شاہنشاہی کی اصل دبنیاد ہے اور "نقر قرآنی" جو گیانہ طرز زندگی ہے اور نہ اس کی ریاضتیں اور معاہدے اتنے دشوار ہیں اور نہ وہ محض فلسفیانہ کاوشوں کی تصوری دنیا ہے جو کبھی میدان عمل میں شرمندہ تشکیل نہ ہو سکے بلکہ قرآن عزیز نے جو نقر پیش کیا ہے وہ شاہنشی کی اصل ہے چوں کہ اس کی حقیقت نہ محض فکر ہے اور نہ محض ذکر ہے بلکہ ذکر و فکر کا اختلاط ہے یہاں " ذکر اور فکر" دو تعبیریں سمجھنے کے قابل ہیں علامہ اقبال کی اصطلاح میں ذکر سے مراد عملی پہلو اور فکر سے مراد علمی پہلو ہے یعنی جب تک انسان دونوں علمی و عملی قوتوں کا جامع نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی زندگی قرآنی منشا کے مطابق تشکیل نہیں پا سکتی پس ضرورت ہے کہ "ذہنی آزادی" پہلے حاصل کی جائے تاکہ خارجی آزادی حاصل ہو اور جب یہ بات حاصل ہوگی تو نقر قرآنی سے انسان ہم کنار ہو کر دنیا کی حکمرانی اور خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے گا جو لوگ سیاسی آزادی کا خواب دیکھ رہے ہیں ان کو پہلے ایمانیات اور عملیات دونوں میں قرآنی ہدایات کا پابند ہو جانا چاہیے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اللہ تم میں سے ایمان اور نیک اعمال سے آراستہ ہونے والوں سے وعدہ فرماتا ہے کہ وہ تمہیں زمین کی خلافت عطا

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔

فرمائے گا جس طرح تم سے پہلے لوگوں کو "خلیفۃ الارض" بنایا تھا تاکہ ان کے لئے ان کے پسندیدہ دین پر پورا پورا قابو ہو جائے اور اللہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

نقر قرآنی کی حقیقت کی تشریح کر چکنے کے بعد قرآن اور اس کے پیغام کی ایک دل آویز تفسیر کی جاتی ہے،

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ — دست گیر بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا
از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن — کس نہ داند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ — آدمی درندہ بے دندان و چنگ
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاع بندہ و ملک خداست
بندۂ مومن امین حق مالک است — غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں — قریہ ہا از دخل شاں خوار و زبوں
آب و نانِ ماست از یک مائدہ — دودۂ آدم کنفس واحدہ

ان اشعار میں حقائق و معارف کے دریا بہا دیئے ہیں ضروری ہے کہ مختصر سی شرح کر دی جائے قرآن کیا ہے؟ تمام جابرانہ قوتوں، غیر فطری بندشوں اور ظالمانہ سرمایہ دار طبقوں کو موت کا پیغام ہے اور کمزوروں، مزدوروں، مفلسوں اور تمام غریبوں کے لئے دست گیری کرنے والا ہے اور قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ بھلائی اور نیکی اپنی محبوب چیزیں خرچ کرنے ہی میں مضمر ہے، ربا اور سود خواری سے سوائے فتنوں کے اور کیا ہو سکتا ہے اسی واسطے کہ اس

بدترین ذریعہ سے گو شخصی طور پر ثروت کے آثار ہوتے ہیں مگر اجتماعی طور پر برابر فقر و مسکنت چھائی ہوئی رہتی ہے، برخلاف اس کے جس قوم میں اسلامی طرز پر "اقتصادی نظام" کی زندگی ہوگی اور انسانوں کو فرصت پر قرضۂ حسنہ ملتا رہے گا۔ وہاں حقیقی طور پر لذت حاصل ہوگی اور طبقاتی کش مکش کا خاتمہ ہو جائے گا اور سود خوار انسانوں کی حالت ایک درندہ کی سی ہو جاتی ہے کہ اپنے قرضداروں کو ہر طرح پھاڑ کھانے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس کرختگی اور شدت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی افتاد طبیعت بالکل درشت ہو جاتی ہے اور اس میں سے روحانی نور رخصت ہو کر اس کی جان تیرہ و تاریک بن جاتی ہے یہاں تک تو "سرمایہ دارانہ نظام" پر تنقید فرمائی گئی، اب آگے ذرا "اسلامی نظام" کی چند خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے پہلے بھی گذر چکا ہے کہ قرآن عزیز نے زمین کو انسان کے لئے "متاعا لکم" فرمادیا ہے اور یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کہ زمین کا مالک حقیقی زمیندار ہی ہے اس کو ہر طرح کسان پر جبر و زبردستی کا حق ہوتا ہے۔ پھر اس کے مقابلہ میں اشتراکی نظریہ کہ سب کچھ زمین کی ملکیت کا اختیار مساوی طور پر انسان کو حاصل ہونا چاہئے، غرض ان دونوں متضاد نظریوں کے درمیان اسلام نے ایک اعتدالی صورت پیدا کر دی اور فیصلہ کر دیا کہ زمین، سرمایہ اور کائنات کی ہر چیز اور خود انسان بھی اپنی ذات کا آپ مالک نہیں بلکہ تمام اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں البتہ مالک حقیقی نے انسان کو اپنی مہربانی سے تصرف کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت دی ہے پھر اس کے بعد ملوکیت کے پردے چاک کر دیئے جاتے ہیں کہ ملوکیت کیا ہے اس کی شوکت و حکومت سے حق کا پرچم سرنگوں ہونے لگتا ہے، تمام انسانی آبادیاں برباد ہو جاتی ہیں اور ایک "جادوگری" ہوتی ہے جس سے اقوام غالب کمزوروں کو فنا کر دیتی ہے قرآن عزیز نے خاص طور پر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا — بے شک ملوک "جب کسی آبادی میں داخل ہو جاتے ہیں
وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ — تو اس کو بگاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے عزت مندوں کو

ذلیل کرتے ہیں اور ایسا ہی کرتے رہتے ہیں۔

پھر انسانی مساوات کی حقیقت اس طرح سمجھائی جاتی ہے کہ تمام انسان جب زمین ہی سے پیدا ہوئے ہیں اور اس کی غذائیں کھاتے ہیں تو گویا نفس واحد کی طرح ہیں ان میں افتراق اور پراگندگی پیدا کرنا مناسب نہیں چاہئے کہ تمام انسان ایک ہی خدائے واحد کے پرستار ہو کر وطن، نسل، رنگ و بو کے تمام بتوں کو توڑ ڈالیں ۔ زندگی اسی میں مضمر ہے

ذرا اور سنئے قرآنی پیغام کیا ہے؟ اور اس نے دنیائے انسانی میں اپنے انقلابی پروگرام کے ذریعہ کیا تحریک اٹھائی ہے۔

نقش قرآن تا دریں عالم نشست نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

یعنی جب قرآنی علوم اور ان کے عملی نتائج کا دنیا نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا اور صفحۂ ہستی پر قرآن کے نقش و نگار ابھرنے لگے تو عالم پاپائیت کا افسوں باطل ہو گیا اس قرآنی انقلاب کو دیکھ کر صاف کہہ دینا پڑتا ہے کہ اس کے باعث دنیا کی کایا پلٹ گئی اور زیادہ کیا بتایا جائے اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن عزیز ایک زندہ پائندہ اور ناطق کتاب ہے اور حق تعالیٰ کی طرح "پیدا" اور "پنہاں" ہے مشرق و مغرب کی تقدیریں اس میں پوشیدہ ہیں کاش اس کا خیال پیدا ہو جائے دور حاضر کے مسلمان کو پیغام یہ ہے کہ وہ اب میدان عمل میں سرگرم کار ہو جائے سر کو ہتھیلی پر رکھکر دنیا کی "بساط سیاست" پر نمودار ہو جائے اور قرآن عزیز کا اجتماعی پروگرام دنیا کے آگے رکھدے اور قرآنی تعلیم "یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو" (کیا خرچ کیا جائے، لوگ دریافت کرتے ہیں صاف کہہ دو کہ حاجت سے زیادہ جو ہو خرچ کر دو) کو دنیا کے گوش ہوش تک پہنچا دیا جائے۔ پھر مسلمان کا اصلی کام یاد دلاتے ہیں۔

آفریدی شرع و آئین دگر اندکے با نور قرآنش نگر

از بم و زیر حیات آگہ شوی ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی

تم نے ایک نئی شریعت نیا آئین اگرچہ گھڑ لیا ہے مگر ذرا قرآنی نور بصیرت کی روشنی میں اس پر تنقیدی نظر ڈالو تو تم کو معلوم ہوگا کہ تم زندگی کے زیر و بم سے واقف ہو چکے ہو اور تقدیر حیات تم پر ظاہر ہو گئی ہے اس کے بعد مسلمانوں کے موجودہ ماحول پر کس قدر عمدہ بات کہی ہے۔

محفل ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآن را نوا ہا باقی است

ہم مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نہ تو وہ شراب قرآنی ہے اور نہ کوئی ایسا ساقی ہے جس سے ہم کو قرآنی شراب ملتی ہے اگرچہ قرآنی علوم کی تدوین و ترتیب اس کی تفسیر و تشریح میں مسلمانوں نے کافی کاوشیں اٹھائی ہیں تاہم ابھی تک اس کے بے شمار گوشے باقی ہیں اور جوں جوں انسانی فہم و عقل ترقی کرتے جائیں گے اور عقل انسانی کے حجابات اٹھتے جائیں گے۔ قرآنی نغمے انسان کو مسرور کرتے جائیں گے ایک حدیث نبوی میں وارد ہے کہ "قرآنی عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں" سچ ہے اللہ تعالیٰ نے بھی صاف فرما دیا ہے۔ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (کہف)

اس کے بعد بتاتے ہیں کہ قرآن (ذکر حق) کے لئے کسی قوم کی کسی زمانہ اور کسی جگہ کی کوئی احتیاج نہیں ہے اگر اس کو ایک قوم چھوڑ دے گی تو دوسری قوم کے حوالے کر دیا جائے گا اب مسلمانوں کی قرآن سے بے پروائی اور اس کے بجائے تقلید و ظن کی پیروی سے میری روح لرزتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ مسلمانوں کو پوری طرح محروم کر کے دوسری کسی قوم کو یہ دولت گراں مایہ سونپ دی جائے۔

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند آتش خود بر دل دیگر زنند!

اس کے بعد "پیر رومی" اپنے زندہ رود کو شعر سنانے کی فرمائش کرتے ہیں، اور سید افغانی کی طرف

دیکھ کر بعض حقائق وا شگاف کئے جاتے ہیں جس کے اندر خاص طور پر یہ بات بتائی گئی ہے۔

در گذر مثل کلیم از رود نیل سوئے آتش گام زن مثل خلیل

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست ملتے را می برد تا کوئے دوست

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح "رود نیل" سے گذر جانا چاہیئے یعنی جب فرعون اور فرعونیوں نے حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کیا تو حضرت موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی سمندر پر ماری جس سے سمندر میں ایک صاف راستہ نکل آیا اور پھر فرعون اپنے لشکر سمیت ڈوب گیا یہ واقعہ قرآن عزیز نے متعدد مقامات پر مختلف بلاغت پرور اسالیب سے پیش فرمایا ہے۔

یہاں مقصود یہ ہے کہ آج بھی ضرورت ہے کہ "ضرب کلیم" کے ذریعہ باطل کے" رود نیل" کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور اس میں سے خیر و خوبی کے ساتھ سلامتی سے پار ہو جائیں اور آنے والے فرعونیانِ وقت کو ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا جائے چنانچہ ہم آج اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ جن کی ضرب میں کلیمی قوت ہے وہ وقت کی تمام فرعونی طاقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور ہر اس تحریک سے نہایت دانائی سے نکل جاتے ہیں جو اسلام و فطرت کے خلاف ہوتی ہے اور جن میں "موسوی" صداقت نہیں ہوتی وہ باطل کے "رود نیل" میں نذر موج ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں بھی اس قرآنی داستانِ عبرت کی طرف نہایت بلیغ کنایہ کیا گیا ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم، وطن، اور برادری کے تمام غیر فطری نظریات کا انکار کر دیا تو ان کے سامنے دو چیزیں پیش کی گئیں یا تو اپنی فطری وجدان کی صدائے حق سے دست بردار ہو جائیں، توحید کے وعظ چھوڑ دیں اور غیر اللہ کی پرستش قبول کریں یا "آگ میں جلنا" اور مصائب و تکالیف کا جھیلنا گوارا کریں حضرت ابراہیم نے اپنی خدا داد فہم و بصیرت اور نور نبوت کے مطابق "آتش نمرود" کو پسند فرمایا اور بے خطر آگ میں کود جانا گوارا فرمایا اسی طرح آج بھی دو راہیں دنیائے انسانی کے آگے آئی ہیں یا تو حق کا اعتراف و اقرار کر کے وقت کی تمام نمرودی طاقتوں کا حکم قبول کیا جائے یا انکار کر

سے ابراہیمی سنت کی پیروی کی جائے مگر جس مرد مومن میں ابراہیمی ایمان خلیلی ایقان کی روشنی ہوگی وہ حق و صداقت کی راہ میں آفات و مصائب کو برداشت کرنا آسان سمجھے گا اور انکار حق کی راہ کبھی نہ اختیار کرے گا۔ اس کے لئے "آتش نمرود" اسی طرح سرد ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم کے حق میں ہوئی تھی اور اس ابراہیمی مرد کے "نفحہ" سے "بوئے دوست" آنے لگے گی اور اس کے نتیجہ میں ایک "ملت" کی تشکیل ہوگی جس کو وہ کوچۂ دوست کی طرف لے جائے گا یعنی ابراہیمیت اختیار کرنے کے بعد تمام نمرودی طاقتیں سرنگوں ہو جائیں گی اور اس کو مقام "خلت" اور "امامت کبریٰ" کا جلیل القدر منصب اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوگا گو عارضی طور پر اس کو ابراہیمی ابتلا کے ماحول سے گذرنا پڑے گا ۔ اس کے بعد زندہ رود غزل سنانے لگتا ہے جس میں لطیف پیرایہ کے ساتھ موجودہ دور کے مدعیان دین حنیف کی شکوہ سنجی اور نالائقی پر ماتم کیا جاتا ہے ایک شعر سن لیجئے ۔

چہ حرمہا کہ درونِ حرمے ساختہ اند
اہل توحید یک اندیش و دو دو نیم اند ہمہ

اس کے بعد فلک عطارد ختم ہوتا ہے اور فلک زہرہ میں پہنچتے ہیں ،

(باقی)

اقبالؒ اور ہندوستان

(از جناب لطیف احمد صاحب شیروانی)

ہر چند کہ اقبال جیسی عالمگیر شخصیت کو وطن کی چار دیواری میں محدود کرنا اور اس کے وسیع خیالات کو وطن پرستی کی زنجیروں میں جکڑنا ایک سعی لاحاصل سی معلوم ہوتی ہے تاہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اقبالؒ سرزمینِ ہند میں ہی پیدا ہوا، اسی ملک میں تربیت پائی اور عمر کا بیشتر حصہ نہ صرف یہیں بسر کیا بلکہ ملک کی سیاست میں بھی بسا اوقات پیش پیش رہے۔ لہذا فطری طور پر اس ملک کی فضا اور پیچ در پیچ مسائل نے اقبال کی شاعری پر ضرور بالضرور اثر چھوڑا ہوگا۔ سطور ذیل میں اقبال مرحوم کو ایک ہندوستانی کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن شروع میں ہی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اقبال عوام الناس کے نظریہ کے مطابق وطن پرست نہ تھے کیونکہ جہاں علامہ مرحوم نے یہ فرمایا ہے کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

وہاں ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ گئے ہیں۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی   اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اور مطالعہ یورپ نے یہ امر علامہ مرحوم کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا کہ وہ نام نہاد وطن پرستی جو عوام کا مطمح نظر بنی ہوئی ہے ہمہ گیر تہذیب عالم کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ شاعر مشرق کے الفاظ میں اس قسم کی وطن پرستی آذر تہذیب کے ترشوائے ہوئے اصنام میں سب سے بڑا خدا ہے۔ اور اس کے

تباہ کن اثرات کو علامہ صاحب ذیل کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے   تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے   کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

کسی خاص ملک کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دیگر کمزور ممالک پر ہر قسم کا جور و ستم روا رکھنا اقبال کے نظریہ کے مطابق ایک ایسی غلطی ہے جس کا خمیازہ ظالم ملک کو بالآخر بھگتنا پڑتا ہے۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اللہ اللہ یہ پیش گوئی جو علامہ مرحوم نے ۱۹۰۷ء میں کی صرف سات ہی سال بعد جنگ عظیم کی صورت میں پوری ہوگئی۔ اس جنگ سے تہذیب عالم کو بالعموم اور تمدن یورپ کو بالخصوص کتنا بڑا صدمہ پہنچا روز روشن کی طرح واضح ہے طرفہ تر یہ کہ اس جنگ کے اثرات ہنوز اچھی طرح زائل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اسی سرزمین یورپ کو بیس سال بعد ہی پھر اگر اس سے بھی زیادہ تباہ کن جنگ سے دوچار ہونا پڑا جو اس قلیل عرصے میں دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچ چکی ہے۔

اقبالؒ کو اس قسم کے جذبۂ وطنیت سے سخت نفرت ہے جس کا نتیجہ ملک کے لئے تعمیر کے بجائے تخریب کی صورت میں رونما ہو۔

ہم سطور ذیل میں واقعات اور خود علامہ مرحوم کے کلام کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ مرحوم نے اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی اپنے وطن عزیز کو فراموش نہیں کیا اور یہ کہنا کہ انہیں ہندوستان سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی سراسر غلط اور بے بنیاد ہے اور کسی شخص کے اوصاف حمیدہ کو صرف اس لئے

سراہنا کہ وہ کسی خاص فرقہ، جماعت یا خطہ سے متعلق ہے انصاف کے قطعی منافی اور انتہا درجہ کی پست خیالی اور غلامانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے اقبالؒ مرحوم کے معترضین کی تردید تو سر عبدالقادر نے ہی بانگ درا کے دیباچہ میں بوجہ احسن کردی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر اقبال مرحوم یہ نہ محسوس کرتے کہ ان کی شاعری سے ان کی "درماندہ قوم" اور ان کے "بدنصیب" ملک کے امراض کا علاج ہو سکتا ہے تو شاید وہ شاعری کو بالکل ہی ترک کر دیتے۔

وہ نظمیں جو اقبال نے اوائل عمر میں لکھیں ایک نظریہ سے جان کیٹس[1] کی یاد دلاتی ہیں یعنی شاعر دنیا کی مختلف اشیا پر نظر ڈالتا ہے اور اس مطالعہ فطرت سے وہ نقوش جو اس کے دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں انہیں سیدھے، سیدھے لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔ فلسفہ کی گوناگون گہرائیوں سے ان نظموں کو دور کا بھی تعلق نہیں یہی وجہ ہے کہ ان میں اقبال کی اپنے اجڑے دیار سے محبت بہت ہی واضح الفاظ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مثلاً بانگ درا کی بسم اللہ ہی حب الوطنی کے اشعار سے ہوتی ہے:۔

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

علیٰ ہذا القیاس ترانۂ ہندی کی ابتدا ملاحظہ ہو:۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

---

[1] انگریزی زبان کا مشہور شاعر۔

شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے جذبۂ وطنیت کو اُن سے زیادہ شاندار اور پُرخلوص الفاظ میں پیش کیا ہو:۔

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا　　سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا　　ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے ۔ میرا وطن وہی ہے

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند　　سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر　　رفعت میں آسمان سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت　　مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند

سبحان اللہ! کاش اقبال کی حب الوطنی پر انگشت نمائی کرنے والے تعصب کا چشمہ اتار کر مندرجہ بالا اشعار کو پڑھیں۔

بعد ازاں جب اقبال مرحوم نے ہندوستان کی طرف بہ نظر فکر و تدبر دیکھا تو یہی خیالات الفاظ ذیل میں ہمارے سامنے آئے ہیں:۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو　　کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

آہستہ آہستہ اقبال کے اشعار پر فلسفہ کا رنگ غالب آتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس

کرنا شروع کیا کہ وہ محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مصلح و ریفارمر بھی ہے اور یہ وہی نظریہ ہے جو ورڈزورتھ[۱] اور شیلے[۱] کے پیش نظر تھا۔ ورڈزورتھ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ دنیا اس کی طرف اس طرح دیکھے گویا کہ وہ کوئی استاد ہے شیلے نے اگرچہ یہ لکھا ہے کہ اس کو ناصحانہ شاعری سے نفرت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ دنیا کی حالت کو سدھارنے کا سب سے بڑا مدعی بھی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی اوائل عمر کے علاوہ باقی قریباً تمام نظمیں ناصحانہ اور اصلاحی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اقبال مرحوم کا سب سے موثر اور مشہور پیغام خودی کا ہے اور اس ضمن میں نقاد حضرات نے اس چیز پر بار بار زور دیا ہے کہ اس تخیل کے لئے علامہ مرحوم نطشے[۲] اور گوئٹے کے مرہون منت ہیں۔ ہمیں اس نظریے سے کلی طور پر اختلاف نہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یورپ کے وسیع فلسفہ سے اقبال مرحوم کو یہی پہلو کیوں اس قدر پسند آیا کہ وہ تمام عمر اسی کا راگ الاپتا رہا۔ ہماری رائے میں اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اقبال نے اپنے ملک کی ابتر حالت دیکھ کر اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی اور وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہم اپنی خودی کو بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہندوستان کی ہر چیز سے نفرت ہے اور یورپ کی ہر چیز سے محبت :۔

علم غیر آموختی اندوختی روئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش می بری من ندانم تو توئی یا دیگری
عقل تو زنجیری افکار غیر در گلوئے تو نفس از تار غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار در دل تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ سرو ہایت را قبا ہا خواستہ

---

[۱] مشہور انگریزی شاعر۔ [۲] مشہور جرمن فلاسفر۔

بادہ می گیری بہ جام از دیگران   جام ہم گیری مدام از دیگران

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جہاں ایک طرف اقبال نے اپنے تخیلات کا بیش قیمت حصہ یورپ سے راصل کیا وہاں دوسری طرف وہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کو صاف صاف بتلاتے ہیں کہ وہ یورپ کے اصول کو اپنے لئے باعث افتخار نہ سمجھیں اور ولائتی سونے کو ہندوستانی کسوٹی پر نہ پرکھیں نئی روشنی کے نوجوانوں کو اقبال کا یہ نظریہ خاص طور پر دعوت فکر دیتا ہے۔ ہم میں سے بعض منطقی دماغ یہ فلسفہ چھانٹتے ہیں کہ ہمیں کم ازکم یورپ سے اچھی چیزیں حاصل کر لینی چاہئیں اور بُری چیزوں کو چھوڑ دینا چاہئے۔ منطق اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے لیکن عملی زندگی میں دقت یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب انسان بہت سی اچھی بُری چیزوں میں سے صرف اچھی چیزیں نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو ان اچھی چیزوں کے ساتھ چند ایک بُری چیزیں بھی خود بخود ضرور چلی آتی ہیں۔ مثلاً ہم یورپ سے اشتراکیت لیتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ الحاد اور بلادینی کا آنا بھی یقینی ہے اور اقبال کے زاویۂ نگاہ سے تو یورپ میں سرے سے کوئی اچھی چیز ہے ہی نہیں:۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے   کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

بال جبریل میں وہ مغربی تہذیب کی کم مائگی اور اس میں صحیح الخیالی کے فقدان کا بھانڈا ان الفاظ میں پھوڑتے ہیں۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے   حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں   گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے   سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت   پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس   کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اسی طرح شاعر مشرق ضرب کلیم میں "ابی سینیا" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:۔

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال — غارتگری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ — روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش
پیرِ کلیسا یہ حقیقت ہے دل خراش

"مغربی تہذیب" کے زیرِ عنوان شاعرِ مشرق فرماتے ہیں:-

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

پیام مشرق میں بھی یورپی تہذیب کا خاکہ قریب قریب ان ہی الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

یاد ایامے کہ بودم در خمستان فرنگ — جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
چشم مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار — بادہ خواران را نگاہِ ساقی اش پیغمبر است
جلوہ او بے کلیم و شعلہ او بے خلیل — عقل ناپروا متاع عشق را غارتگر است
در ہوائش گرمی یک آہ بیتابانہ نیست — رمز ایں میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست

(میخانہ فرنگ)

دوش رفتم بہ تماشائے خرابات فرنگ — شوخ گفتار رندے[۱] دلم از دست ربود
گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی در وے — صحبت دخترک زہرہ وش و نائے و سرود
ایں خرابات فرنگ است و ز تاثیر مئش — آنچہ مذموم شمارند نماید محمود

(خرابات فرنگ)

اقبال مرحوم کے لئے ہندوستان میں سب سے زیادہ افسوسناک امر اس ملک کی محکومی تھی ۔ اد

---

[۱] پوپ کی طرف اشارہ ہے [۲] نطشے کی طرف اشارہ ہے

کے عقیدہ کے مطابق آزادی ہر فرد اور ہر ملک کا پیدائشی حق ہے۔ جہاں علامہ مرحوم کو اپنے مقصد کی رفعت کا احساس ہے وہاں انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ایسے غلام ملک کا فرد ہے جہاں غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے کسی قسم کی کوشش نہیں کی جاتی۔

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں ـــــ مرغان سحر خواں میری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے ـــــ جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

علمی، اقتصادی اور سیاسی رہنما موجود ہیں لیکن چونکہ خود ان کی ذہنیت غلامانہ ہے لہٰذا وہ عوام کو بھی یہی سبق دیتے ہیں۔

شاعر بھی ہیں پیدا، علما بھی، حکما بھی ـــــ خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک ـــــ ہر اک ہے گو شرح معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو ـــــ باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند ـــــ تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

محکومی اقبال کے نزدیک ایک اس قسم کی برائی ہے جس سے لازمی طور پر ہمہ قسم کی دوسری برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی ـــــ جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر ـــــ کہ دنیا میں فقط مردان حُر کی آنکھ ہے بینا

در غلامی تن ز جاں گردد تہی ـــــ از تنِ بے جاں چہ امید بہی
ذوق ایجاد و نمود از دل رود ـــــ آدمی از خویشتن غافل رود

محکومی کے بُرے اثرات کو اقبال نے مزید وضاحت سے بیان کیا ہے "پنجاب کے پیرزادوں سے" کے زیر عنوان شیخ مجددؒ کی لحد پر علامہ مرحوم فرماتے ہیں۔

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو آنکھیں مری بینا ہیں لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلہ فقر ہوا بند ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں پیدا کلہ فقر سے ہو طرہ دستار
باقی کلہ فقر سے تھا ولولہ حق طروں نے چڑھایا نشہ خدمت سرکار

یہ صرف غلامی ہی کی لعنت ہے کہ صحیح معنوں میں علم ہندوستان میں نایاب ہے۔ علامہ مرحوم نے ان خیالات کو ایک نہایت اچھوتے پیرائے میں اپنی مشہور نظم پیر و مرید میں پیش کیا ہے۔ اپنے وسیع مطالعہ کے باوجود مرید ہندی کو اقبال کرنا پڑتا ہے کہ

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

اور پھر ذیل کی قسم کے استفسارات اپنے پیر سے کرنے پر مجبور ہے :-

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد کھول مجھ پر نکتہ حکم جہاد
سرِ آدم سے مجھے آگاہ کر خاک کے ذرے کو مہر و ماہ کر
گرچہ بے رونق ہے بازار وجود کون سے سودے میں ہے مردوں کا سود
کس طرح قابو میں آئے آب و گل کس طرح پیدا ہو سینے میں دل
علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

مرید ہندی کو آخر کار یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز اہل دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

حضرت علامہ اقبال مرحوم تو سرے سے اس امکان ہی سے منحرف ہیں کہ محکومی انسان کو قابل قبول بھی ہو سکتی ہے جبکہ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے :-

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تراست   من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

خوشحالی کا انحصار بھی آزادی پر ہی ہے۔ ہر وہ ملک اور قوم جو غلامی کی زنجیروں میں پابستہ ہے۔ علمی، اقتصادی سیاسی غرضیکہ ہر دنیوی پہلو سے ترقی کے میدان میں آزاد قوموں سے پیچھے رہنے پر مجبور ہے۔

آزادی کی اک آن ہے محکوم کا اک سال   کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت   محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور   محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامت کا ہے سودا   ہے بندہ آزاد خود اک زندہ کرامات

ہو بندہ آزاد اگر صاحب الہام   ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے   غارتگر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

مادر وطن کی اس زار وزبوں و درماندہ حالت پر شاعر مشرق بار بار آنسو بہاتا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں ارشاد ہوتا ہے

باز گو از ہند و از ہندوستان   آنکہ با کاہش نیرزد بوستان
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد   آنکہ اندر دیراو آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم   آنکہ یادش را بہ جان پروردہ ایم
از غم ما کن غم او را قیاس   آہ ازاں معشوق عاشق ناشناس

اس درماندگی کا علاج قوت حاصل کرکے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے میں ہی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ ہر ہندوستانی کو چاہیئے کہ باہمی تفرقات کو دور کرکے ایک منظم اور مضبوط قوم بنائے۔ ورنہ طوقِ غلامی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی گردن میں پڑا رہے گا:۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے کہ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مشہور و معروف مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق میں "اشکے چند بر افتراق ہندیاں" کے زیر عنوان مرحوم لکھتے ہیں:-

اے ہمالہ! اے اٹک! اے رود گنگ زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ

پیر مرداں از فراست بے نصیب نوجواناں از محبت بے نصیب

شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر خشت ما سرمایہ تعمیر غیر

زندگانی بر مرادِ دیگراں جاوداں مرگ است نے خواب گراں

ہندیاں با یک دگر آویختند فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

تا فرنگی قومے از مغرب زمین ثالث آمد در نزاع کفر و دین

کس نداند جلوہ آب از سراب

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب

یہ اشعار خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہیں کہ یہ حضرت علامہ نے اپنے وصال سے صرف چار سال پیشتر کہے اور اس طرح یہ اشعار اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ مرحوم نے اپنی زندگی آخری دور میں بھی جبکہ ان کی شاعری پر اُن کے مذہب کا رنگ غالب تھا اپنے ملک کو فراموش ں کیا۔

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست — قوتش از سختیٔ اعصاب نیست
عشق با نانِ جویں خیبر کشاد — عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد!
کلۂ نمرود بے ضربے شکست — لشکرِ فرعون بے حربے شکست!
عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر — ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است — کار او از دین و دانش برتر است
عشق سلطان است و برہانِ مبیں — ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں
لازمان و دوش و فردائے ازو — لامکان و زیر و بالائے ازو
چوں خودی را از خدا طالب شود — جملہ عالم مرکبِ او راکب شود
آشکارا تر مقامِ دل ازو — جذبِ ایں دیرِ کہن باطل ازو
عاشقاں خود را بیزداں می دہند — عقلِ تاویلی بقرباں می دہند

عاشقی؟ از سُو بہ بے سوئی خرام
مرگ را بر خویشتن گرداں حرام

(جاوید نامۂ اقبال)

خیز چو سروِ بلند، اے بعمل نرم گام

زندگی سوز و ساز، بہ ز سکونِ دوام — فاختہ شاہیں شود، از تپشِ زیرِ دام

ہیچ نیاید ز تو غیرِ سجودِ نیاز — خیز چو سروِ بلند، اے بعمل نرم گام

کوثر و تسنیم برد، از تو نشاطِ عمل — گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام

زشت و نکو زادۂ وہمِ خداوندِ تست — لذتِ کردار گیر، گام بنہ جوئے کام

خیز کہ بنمائمت مملکتِ تازۂ — چشمِ جہاں بیں کشا، بہرِ تماشا خرام

قطرۂ بے مایۂ، گوہرِ تابندہ شو — از سرِ گردوں بیفت، گیر بدریا مقام

تیغ درخشندۂ، جانِ جہانے گسل — جوہرِ خود را نما، آئے برون از نیام

بازوئے شاہیں کشا، خونِ تدرواں بریز — مرگ بود باز را، زیستن اندر کنام

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

("پیام مشرق" اقبال)

حکمتِ قرآنی اور اصلاحِ تمدن

ایک صاحب سوال کرتے ہیں :۔

"سورۂ آل عمران میں تیرہویں رکوع سے اٹھارویں رکوع تک جنگ احد پر مسلسل تبصرہ کیا گیا ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ تیرہویں رکوع میں جنگ احد پر تمہیدی تقریر ابھی شروع ہی کی تھی کہ یکایک بیچ میں سود کی حرمت کا ذکر آ گیا چنانچہ چودہویں رکوع کا بیشتر حصہ اسی مضمون پر مشتمل ہے اور اس کے بعد آیت وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ سے پھر جنگ احد پر کلام شروع کیا گیا ہے۔ اس موقع پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کا اپنے ماقبل اور مابعد سے کیا ربط ہے؟ ایک جنگ کے واقعات پر کلام کرتے ہوئے بیچ میں یہ بحث آخر کس تعلق سے چھیڑ دی گئی؟

(۲) اس موقع پر خاص طور سے سود در سود یا بڑھا چڑھا کر سود لینے کو منع و تحریم کے لیے کیوں مخصوص کیا گیا؟

جو لوگ قرآن مجید کی تعلیمات کو مدبرانہ اور محققانہ انداز میں سمجھنے کا شوق رکھتے ہوں ان کیلیے من جملہ دوسرے امور کے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کے تاریخی پس منظر HISTORICAL BACK GROUND) کو سامنے رکھیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ آیات کا باہمی ربط سمجھنا ان کے لیے آسان ہوگا، بلکہ وہ اس حکمت تشریع کو بھی سمجھ سکیں گے جسے احکام کے تدریجی ارتقا میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جہاں تک اسلام کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے، قرآن مجید نے ابتدا ہی میں ان کا صاف صاف بے کم و کاست اعلان کر دیا تھا، اور آخر وقت تک ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا۔ یہ کہ مخلوقات کا اِ بجز اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کے اور کوئی نہیں، یہ کہ عبادت اور استعانت اس ایک آلہ کے سوا کسی کے لیا نہیں، یہ کہ ہر ہر انسان اسی ایک حاکم اعلیٰ کے سامنے جواب دہ ہے اور بالآخر اپنے پورے کارنامۂ حیات کے ساتھ اس کی عدالت میں پیش ہونے والا ہے، یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام نوع انسانی کی طرف اللہ کے رسول ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے اور صراط مستقیم بجز "اسلام" کے اور کوئی نہیں، یہ تمام باتیں دعوتِ محمدی صلعم کی ابتدا میں جس طرح کہی گئی تھیں اسی طرح آخر وقت تک کہی جاتی رہیں۔ ان میں کوئی ارتقا نہیں۔ جو دعویٰ اوّل دن کیا گیا تھا وہی آخر تک قائم رہا۔ فرق جو کچھ ہوا وہ صرف اتنا تھا کہ کبھی آ تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا اور کبھی اختصار کے ساتھ۔

بخلاف اس کے تمدنی اصلاح (SOCIAL REFORM) کے باب میں قرآن نے تدریج کو ملحوظ رکھا ہے۔ ابتدا میں تمام تر زور ایمان کو مستحکم کرنے پر صرف کیا گیا، اور اس کے ساتھ مدنیت صالحہ کے وہ اصول ذہن نشین کرائے جاتے رہے جن پر آگے چل کر نئی تہذیب کی عمارت تیار کرنی تھی۔ مکہ معظمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن تمام تر انہی دو باتوں تک محدود تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں جب عملاً نئی تہذیب کی تعمیر شروع کی گئی، اور وقت آیا کہ مدنیت صالحہ کے ان مجرد اصولوں (ABSTRACT PRINCIPLES) کو جنھیں مکہ میں پیش کیا گیا تھا متعین صورت (CONCRETE FORM) میں اجتماعی زندگی کے اندر نافذ کیا جائے، تو اس کام میں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیا گیا کہ پورے اصلاحی پروگرام کو یک لخت عملی جامہ پہنا دیا جاتا، بلکہ تدریجی عمل کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ نئی سوسائٹی جیسے جیسے بنتی گئی، جیسے جیسے مواقع پیش آتے گئے ان کے لیے قانون بنایا جاتا رہا۔ ہر نئے اصلاحی قدم کے لیے آمادگی نفس کے موقع (PSYCHOLOGICAL MOMENT) کا انتظار کیا جاتا، اور جب وہ موقع آتا تو ایسے مؤثر انداز میں حکم سنایا جاتا کہ سیدھا

دلوں کی تہوں میں اتر جاتا اور وہاں سے کامل اطاعت بن کر عملی دنیا میں نمودار ہوتا۔

تمدن کی اصلاح کے لیے قرآن کے پیش نظر جو پروگرام تھا اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ معاشی معاملات میں سے سود کے عنصر کو بالکلیہ خارج کر دیا جائے، اور اس کی جگہ انسان اور انسان کے معاشی تعلقات کو فیض، فراخدلی اور امداد باہمی کی روح پر قائم کیا جائے۔ اس دفعہ کو نافذ کرنے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ مکہ معظمہ میں سود کی حرمت کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا، بلکہ محض اس نئے معاشی نظریہ کو پیش کرنے اور دماغوں میں اتارنے کی کوشش کی گئی کہ انفرادی سرمایہ داری (INDIVIDUALISTIC CAPTALISM) اگر خود غرضی اور تنگ نظری پر مبنی ہو — جو سود خواری کی اصلی بنیاد ہے — تو اس کا نتیجہ اجتماعی نقصان ہے، اور جو فرد یہ جماعت دشمنی کا (ANTI SOCIAL) شیوہ اختیار کرتا ہے وہ اگرچہ بظاہر پھلتا پھولتا نظر آتا ہے، مگر آخر کار دنیا اور آخرت دونوں میں اپنی بربادی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر اسی انفرادی سرمایہ داری کی بنیاد جماعتی حقوق کے صحیح احساس پر مبنی ہو تو اس سے بظاہر فرد کی دولت گھٹتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ بڑھتی ہے، کیونکہ جو فرد اجتماعی خوشحالی میں مددگار رہتا ہے وہ نتیجۃً دنیا میں بھی اپنی دولت بڑھاتا ہے اور آخرت میں بھی۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ	کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے فراخی کیسا تھ
الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّ	رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔ یقیناً
فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔	اس میں ایمان لانے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں
فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ	لہذا تو اپنے رشتہ دار کو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق
وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ	دے۔ یہ فعل ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی خوشنودی
یُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ	چاہتے ہیں اور بالآخر وہی فلاح پانے والے ہیں
الْمُفْلِحُوْنَ۔ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا	اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ بعض لوگوں کے مال میں

فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (الروم۔۴) — بڑھوتری ہو تو اللہ کے نزدیک تو اس سے مال نہیں بڑھتا البتہ مال ان کا بڑھتا ہے جو خدا کی خوشنودی کے لیے زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مکہ معظمہ کی زندگی میں اُس نئی معاشی پالیسی کے لیے جسے آگے چل کر نافذ کرنا تھا، دوسرے پہلوؤں سے بھی زمین تیار کی جاتی رہی۔ انسان کی حقیقی ضروریات سے جو دولت بچ جائے اسے جمع کرنے کی سخت مذمت کی گئی کیونکہ خود غرضانہ سرمایہ داری کی ابتدا اسی مقام سے ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک طرف تجارتی کاروبار کی ہمت افزائی کی گئی اور دوسری طرف بار بار یہ امر ذہن نشین کیا گیا کہ جو کچھ تم کماؤ اس میں تمہاری جماعت کے کم نصیب افراد کا حق ہے۔ وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔

اتنا کام مکہ معظمہ میں کیا جا چکا تھا۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ پہنچ کر جب نئی اجتماعی زندگی کی بنا رکھی گئی تو اس معاشی پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کیا جانے لگا۔ ہجرت کے تیسرے سال جب جنگ احد واقع ہوئی تو وہ موقع آگیا۔ جنگِ احد میں مسلمانوں کی شکست کا اصل سبب مال کا لالچ تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور اپنی ڈیوٹی سے ہٹ کر جماعت کے وجود کو خطرے میں ڈالا جیسا کہ تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں، غزوۂ احد میں آنحضرت صلعم نے تین ہزار مشرکین کے بالمقابل اپنی سات سو کی مختصر جمعیت کو بہترین جنگی موقف (STRATEGICAL POSITION) پر رکھا تھا، یعنی احد کی پہاڑی آپ کی پشت پر تھی اور دشمن کے لیے گھیرا ڈالنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ احد کی جانب سے مشرکین کے لیے عقبی حملہ کرنے کا صرف ایک راستہ تھا جس پر حضور نے عبداللہ بن جبیر کے تحت ۵۰ تیر اندازوں کا ایک مضبوط دستہ متعین کر دیا تھا تاکہ اگر دشمن اس طرف سے حملہ کرنا چاہے تو یہ دستہ دوہی

سے اس کو تیروں پر رکھے۔ اس جنگی نقشہ کی کامیابی کا تمام تر دارومدار اس امر پر تھا کہ تیر اندازوں کا یہ
اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ چنانچہ حضور نے ان کو سخت تاکیدی حکم دیا کہ اگر ہمیں شکست ہو اور تم دیکھو کہ شکار
پرندے ہمیں اچک لیے جا رہے ہیں تب بھی ہماری مدد کو نہ آنا، اور اگر ہم فتحیاب ہوں اور تم دیکھو کہ د
کی دولت لٹ رہی ہے تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔" لیکن جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور بہادرانِ اسل
نے مار مار کر مشرکین کے منہ پھیر دیے اور شکست خوردہ دشمن کے لشکر میں لوٹ شروع ہوئی تو تیر انداز
کی یہ جماعت اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ پچاس میں سے ۴۰ آدمی اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت پر جا
اور مشرکین کو موقع مل گیا کہ پشت کے درے کی طرف سے حملہ کر کے مسلمانوں کو گھیر لیں۔ اسی غلطی کا
یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فتح شکست سے بدل گئی، ان کے بہترین آدمی شہید ہوئے۔ خود آنحضرت صلی
علیہ وسلم زخمی ہو گئے، اور ایسا سخت وقت آ گیا کہ اگر مشرکین کی عقل نہ ماری گئی ہوتی اور وہ بلا کسی
وجہ کے خود بخود پسپا نہ ہو گئے ہوتے تو مدینہ کی بھی خیر نہ تھی۔

یہ تھا وہ نفسیاتی موقع جس کو معاشی اصلاح کا پہلا قدم اٹھانے کے لیے چن لیا گیا۔ احد سے
مدینہ پہنچتے ہی سورۂ آلِ عمران کی وہ آیات نازل ہوئیں جن کا ذکر سائل نے اپنے سوال میں کیا۔
ان آیات میں غزوۂ احد پر تبصرہ کرتے ہوئے شکست کا اصلی سبب جو مشخص کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ
سے بہت سے لوگ مال کی محبت میں مبتلا ہیں اور یہ زر پرستی تمھیں نافرمانی پر آمادہ کر دیتی۔
نیز یہ کہ تم میں صبر و تقویٰ کی جگہ وھن اور فشل (ضعف) پایا جاتا ہے جو نتیجہ ہے حبِ دنیا کا:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ	اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تھا
تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ	اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمھیں فتح ہو
وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ	جنگ کے ابتدائی حصہ میں تم ہی ان کو مار رہے تھے
مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ	اللہ نے تمھیں وہ چیز دکھائی جو تمھیں محبوب ہے یعنی

مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ۔

اور اسے دیکھ کر تم میں کمزوری آگئی اور تم نے (اپنے امیر عبداللہ بن جبیر سے) حکم میں جھگڑا کیا اور (رسول کی نافرمانی کی (تو وہ وعدہ ختم ہوگیا) تم میں سے بعض دنیا چاہتے ہیں اور بعض آخرت۔ پس اللہ نے تم کو کفار کے مقابلہ سے پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔

جب شکست کا اصل سبب یہ تشخیص ہوا تو اس کا علاج بھی یہی تجویز ہونا چاہیے تھا کہ دلوں میں مال کی محبت کا سرچشمہ جس جگہ واقع ہے اس پر حملہ کیا جائے، چنانچہ ٹھیک اسی مقام پر انگلی رکھ دی گئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔

اے ایمان والو! بہت بڑھا چڑھا کر سود نہ کھایا کرو۔ اور اللہ سے ڈرو کہ اسی طرح توقع کی جاسکتی ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

مطلب یہ ہوا کہ یہ مال کی محبت جو تمہارے دلوں میں جائز فطری حد سے بڑھ گئی ہے اور جس کی وجہ سے تمہاری روح میں کمزوری پیدا ہوگئی ہے، اس کے بڑھنے کا سبب یہ ہے کہ تم مدتوں سے سودخواری کے خوگر ہو جس نے تمہارے قلب کے ریشہ ریشہ میں مال کی محبت پیوست کر دی ہے۔ تم جب اپنے کسی حاجت مند بھائی کو کچھ مال دیتے ہو تو ایک ایک دن گن گر اس پر اپنے فائدے کا حساب لگاتے چلے جاتے ہو۔ اس عادت اور خصلت سے بڑھ کر اور کونسی چیز عشقِ زر کی بیماری پیدا کرنے والی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کا علاج یہ ہے کہ کم از کم سود در سود اور ہر سال بڑھتا چڑھتا سود[۱] تو آج ہی سے چھوڑ دو۔

---

[۱] أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً، سود کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کو مثلاً ایک سال کے وعدے پر روپیہ قرض دیا اور اس کی ایک شرح سود مقرر ہوگئی۔ دوسرے سال کے آغاز میں اگر قرض ادا نہ ہوا تو پھر ایک سال کی مہلت دی اور شرح سود پہلے سے بڑھادی گئی۔ اس طرح ہر سال شرح سود میں اضافہ کیا جاتا رہتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ کافی مدت تک اگر سود نہ ادا ہوتا تو سود کی رقم کو اصل میں شامل کر کے اس پر پھر سود لگا دیا جاتا۔

یہ محض مشورہ نہ تھا بلکہ حکم تھا اور ایسا سخت تاکیدی حکم تھا کہ اس کے بعد ہی وہ تہدیدی فقرہ ارشاد ہوا جسے سن کر سارے مسلمان کانپ اٹھے۔ فرمایا:

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ۔ ڈرو اس آگ سے جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔

مسلمان، اور اس آگ میں ڈالا جائے جو کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہو! اس سے بڑھ کر ایک سچے مسلمان کے لیے خوفناک بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسی بنا پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ آیت قرآن کی سب سے زیادہ ڈراؤنی آیت ہے، کیونکہ اس میں مسلمان کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اس نے اللہ کی حرام کی ہوئی چیز سے پرہیز نہ کیا تو اسے وہ سزا دی جائے گی جو کافروں کے لیے مقرر کی گئی ہے۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ عشقِ مال اور بندگی زر کی جگہ مسلمان میں کیا صفات ہونی چاہئیں اور وہ تقویٰ کیا ہے جس کے متعلق ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ "اگر تم میں صبر اور تقویٰ ہو تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔"

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ اور دوڑو اپنے رب کے دامنِ رحمت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین کی وسعتوں جیسا ہے، جو متقیوں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔ (کون متقی؟) وہ جو تنگ حالی اور خوش حالی دونوں حالتوں میں (اپنے مقدور بھر راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں، جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور انسانوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی محسنوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔

أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

(اور متقی کون؟) وہ جو کبھی اگر کوئی برا کام یا اپنے نفس پر ظلم (یعنی گناہ) کرتے بھی ہیں تو فوراً انہیں خدا کا خیال آجاتا ہے جس کے اثر سے وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کا معاف کرنے والا ہو؟ (یہ متقی) اپنے فعل پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بتا دیا کہ اگر مشرکین اور کفار کے مقابلہ میں غلبہ اور فتح چاہتے ہو تو اپنے اندر سے دنیا طلبی، زر پرستی، نفسانی خواہشات کی بندگی نکال ڈالو اور ان کی جگہ یہ ایجابی (POSITIVE) خوبیاں پیدا کرو، تاکہ تمہارا اخلاقی مرتبہ ان سے بلند ہو جائے، اور تم زمین پر خدا کی نیابت کے اہل بن جاؤ۔ ورنہ اگر تم بھی اخلاقی حیثیت سے ویسے ہی رہے جیسے کفار و مشرکین ہیں، تو آخر تم سے اللہ کا کیا رشتہ ہے، اور کفار قریش سے کیا دشمنی ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں تمہاری نصرت و حمایت کرے؟

دیکھیے! یہاں قرآنی حکمت (WISDOM) اور انسانی حکمت کا فرق کیسا حیرت انگیز ہے۔ اگر کوئی انسان، جس کی نگاہ محض اسباب دنیا پر ہوتی، جنگ احد کے حالات پر نگاہ ڈالتا اور مسلمانوں کی کمزوری کے اسباب کی تشخیص کرتا، تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچتا کہ کفار کی مالی حالت بہت اچھی تھی، قریش کے علاوہ عرب کے دوسرے قبائل اور مدینہ کے یہودی سرمایہ دار ان کی پشت پر تھے، ان کے پاس دو سو سواروں کا رسالہ تھا، ان کے بیشتر آدمی زرہ پوش تھے، ان کے اسلحہ زیادہ اچھے تھے۔ برعکس اس کے مسلمان صرف پچاس سواروں کا رسالہ لاسکے تھے۔ ان کے پاس بمشکل ۱۰۰ آدمی زرہ پوش تھے۔ ان کی بے سروسامانی کا حال یہ تھا کہ اپنے مقتولوں کی تجہیز و تکفین بھی اچھی طرح نہ کر سکے تھے۔ اس وجہ سے کفار کا پلہ بھاری رہا اور مسلمانوں نے نقصان اٹھایا۔ کمزوری کا یہ سبب تشخیص کرنے کے بعد وہ اگر کوئی علاج تجویز کرتا تو یہ کرتا کہ مسلمانوں کو اپنی مالی

حالت درست کرنی چاہئے۔ جو لوگ ان میں سود نہیں کھاتے انہیں بھی سود خواری شروع کردینی چاہئے شرح سود پہلے سے زیادہ بڑھا دینی چاہئے۔ غرض ہر ممکن طریقہ سے اپنی جماعت کی دولت میں اضافہ کرنا چاہئے۔ مگر خدائی حکمت ملاحظہ ہو کہ کمزوری کا سبب مال کی کمی کو نہیں بلکہ مال کی محبت کو ٹھیرایا جاتا ہے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ اس عشق مال کی بیماری کو دور کرنے کے لئے شرح سود میں تو فوراً تخفیف کرنی چاہئے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مرحلہ پر صرف شرح سود (RATE OF INTEREST) کی تخفیف پر کیوں اکتفا کیا گیا؟ سود کو قطعی بند کیوں نہ کر دیا گیا؟ تو اس کا جواب وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اسلام محض اخلاقی اصول بیان کرنے والی حکمت ہی نہیں ہے، بلکہ زندگی میں عملاً اپنے اصولوں کو نافذ کرنے والا تدبّر (STATESMANSHIP) بھی ہے۔ ایک ملک کے معاشی نظام کو یکایک بدل ڈالنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اگر جبر اور خونریزی سے اس کی کوشش بھی کی جائے تب بھی سابق نظام کے اثرات فوراً نہیں مٹ سکتے۔ اس لیے اسلام نے اپنی جدید معاشی پالیسی پر رفتہ رفتہ عمل کیا۔ ۳ھ ہجری میں جیسا کہ ابھی بیان ہوا، جنگ احد کے بعد پہلا قدم شرح سود کی تخفیف کی صورت میں اٹھایا گیا۔ پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے غلہ اور اجناس کے کاروبار میں سٹہ (SPECULATION) کو روکا اور ایک ہی جنس کی چیزوں کے مبادلہ میں کمی و بیشی کو سود قرار دیا۔ اس کے بعد آپ نے مبادلۂ (EXCHANGE) کی طرف توجہ فرمائی اور سونے چاندی بصورت جنس (BULLION) یا بصورت زر (MONEY) دونوں کے مبادلہ میں ناجائز نفع بازی (PROFITEERING) کا دروازہ بند کر دیا۔ آخری ضرب اور فیصلہ کن ضرب فتح مکہ کے بعد لگائی گئی جبکہ قریب قریب پورا عرب اسلام کا سیاسی اقتدار قبول کر چکا تھا۔ اس وقت پورے زور کے ساتھ حکم دیا گیا کہ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو

"اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے" اِتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا "اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود تمہارا لوگوں کے ذمہ باقی ہے اسے چھوڑ دو" فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ "اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے ساتھ اعلان جنگ ہے" اس وقت اسلام یہ طاقت رکھتا تھا کہ بزور سود کو بند کردے اور پورے ملک کے معاشی معاملات کو ایک نئی بنیاد پہ قائم کرے، اس لئے اس نے نہ صرف تحریم سود کا اعلان کیا بلکہ اس اعلان کو بجبر منوا کر چھوڑا، سودی معاملات کرنے والے قبائل کو دھمکی دی گئی کہ اس کاروبار کو نہ چھوڑو گے تو تم پر چڑھائی کی جائے گی نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا گیا کہ سودی کاروبار بند کردیں ورنہ اسلامی حکومت ان کی حفاظت سے بری الذمہ ہے۔

صراط مستقیم

(مولوی عبدالحکیم صاحب قصوری)

خداوند تعالیٰ نے ہر مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ نماز میں صراط مستقیم (سیدھے راستے) پر ثابت قدم رہنے کیلئے دعا مانگے اب ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ کونسا صراط مستقیم ہے جس پر گامزن ہو کر نجات حاصل ہو سکتی ہے ۔ اور اس کے لغوی اور شرعی معنی کیا ہیں ۔

لغوی معنی | اَلصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ هُوَ الطَّرِيْقُ الْوَاضِحُ الَّذِيْ لَا اعْوِجَاجَ فِيْهِ (وہ صاف اور کھلا راستہ جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو) اس تعریف پر تمام لغت عرب متفق ہے ۔ استشہاد کے لئے جریر بن عطیہ خطفی کا شعر ملاحظہ ہو ۔

امیر المومنین علی صراط ۔۔۔ اذا اعوج الموارد مستقیم

شرعی معنی | گو مفسرین کی عبارتیں اس کی تعریف میں مختلف ہیں لیکن سب کا مآل اور خلاصہ ایک ہی ہے اَلْمُتَابَعَةُ لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت) جیسے فرمایا قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ کہہ دیجئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پس اگر تم نے روگردانی کی تو اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا ۔

نتیجہ | اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتا وہ کافر ہے ۔ جیسا کہ دوسری آیت اس کی وضاحت کر رہی ہے ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۔ "جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے پس تحقیق اس کے لئے جہنم کی آگ ہے اس میں ہمیشہ رہنا ہو گا ۔"

قرآن و حدیث میں صراط مستقیم کی وضاحت | ۱ ، وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (ترجمہ) اور تحقیق یہ میرا سیدھا راستہ ہے پس اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو تم کو اس کی راہ سے متفرق کر دیں گے ۔ اس بات کے متعلق اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے تاکہ تم بچو ۔

ربط آیت | اس آیت سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت کی اور بتایا کہ شرک کرو۔ ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اپنی اولاد کو غربت کی وجہ سے قتل نہ کرو ظاہری و باطنی بے حیائیوں سے بچو کسی جان کو بلا وجہ قتل مت کرو یتیم کے مال کی حسن طریقے سے کفالت کرو، ترازو اور پیمانہ پورا تول کر دو جب بات کرو تو انصاف سے کرو۔ پھر فرمایا وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا۔ اللہ کا عہد پورا کرو یعنی جو اللہ نے حکم دیا ہے اُسے کرو اور جس سے روکا ہے رک جاؤ پھر اعلان کیا۔ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ یہی چیز ہے جس کے متعلق خدا نے وصیت کی تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ سے ایفاءِ عہد کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا نام صراط مستقیم ہے۔ میرے اس معنی کی تائید امام ابو جریر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

وَبِوَصِیَّةِ اللّٰهِ الَّتِیْ اَوْصٰكُمْ بِهَا فَاَوْفُوْا۔ وَاِیْفَاءُ ذٰلِكَ بِاَنْ تُطِیْعُوْهُ فِیْمَا اَمَرَكُمْ وَتَنْتَهُوْا عَمَّا نَهَاكُمْ وَتَعْمَلُوْا بِكِتَابِهٖ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْوَفَاءُ بِعَهْدِ اللّٰهِ یعنی جس وصیت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے اُسے پورا کرو۔ اس کے پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے اُسے پورا کرو اور جس سے روکا ہے رک جاؤ۔ اور اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت پر عمل کرو۔

عہد اللہ اور صراط مستقیم ایک ہی چیز ہے | دلیل وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا کے بعد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ اور صراط مستقیم کی اتباع کے متعلق حکم دینے کے بعد فرمایا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ اس سے معلوم ہوا کہ عہد اللہ اور صراط مستقیم ایک ہی چیز ہے۔

(۲) قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔

(ترجمہ) آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے مجھ کو ایک سیدھا رستہ بتلایا ہے کہ وہ ایک مستحکم دین ہے ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ (نکتہ) صراط مستقیم ملت ابراہیم سے روگردانی کرنے والے بیوقوف کہتے ہیں جیسے فرمایا وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔

عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کو فرماتے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو تحقیق میرا رب اور تمہارا رب اللہ ہے پس اُس کی عبادت کرو یہ سیدھا راستہ ہے

ہود علیہ السلام فرماتے ہیں اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ تحقیق میرا رب سیدھے راستہ پر ہے (یعنی کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا)
اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق سورہ والصّٰفّٰت میں وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ وَاٰتَیْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ وَهَدَیْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر احسان کیا اور اُن کو واضح کتاب دی اور اُن کو سیدھے راستے کی ہدایت دی۔

اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کا لفظ اپنی ذات کے لئے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کیلئے عیسیٰ علیہ السلام کیلئے ابراہیم علیہ السلام کے لئے پھر خاتم الانبیاء علیہ التحیۃ والسلام کیلئے استعمال کیا۔ اور یہاں الفاظ اعلان کیا کہ اگر یہ لوگ بھی اجو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کرتے تو اُن کے لئے بہتر ہوتا اور ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا اور اس حالت میں ہم خاص اپنے پاس سے اجر عظیم عنایت فرماتے ہم اُن کو صراط مستقیم (سیدھا راستہ) بتلاتے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا یُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِیْتًا وَّاِذًا لَّاٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِیْمًا وَّلَهَدَیْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا۔

چونکہ صراط مستقیم اللہ اور اُس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا نام تھا اس لئے صراط مستقیم کے متصل فرمایا وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰی بِاللّٰهِ عَلِیْمًا۔ اور جو شخص اللہ اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے تو ایسے اشخاص اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین اور یہ بہت ہی اچھے رفیق ہیں۔ اس آیت سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں (۱) جو شخص اللہ کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتا ہے وہ یقیناً صراط مستقیم پر آجاتا ہے جیسے فرمایا۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اور جو لوگ ہمارے بارہ میں کوشش کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے راستے ضرور بتادیتے ہیں (۲) صراط مستقیم اللہ اور اُس کے رسول صلعم کی اطاعت ہی کو کہتے ہیں اسی لئے صراط مستقیم و من یطع اللہ والرسول فرمایا۔

صراط مستقیم کی نبوی تفسیر | قرآن مجید کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا۔ هُوَ صِرَاطُ اللّٰهِ الْمُسْتَقِیْمُ وَحَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ الذِّكْرُ الْحَكِیْمُ۔ وہ (قرآن مجید) اللہ کا سیدھا راستہ ہے اور اللہ کی مضبوط رسی ہے اور ذکر حکیم ہے۔ (مشکوٰۃ

نواس بن سمعان نبی کریم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم (سیدھے راستے) کی مثال یوں سمجھائی ہے کہ ایک سیدھا راستہ ہے اور اس کے ادھر اُدھر دو دیواریں ہیں اُن دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں اُن دروازوں پر پردے پڑے ہیں اور رستے کے سرے پر ایک شخص کھڑا ہوا آواز بلند پکار رہا ہے۔ کہ اے لوگو سب مل کر صراط مستقیم میں داخل ہو جاؤ اور متفرق نہ ہو جاؤ۔ اور ایک شخص کہہ رہا ہے۔ دیکھو ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ نہ کھولنا ورنہ سیدھے راستے سے بہک جاؤ گے۔ پس سیدھا راستہ اسلام ہے اور دیواریں خدا تعالیٰ کی حدیں ہیں (جو اُس نے شریعت میں قائم کی ہیں) اور دروازے شرعی ممنوعات ہیں اور رستے کے سر پر بلانے والا قرآن شریف ہے اور رستے کے اوپر سے پکارنے والا اللہ تعالیٰ کی وہ نصیحت ہے جس کا اثر ہر مسلمان کے دل میں پہنچتا ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر ابان بن عثمانؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عبداللہ بن مسعودؓ سے صراط مستقیم کی تفسیر دریافت کی تو جواب دیا کہ جس راستہ پر ہمیں محمد صلعم چھوڑ گئے ہیں اور یہ جنت میں لے جائے گا اس کے دائیں بائیں اور راستے ہیں جن کی طرف بلانے والے بہت سے آدمی ہیں۔ جو شخص اُن راستوں پر چلا وہ دوزخ میں جائے گا پھر یہ آیت پڑھی وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ۔

صراط مستقیم اور دنیوی کامرانیاں اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو شخص بھی صراط مستقیم پر آیا وہ دنیا میں تاج و تخت کا مالک ہوا دنیاوی کامرانیوں نے اُس کی قدم بوسی کی۔ ارشاد باری ملاحظہ ہو اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ اور اللہ نے ابراہیم کو صراط مستقیم پر چلایا۔ پھر ہم نے دنیا میں تمام قسم کی بھلائیاں دیں اور تحقیق وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔

دوسری آیت میں فرمایا۔ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ اس آیت میں دو چیزیں بتائیں ایک تو صراط مستقیم پر چلنے والوں کو بہشت ملے گا۔ دوسرا۔ خدا تعالیٰ اُن کا ولی ہوگا۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ دنیا میں اُن کا حافظ و ناصر اور مدد و معاون ہوگا۔ جیسے فرمایا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ۔ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

یہ تو میرا قرآنی استدلال تھا لیکن اسلام کی مکمل تاریخ اس کی کافی شہادت ہے۔

صراط مستقیم اور آخروی فوائد | دنیوی فوائد بطور نمونہ پیش ہو چکے ہیں اب آخروی فوائد ملاحظہ فرمائیں فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَمَنْ [1]
يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ

عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور کہا اے اللہ کے رسولؐ آپ مجھے میری اپنی جان سے اور اہل وعیال سے بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو بے چین اور بیقرار ہو جاتا ہوں یہانتک کہ آپکے پاس آتا ہوں اور آپکو دیکھ لیتا ہوں۔ (پھر اطمینان ہوتا ہے) اور جب میں اپنی اور آپ کی موت یاد کرتا ہوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ آپ جب جنت میں چلے جائیں گے۔ تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بلند مراتب حاصل کریں گے۔ اور اگر میں جنت میں گیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے نظر نہ آئیں۔ اس پر آنحضرت صلعم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ دوسری روایت میں ابو سعیدؓ روایت کرتے ہیں۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ امانت دار اور سچا بیوپاری بروز قیامت نبیوں صدیقوں شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ہو گا۔

صراط مستقیم اور شیطان | صراط مستقیم چونکہ جنت میں لے جانے والا راستہ تھا اس لئے شیطان نے اُس پر قبضہ کیا اور کہا اے مولا! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ (اس لئے اب میرا یہ کام ہوگا) کہ میں تیرے صراط مستقیم پر بیٹھ جاؤں گا۔ پھر اُن پر حملہ کروں گا اُن کے آگے سے اور اُن کے پیچھے سے اور اُن کے دائیں اور بائیں سے اور اُن میں سے اکثر لوگوں کو تو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بے شمار فرقے بن گئے ہیں صراط مستقیم کا کسی کو بھی خیال نہیں۔ جو شخص صراط مستقیم پر گامزن ہو گا اُس پر اور ایسے تمام حضرات پر شیطان کا وار یقیناً نہیں چل سکے گا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ تحقیق میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں۔

---

[1] یعنی جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کریگا وہ نبیوں، راست بازوں، شہیدوں اور نیکو کار لوگوں کے زمرہ میں شامل ہوگا۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو سوچنے سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے۔ ہے کوئی جو سوچنے سمجھنے اور نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ سورہ قمر آیت ۱۷

مطالب القرآن

یعنی

قرآن پاک کا سلیس اردو مفہوم

جلد اوّل

جسمیں قرآن پاک کی پہلی منزل یعنی سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ نساء کے مطالب بیان ہوئے ہیں،

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم۔ اے

دفتر پیغام حق ظفر منزل تاج پورہ لاہور

(۱) سورہ فاتحہ (۵)

یہ سورت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اور ایک رکوع اور سات آیتوں پر مشتمل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت احسان والا مہربان ہے ○

تمام حمد و ثنا اور ہر قسم کی تعریف و توصیف کے لائق اللہ ہی کی ذات ہے اور وہی اسکا مستحق ہے کیونکہ صرف وہی تمام مخلوقات کا رازق، مربی اور نگہبان ہے ○ اُس کے انعامات و اکرامات اور فیضان و رحمت کا حلقہ البیاد وسیع ہے جس کی انتہا نہیں۔ وہ ہر لحظہ و ہر آن تازہ بتازہ و نو بنو احسانات کرتا رہتا ہے۔ اس کے انعامات و اکرامات اور فیضان و رحمت عارضی نہیں ہوتے، بلکہ مستقل اور دائمی ہیں ○ وہی اس دن کا مالک ہے۔ جب لوگوں کو اُنکے نیک و بد افعال کی جزا یا سزا دی جائیگی اور جس دن تمام گردنیں اسکے آگے جھک رہی ہونگی ○ اے اللہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی امداد و اعانت چاہتے ہیں ○ اے اللہ! تو ہمیں سیدھی راہ پر لگا دے ○ اُن لوگوں کی راہ پر جن پر تو نے فضل و کرم کیا اُن کی راہ پر نہیں جنہوں نے معرفتِ حق اور فہم صداقت کے بعد حق و صداقت کو ٹھکرایا، شریعتِ الٰہیہ اور دعوتِ دینِ الٰہی اُن تک پہنچی باوجود اسکے اُنہوں نے حق سے منہ موڑا، باپ دادا کے گمراہ طریقوں کی پیروی کی اور آباؤ اجداد کی اُن بدعملیوں اور بداخلاقیوں کی اندھی پیروی کی جن کی وجہ سے وہ تیرے غضب کے مستحق بنے تھے۔ اور اے اللہ! اُن گمراہوں کی راہ پر بھی ہمیں نہ چھوڑ۔ جن پر حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا اور وہ راستہ ہی میں ناکام و نامراد مقصود سے بھٹک کر رہ گئے ○

سُورہ بقرہ

(۲) (۸۷)

یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اس میں ۴۰ رکوع اور ۲۸۶ آیتیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت احسان والا مہربان ہے

الٓمٓ ① یہ وہ کتاب ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی بات نہیں ہے، جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے یہ کتاب ہر معاملے میں اُن کی راہنما ہے۔ ② اللہ کے خوف والے وہ لوگ ہیں جو غیر محسوس[۱] اور ماورائے عقل حقائق کو بھی قرآن کی تعلیم کے مطابق تسلیم کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دے رکھا ہے اسمیں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں ③ نیز وہ لوگ اللہ کے خوف والے ہیں جو اس کتاب پر جو اے پیغمبر اسلام تجھ پر نازل کی گئی ہے ایمان لائے ہیں اور اُن کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تجھ سے پہلے نازل کی گئی تھیں اور آخرت پر بھی یقین و ایمان رکھتے ہیں ④

---

[۱] غیب سے مراد وہ ہے جس کا مقام اس دنیائے محسوسات سے پرے ہو۔ اور جو محض عقل و ادراک سے دریافت نہ کیا جاسکے۔ جیسا کہ قیامت، دوزخ، بہشت وغیرہ ایک نظام اور کائنات وہ ہے جسے ہم سمجھتے اور دیکھتے ہیں مگر اسکے علاوہ ایک نظام اور ایک کائنات اور بھی ہے جو ہمارے فہم وادراک اور حس و قوت سے بہت بالا ہے اور جب تک اس نظام کو بنانے والا جو خود بھی غیب ہے ہمیں بذریعہ وحی والہام نہ بتائے ہم نہ اس نظام کو سمجھ سکتے اور نہ اس کائنات کو دیکھ سکتے ہیں۔ قرآن پاک اسی قسم کے نظام اور اسی کائنات کو غیب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ انسان کو اس دُنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدائی تعلیمات کی رہنمائی میں اپنا تعلق اس دوسرے نظام سے جوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان بالغیب کی اس اہمیت کو ابتدا ہی میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس نظام کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کو قرآن کی راہنمائی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ کی راہنمائی نصیب ہے[1] اور یہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہیں ۵ (اسکے برعکس) جو لوگ انکار کرتے ہیں یعنی غیب پر ایمان نہیں لاتے نماز نہیں پڑھتے بندگانِ خدا پر اپنا مال ومتاع خرچ نہیں کرتے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اس قرآن پر ایمان نہیں لاتے پہلی الہامی کتابوں اور گذشتہ پیغمبروں کو تسلیم نہیں کرتے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے تم اُن کو (اللہ کے عذاب سے) ڈراؤ یا نہ ڈراؤ اُن کے لئے برابر ہے۔ وہ ہرگز ایمان نہیں لائینگے کیونکہ انہیں ایمان کی خواہش ہی نہیں ۶ اُنکے اس کفر وانکار کی وجہ سے اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کی سماعت پر مہر لگادی ہے اور اُن کی آنکھوں پر ایک پردہ پڑگیا ہے۔ آخرکار اُنکے لئے سخت عذاب ہوگا۔ ۷ اور (ان دو قسم کے انسانوں مومنوں اور کافروں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا ہے) لوگوں میں سے بعض وہ بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں (منافق ہیں) ۸ یہ لوگ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، مگر حقیقت میں اپنے سوا کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور اس بات کو نہیں سمجھتے[2] ۹ اُن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے، سو اللہ نے اُنکے مرض کو

---

[1] مختصر یہ کہ ہدایت یافتہ اور متقی لوگ وہ ہیں جو (۱) خدا، ملائکہ، بہشت اور دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں۔ (۲) اپنے خالق کی عبادت، اطاعت اور فرمانبرداری بجالاتے ہیں۔ (۳) اپنے بھائی بندوں اور دیگر مخلوق انسانی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے اور اپنا مال ومتاع اُن پر خرچ کرتے ہیں (۴) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں (۵) تمام سابقہ آسمانی کتابوں کو اور تمام پہلے رسولوں کو مانتے ہیں۔ (۶) اور آخرت پر دل سے یقین رکھتے ہیں۔ اِن چھ شرطوں کو پورا کرنے والے لوگ متقی اور مومن کہلاتے ہیں اور صرف انہی لوگوں کو قرآن کی یا بالفاظِ دیگر خدا کی رہنمائی حاصل ہوسکتی ہے۔

[2] پہلے رکوع میں لوگوں کی دو قسموں کا ذکر ہوا تھا یعنی مومنوں اور کافروں کا اس رکوع میں ایک اور قسم کا ذکر ہے جو حقیقت میں کافروں ہی کی ایک قسم ہے ان کو منافق کہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ مکہ میں نہیں تھے۔ مگر مدینہ منورہ میں بکثرت موجود تھے یہ عجیب وغریب قسم کے لوگ زبان سے اسلام کو تسلیم کرتے اور بڑی وفاداری اور سرگرمی کا دعوےٰ رکھتے تھے مگر حقیقتاً وہ دل سے کافر ہی نہ تھے۔ بلکہ اسلام پیغمبرِ اسلام اور پیغام اسلام کے جانی دشمن تھے بدقسمتی سے آج بھی مسلمانانِ عالم کی ایک بڑی جماعت اس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے اور مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کو ختم کرنے میں سب سے پیش پیش ہے۔

بڑھنے دیتا ہے نتیجۃً اُن کو دردناک سزا ملیگی کیونکہ وہ جھوٹ[1] بولنے کے عادی ہیں۔ (۱۰) اور
جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ (اپنی منافقت سے) دنیا میں فساد برپا نہ کرو، تو کہتے ہیں کہ ہم تو محض
اصلاح کرنے والے ہیں (۱۱) لوگو! خبردار رہو یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں لیکن نہیں
سمجھتے[2] (۱۲) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لے آئے ہیں تم بھی ایمان لے
آؤ، یعنی ایک خُدا کو مانو، اس کی عبادت کرو، غریبوں کی مدد کرو، قرآن کی تعلیمات کو سچ جانو
اور اُن پر عمل کرو، سابقہ الہامی کتابوں اور پہلے پیغمبروں کو مانو اور آخرت پر یقین رکھو، تو یہ جواب
دیتے ہیں۔ کہ کیا ہم بھی بے[3] وقوفوں کی طرح (بلا سوچے سمجھے) ان باتوں کو مان لیں؟ سنو یہی لوگ در
اصل بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے (۱۳) یہ منافق لوگ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ
ہم بھی مسلمان ہیں مگر جب یہ اپنے جیسے شیطانوں کے پاس علیحدگی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ
ہیں مسلمانوں کے ساتھ تو ہم محض مذاق کرتے ہیں (۱۴) اللہ اُن کو اس مذاق کی سزا مذاق ہی سے
دے گا اور اُن کو انہی کی سرکشی میں حیران و پریشان ادھر اُدھر پھرنے کے لئے چھوڑ دے گا (اور
سیدھی راہ نہیں دکھائے گا۔) (۱۵) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دے کر گمراہی کو خرید لیا
ہے اس لئے اُن کا سودا نفع بخش ثابت نہیں ہوا اور نہ انہوں نے کبھی ہدایت پائی ہے (۱۶)
یہ لوگ دُنیا کے حقیر فائدوں اور اُن آسانیوں کو دیکھتے جو مسلمانوں کو بظاہر حاصل تھیں تو دل سے
سچے مسلمان بن جانا چاہتے مگر جب اُن پابندیوں مشقتوں اور قربانیوں سے واقف ہوتے جن

---

[1] جھوٹ نفاق کا لازمہ ہے۔ منافق کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑ جاتی ہے جس سے وہ دنیا میں لوگوں کے سامنے ذلیل و رسوا ہوتا ہے اور آخرت میں خدا کے عذاب کا مستوجب قرار پاتا ہے۔

[2] یہ لوگ یا تو عقل و ہوش نہیں رکھتے، یا نیکی اور اصلاح کا مفہوم اُنکی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ مین اُس چیز کو جو گناہ ہے یہ اُسے نیکی سمجھتے ہیں، جو فساد اور موجب فساد ہے یہ اُسے اصلاح اور موجب اصلاح خیال کرتے ہیں

[3] سچے مسلمانوں کو یہ لوگ بے وقوف کہتے تھے اور کہتے ہیں۔

کامطالبہ اسلام ہر سچے مسلمان سے کرتا ہے تو ٹھٹک کر رہ جاتے، ان کی آنکھوں کے سامنے
اندھیرا سا آجاتا اور یہ اپنا رویہ متعیّن کرنے میں پس وپیش سے کام لینے لگتے۔ ان کی مثال یوں
سمجھو جیسے کسی شخص نے (اندھیرے میں) آگ سلگائی پھر جب آگ نے اس کے اردگرد کی تمام
چیزوں کو روشن کر دیا، تو اللہ نے اُن کی روشنی کو بجھا دیا۔ اور اُن کو سخت اندھیرے میں چھوڑ دیا۔
جہاں اُن کو کوئی چیز نظر نہیں آتی، بالکل اسی طرح پیغمبر اسلام کی تعلیمات کو سن کر ان کو لائحہ عمل
کچھ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ اسلام و ایمان کے فوائد سے آگاہ ہو کر ان کے دل روشن ہونے
لگتے ہیں۔ اور حقیقی مسلمان کی راہ ان کو نظر آنے لگتی ہے تو اچانک دل میں شکوک وشبہات کی
تاریکی جس کے یہ عادی ہو چکے ہیں اور فطرت کی کمزوری جو ان کی بداعمالیوں کی سزا ہے آکر درمیان
میں حائل ہو جاتی ہے اور پھر پہلے کی طرح اسلام کے فوائد سے محروم اور سچے مسلمانوں کی مشقتوں
سے خائف ہو کر کفر و جاہلیت پر ہی اڑے رہتے ہیں (۱۷) وہ بہرے ہیں کہ حق کی پکار کو نہیں
سنتے وہ گونگے ہیں کہ حق بات نہیں کہہ سکتے وہ اندھے ہیں کہ راہ حق نہیں دیکھتے لہٰذا اس
قسم کے لوگوں سے یہ توقع نہ رکھی جائے کہ یہ کبھی اپنے طرز عمل کو چھوڑ کر لوٹ آئینگے اور سچے مسلمانوں
میں شامل ہو جائیں گے (۱۸) یا پھر منافقوں کی حالت یہ ہے کہ جب وہ اسلام کی ترقی اور
مسلمانوں کے دبدبے کو دیکھتے ہیں اور مخالفین اسلام کی آئندہ بدحالی کا اندازہ لگاتے ہیں
تو ڈر کے مارے جھٹ سے مسلمانوں میں اپنا نام لکھوا دیتے ہیں۔ ان مردم شماری کے مسلمان منافقوں
کی مثال ایسی ہے کہ جیسے موسلا دھار مینہ بادلوں سے برس رہا ہو، گھنگھور گھٹا چھائی ہو، ہر
طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو، بادلوں کی گرج سے دل دہل رہے ہوں اور بجلی کی چمک سے آنکھیں
خیرہ ہو رہی ہوں۔ اُس وقت بادلوں کی گرج کو سنکر لوگ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں
ٹھونس لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم بچے رہیں گے۔ اس طرح جب یہ بزدل منافق مسلمانوں

کا جذبۂ جہاد اور راہِ حق میں اُن کی شدّت و سخت گیری کو دیکھتے ہیں تو اپنے اندر مقابلہ کی تاب نہ پا
کر از راہِ منافقت، اُن کی ہمنوائی کا دم بھرنے لگتے ہیں اور گو دل سے کفر و جاہلیت پر اڑے
رہتے ہیں مگر زبانی دعووں کے ذریعے اپنی ہمدردیاں جتا کر مسلمانوں کی شدت سے بچے رہنا
چاہتے ہیں لیکن اللہ کی گرفت اور عذاب سے کون اس طرح بچ سکتا ہے۔ وہ کفر و انکار کرنے
والوں کو خواہ وہ منافقت کا لباس ہی کیوں نہ پہنے ہوئے ہوں سزا دئے بغیر نہیں چھوڑے گا (۱۹)
مسلمانوں کی شان و شوکت نے بجلی کی چمک کی طرح اُن کی آنکھوں کو بہت حد تک چُندھیا
دیا ہے جب اُن کو اسلام کے فوائد کی کشش کھینچتی ہے تو یہ چند دنوں کے لئے مسلمانوں کیساتھ
ساتھ چلتے ہیں یوں سمجھو کہ انہیں کچھ روشنی نظر آنے لگتی ہے اور وہ چند قدم آگے بڑھتے ہیں مگر
جب ان کو رسم و رواج کی پابندیاں، اعزا و اقارب کے طعنے اور بعض مالی فوائد کا نقصان نظر آتا ہے
تو وہیں رُک جاتے ہیں اور ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ گویا اُن پر ایک اندھیرا سا چھا گیا
ہے اور راہ نظر نہیں آتی بس ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا، تو ان کی سماعت اور بصارت
کو بالکل زائل کر دیتا۔ پھر نہ ان کو حق کی آواز سنائی دیتی اور نہ راہِ حق نظر آسکتی۔ خوب یاد رکھو کہ
اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۲۰) اے انسانو! اپنے اُس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور اُن ع
کو جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں سب کو پیدا کیا۔ یاد رکھو اگر تم نے کما حقہٗ عبادت کی تو ہو سکتا ہے
کہ تمہارے اندر تقوے یعنی خدا کا خوف، ماسوا سے بیزاری اور اللہ سے محبت کے جذبات پیدا
ہو جائیں (۲۱) وہ اللہ جس کی عبادت کرنے کے لئے تمہیں کہا گیا ہے۔ وہ وہی ہے جس نے اس
رُوئے زمین کو تمہارے لئے فرش کی طرح بچھا دیا، آسمان کو چھت کی مانند کھڑا کر دیا اور بادلوں
سے مینہ برسایا جس سے تمہارے کھانے کے لئے پھل اگائے۔ لوگو! تم اللہ کی اس قدرت
اور اس کے احسانات کو خوب جانتے ہو لہٰذا تمہیں یہ چاہیئے کہ اس کی عبادت کرکے اس کی

عظمت کو تسلیم کرو، اس کی نعمتوں کا شکریہ بجا لاؤ اور کسی کو اس کی عبادت میں اس کا شریک نہ ٹھہراؤ ﴿۲۲﴾ اور اگر تمہیں اس کلام میں کوئی شک ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) پر اتارا ہے تو تم بھی اس کلام کی مانند کوئی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے ماسوا تمہارے جس قدر معاون و مددگار ہیں اُن سے بھی اعانت طلب کر دیکھو اگر تم سچے ہو۔ ﴿۲۳﴾ اگر تم ایسی کوئی سورت نہ بنا سکو اور ہمارا دعوےٰ ہے کہ تم نہیں بنا سکو گے تو تمہیں چاہیئے کہ دوزخ کی اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن پتھر[1] ہونگے اور وہ لوگ ہونگے جو اس کلام میں کوئی شک کریں اور اسے نہ مانیں دیکھو یہ آگ اُن کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ کی عبادت قرآن کی تصدیق اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت سے انکار کریں ﴿۲۴﴾ اور جو لوگ ایمان لے آویں اور ایمان کی شرائط کو پورا کرتے ہوئے وہ عمل کریں جو ایمان کا تقاضا ہیں اُن کو تم خوشخبری سنا دو کہ اُن کے ایمان و عمل کے بدلے میں انہیں اُخروی زندگی میں ایسے باغات دیئے جاویں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی۔ جب اُن کو وہاں کوئی پھل کھانے کے لئے دیا جاوے گا تو کہیں گے کہ یہ تو ہم پہلے بھی کھایا کرتے تھے یعنی وہاں بھی انہیں دنیاوی اشیاء سے ملتی جلتی اشیاء ہی دی جاوینگی اور اُن کے لئے وہاں پاک، صاف اور سُتھری بیویاں بھی ہونگی۔ مزید برآں یہ جگہ ان کا عارضی مقام نہیں ہوگا بلکہ ان کو ہمیشہ یہیں رہنا ہوگا ﴿۲۵﴾ اُخروی زندگی کی کیفیت کا ہلکا سا اندازہ کرانے کے لئے دنیاوی اشیاء کو جو بمقابلہ اُخروی اشیاء کے بہت ہی حقیر ہیں بطور مثال کے پیش کیا گیا ہے تاکہ ذہن کو معلوم سے نامعلوم کی طرف منتقل کیا جائے۔ اگر اس بات پر کسی کو اعتراض ہو کہ اللہ نے کیسی حقیر اشیاء کا ذکر کیا ہے تو اُس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ) اللہ اس بات سے مطلق نہیں شرماتا

[1] مشرکین پتھروں کے بت بنا کر رکھا کرتے ہیں اور اُن کو اپنا قبلۂ حاجات بنا کر اُن کی عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کو، اُن کے بتوں کو اور وہ چیز جس سے وہ بت بنایا کرتے تھے دوزخ کی آگ کا ایندھن بنائیگے اور جب مشرکین دیکھیں گے کہ اُن کے معبود بھی اُنکے پہلو بہ پہلو جل رہے ہیں تو اُنکی تکلیف اور بھی کئی گنا بڑھ جاویگی۔

کہ وہ ایک مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی مثال بیان کرے (اگر اُس سے کسی حقیقت کی کیفیت کا واضح کرنا مقصود ہو) ہاں جو لوگ خدا کو، رسُول کو، اس قرآن کو اور یوم آخرت کو مان چکے ہیں وہ تو فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اُن کے رب کی طرف سے بہت مناسب اور ٹھیک ہے مگر جو لوگ خدا، رسول، قرآن اور یوم آخرت کو نہیں مانتے وہ پوچھنے لگتے ہیں۔ کہ اللہ نے اس مثال کو کیوں بیان کیا ہے۔ اسی قرآن سے اللہ بہتوں کو اُلٹی راہ پر ڈال دیتا ہے اور اسی سے بہتوں کو راہ راست دکھلا دیتا ہے مگر الٹی راہ پر صرف انہی لوگوں کو ڈالتا ہے جو عادی نافرمان، بدکار اور سرکش ہوتے ہیں (۲۶) یہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کے ساتھ (تسلیم و رضا کا) معاہدہ[۱] پختہ کرنے کے بعد بھی اُسے توڑ دیتے ہیں (یعنی ایمان لاچکنے کے بعد بھی کفر و جاہلیت کے عقائد و رسوم پر قائم رہتے یا منافقانہ زندگی بسر کرنے لگتے ہیں) اور اللہ نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُن کو توڑتے اور رُوئے زمین پر فتنہ[۲] و فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں (۲۷) (لوگو) تم اللہ پر ایمان لانے سے کس جرأت پر انکار کر سکتے ہو کیا تم نہیں جانتے کہ تم نیست تھے اور اس نے تم کو ہست کیا۔ اس کے بعد وہ پھر تمہیں نیست کریگا اور بعد ازاں پھر ہست کریگا اور سب سے آخر میں تمہیں پھر اسی کی طرف لوٹایا جائے گا جس نے اوّل مرتبہ تمہیں ہست کیا تھا۔ (۲۸)
وہی ہے جس نے نہ صرف تمہیں پیدا کیا بلکہ ہر وہ چیز جو تم روئے زمین پر دیکھتے ہو اُس نے

---

[۱] معاہدہ سے مراد یہاں ایمان کا لانا ہے اور ایمان تسلیم و رضا کا دوسرا نام ہے جب ایک انسان منہ سے یہ الفاظ پکارتا ہے کہ میں اللہ، اُس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آیا ہوں اور مانتا ہوں کہ میری بھلائی اور برائی پر سوا خدا کے کوئی قادر نہیں" تو گویا وہ خدا سے معاہدہ کرتا ہے کہ ایمان و یقین کا یہ درجہ وہ کبھی دوسرے کے لئے روا نہ رکھے گا۔

[۲] فساد سے مراد وہ (Corruption) اور بدنظمی بھی ہے جو باطل اعتقادات بیہودی اور بد اخلاقی کا پروپیگنڈا کرنے سے پھیلے اور وہ منافقت بھی جس سے نقض امن اور خونریزی کا بازار گرم ہو۔

تمہارے لئے پیدا کی اسکے بعد وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور سات آسمان بنا دیئے۔ یہ
ع۳ بات خوب سمجھ لو کہ اُس کو تمہاری ہر ضرورت کا علم[۱] ہے۔ (۲۹) اور سنو یہ ایک امر واقعہ ہے ک
جب اللہ نے تمہیں پیدا کیا تو اس نے ملائکہ سے کہا کہ میں رُوئے زمین پر اپنا ایک نائب
مقرر کرنا چاہتا ہوں (جو میرے احکام کو وہاں نافذ کرے اور اس کے لئے میں نے اپنی
مخلوق میں سے انسان کو منتخب کیا ہے) ملائکہ (جو انسان کی سرشت، ہیئت اور ترکیب
واقف تھے یہ دیکھتے ہوئے کہ انسان کو ایک طرفہ معجون مرکب بنایا گیا ہے اور اس کو فطر
سلیمہ کے ساتھ ساتھ آزادی اور اختیار بھی حاصل ہے لہٰذا یہ ضرور سرکشی اور نافرمانی کا ارتک
کرے گا) کہنے لگے کہ اے اللہ! کیا تو اُسے زمین پر اپنا نائب مقرر کرنا چاہتا ہے جو تیری نا ف
اور حکم عدولی کے ذریعے وہاں فتنہ و فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا۔ برعکس اس
کے ہم ہیں کہ تیری حمد و ثنا کہتے اور تیرا بول بالا کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا کہ اے ملائکہ جو کچھ
میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ (۳۰) اس کے بعد اللہ نے آدم کو علمِ اشیاء[۲] مکمل عطا کر دیا۔
اُن اشیاء کو فرشتوں کے سامنے رکھا اور اُن سے پوچھا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں کہ انسان سے
تم افضل ہو سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ (۳۱) انہوں نے جواب دیا کہ اے اللہ! تیری ذ
عیب سے خالی ہے، تیرا فیصلہ درست ہے ہم کچھ نہیں جانتے اور اگر جانتے ہیں تو صرف اس قدر جو تو
بتا رکھا ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تجھے ہر چیز کا ٹھیک ٹھیک علم ہے اور تیرا کوئی کام مصلحت[۳] سے

---

۱ اس سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان اور اس میں جو کچھ ہم دیکھتے ہیں سب حضرتِ انسان کے لئے بنایا گیا
۲ علم اشیاء سے مراد وہ سمجھ، عقل، قوتِ دریافت اور قوتِ اظہار ہے جس کی بدولت انسان تمام کائنات
فائدہ اٹھا رہا ہے اور یہ علمِ اشیاء ہی وہ چیز ہے جس نے انسان کو مرتبہ میں ملائکہ سے بھی فائق تر کر دیا۔
۳ مطلب یہ ہے کہ تو جسے جس قابل دیکھتا ہے اُسے وہی دیتا ہے اور اتنا ہی دیتا ہے جتنا اُسے درکار ہو
اور اس کی صلاحیتوں کے لئے مناسب ہو۔

خالی نہیں ہوتا (۳۲) اللہ نے کہا کہ اے آدم تم ان اشیاء کے نام انہیں بتاؤ۔ پھر جب وہ انہیں اُن کے نام بتا چکا تو اللہ نے ملائکہ سے پوچھا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ زمین و آسمان کے وہ رازہائے سربستہ جو سب سے پوشیدہ ہیں وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں میں انہیں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم زبان سے کیا کہتے ہو اور تمہارے دلوں کی گہرائیوں میں کیا خیالات چھپے ہیں (۳۳)
اور یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو (جسے ہم نے زمین پر اپنا نائب مقرر کر دیا ہے ازراہ تعظیم) سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کر دیا۔ اُس نے انکار کیا اور بڑا بننا چاہا اور کافر و نافرمان ہو گیا۔ (۳۴) پھر یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ہم نے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی تم دونوں جنت میں رہو اور وہاں جس چیز کو چاہو، جتنا چاہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالم، نافرمان اور حد سے تجاوز کرنے والے ہو گے (۳۵) پھر شیطان نے (جو اُن کا جانی دشمن بن چکا تھا) اُن کو درخت کے معاملہ میں پھسلا دیا اور جس امن و سلامتی اور خوشی کے مقام میں وہ تھے وہاں سے اُن کو نکلوا دیا اور ہم نے حکم دیا کہ نیچے اتر جاؤ۔ تم (آج سے) ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اب زمین پر تمہارے لئے ایک مقررہ وقت[۱] تک کے لئے جائے رہائش اور خورد و نوش کا انتظام کر دیا گیا ہے (۳۶)
اس کے بعد آدم نے اپنے رب سے چند الفاظ (بذریعہ وحی و القا) سیکھے جن کے ذریعے اُس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور نادم ہوا اور یہ ارادہ پختہ کر لیا کہ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ لہٰذا اللہ نے آدم کی توبہ کو قبول کر لیا۔ خوب یاد رکھو کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے اور بخشنے والا مہربان ہے (۳۷) حکم دیا کہ تم یہاں سے سب کے سب اتر جاؤ لیکن اگر میری

۱؎ ہر شخص کی خوراک اور جائے رہائش کا تکفل آخیر عمر تک خود اللہ تعالیٰ ہے۔

۲؎ توبہ کے معنی غلطی اور گناہ کا اعتراف کرنا اور نادم و پشیمان ہو کر آئندہ کیلئے ارادہ کر لینا کہ دوبارہ ایسی غلطی نہ کرونگا

طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت یا حکم پہنچے تو جو کوئی میری اُس ہدایت یا میرے اُس حکم پر عمل
کریگا اُس کو نہ دنیا میں کوئی ڈر ہوگا نہ اُس کے بعد اُس کو غم کھانا پڑے گا (۳۸) اور وہ لوگ
جو اُن احکام کے ماننے سے انکار کریں گے اور اُن کو جھوٹ سمجھیں گے وہی اہلِ دوزخ ہونگے
ع ۴ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۹) ع اے یہودیو! میرے اُن انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر
کئے اور مجھ سے تم نے جو عہد[1] باندھا تھا اُسے پورا کرو میں اپنے عہد کو پورا کروں گا۔ اور حق بات
کے کہنے اور اس کے ماننے میں صرف مجھی سے ڈرو (۴۰) اور اس قرآن پر جو تمہاری کتاب کو سچا
بتا رہا ہے ایمان لے آؤ اور تمہی سب سے پہلے اس سے انکار نہ کر بیٹھو۔ نیز میرے الہامات کو دنیا
کے حقیر فوائد اور ذاتی اغراض و مصالح جیسی تھوڑی سی قیمت کے عوض نہ بیچتے پھرو بلکہ حق بات
کے کہنے اور ماننے میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لاؤ۔ اور محض مجھی سے ڈرو۔ (۴۱) اور سچ کو جھوٹ
میں نہ ملاؤ اور نہ سچ کو چھپاؤ جب کہ تمہیں معلوم ہو کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ (۴۲) اور نماز پڑھو
زکوٰۃ دو اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں جھکو (۴۳) یہ کیا بات ہے کہ تم لوگوں کو تو نیک
کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپکو بھلا رکھا ہے حالانکہ تم تورات پڑھتے ہو کیا تم اس صریح جرم
کو نہیں سمجھتے (۴۴) اور (دیکھو اگر قبولِ حق اور اظہارِ حق میں تم پر سختی آئے تو) اللہ سے مدد مانگنے
کا طریقہ یہ ہے کہ صبر و استقلال سے کام لو اور نماز پڑھو۔ بلا شبہ یہ چیز بہت مشکل اور کٹھن ہے
مگر عاجز مزاج لوگوں کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ (۴۵) جو جانتے ہیں کہ وہ (ایک دن) اپنے رب
کے سامنے پیش ہونے والے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ (دنیا کا یہ سفر ختم کرنے کے بعد)
ع ۵ وہ اُسی کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں (۴۶) ع

---

[1] تورات میں کتاب خروج باب ۱۹ آیت نمبر ۵، ۶ میں آیا ہے۔ اے اولادِ یعقوب! اگر تم نے میری آواز پر کان دھرا اور اس معاہدہ کو پورا کیا جو مجھ سے باندھا ہے تو تمام لوگوں سے بڑھکر تم میرے نزدیک ایک عجیب خزانہ سمجھے جاؤ گے .... اور ایک مقدس قوم تصور کئے جاؤ گے۔

اے یہودیو! میرے اُن انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تم کو تمام دنیا پر ترجیح دی تھی ﴿۴۷﴾ اور جزا سزا کے اُس دن سے ڈرو جب کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا۔ نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول کی جائیگی نہ کسی سے فدیہ یا معاوضہ لیا جاوے گا اور نہ اُن کو کسی اور طرح مدد[1] دی جائیگی ﴿۴۸﴾ اور (آؤ اگر تمہیں وہ انعامات یاد نہ رہے ہوں۔ تو ہم تمہیں یاد کرادیں) اُس واقعہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاؤ جب ہم نے تمکو فرعون کے کنبہ سے نجات دلائی جبکہ انہوں نے تمہیں سخت مصائب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ (تمہاری کثرت کے خوف سے) تمہارے بیٹوں کو مار دیتے اور تمہاری عورتوں کو (لونڈیاں بنانے کی خاطر) زندہ رکھتے اور یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے ایک بڑی سخت آزمائش[2] تھی۔ ﴿۴۹﴾ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب (مصر سے خروج کے وقت) ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑا[3] اور اس طرح تمہیں بچایا اور فرعون (اُسکے کنبہ، اُسکی قوم اور اسکے متبعین) کو ڈبو دیا اور تم اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے ﴿۵۰﴾ اور (اس کے بعد اُس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے (فرعون کی ہلاکت کے بعد) موسیٰ کو چالیس راتوں کے لئے کوہِ طور پر بلاکر تورات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر (جب وہ کوہِ طور پر گیا تو) تم نے (اہل مصر کی طرح) اُس کے بعد گائے

ف۱ عیسیٰ علیہ السلام ہی کے زمانے سے یہودیوں کو کچھ خاندانی غرور اور کچھ صحیح تعلیمات کے فقدان کی وجہ سے اپنے متعلق غلط فہمی سی ہوگئی تھی۔ قیامت اور روزِ جزا سزا کا اُن کو مطلق ڈر نہ رہا تھا اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ ہم نبیوں عالموں اور بزرگوں کی اولاد ہیں اگر موت کے بعد جزا سزا کا دن آیا بھی تو ہمارے بزرگ ہمیں بچا لینگے۔ اُنکے اس زعمِ باطل کی یہاں تردید کی گئی ہے۔ افسوس کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کے بھی یہی خیالات ہیں اور یہ بھی یہود کی طرح اپنے متعلق بعض غلط فہمیوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ گو اس مقام پر خطاب تو یہود سے ہے مگر ایک عالمگیر اور دائمی صداقت کو یہاں بیان کیا گیا ہے جس سے مسلمانوں کو بھی اسی طرح سبق لینا چاہیئے جیسے یہود کو۔

ف۲ اس واقعہ کی تفصیل تورات میں کتاب الخروج باب ۱۱ آیت ۵ تا ۲۲ اور آیت ۲۹ تا ۳۴ میں ملاحظہ کیجیے

ف۳ دریا کے پھاٹنے کی حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسکی تاریخی حیثیت بالکل مسلّم ہے تورات میں کتاب الخروج باب ۱۴ آیت ۲۱ تا ۳۱ میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے۔

کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور بڑی ہی بے انصافی کی (۵۱) پھر بھی ہم نے اس کے بعد تمہارا[1] قصور معاف کر دیا تاکہ تم شکر بجا لاؤ۔ (۵۲) (اس کے بعد یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور معجزات عطا کئے تاکہ تم اُن سے راہنمائی حاصل کرتے رہو (۵۳) اور (ہمارے اس انعام کو بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے میری قوم! تم نے گائے کے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کیا ہے لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ تم اپنے خالق کیطرف رجوع کرو اور تم میں سے وہ جنہوں نے گائے کے بچھڑے کی پوجا نہیں کی وہ اُن کو جنہوں نے اُسکی پوجا کی تھی اپنے ہاتھ سے قتل کریں۔ تمہارا ایسا کرنا تمہارے خالق کے نزدیک بہت بہتر ہے۔ چنانچہ جب تم اس حکم کو بجا لائے تو اللہ تم پر پھر مہربان ہو گیا اور درحقیقت وہ سب سے بڑھکر قصور معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (۵۴) اور پھر[2] وہ وقت بھی یاد کرو جب تم نے کہا تھا۔ کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے جب تک ہم ان آنکھوں سے اللہ کو نہ دیکھ لیں۔ (چونکہ تمہارے اندر اُس کو دیکھنے کی تاب و تواں نہ تھی، لہٰذا بجلی کی ایک ہی کڑک نے تمہیں آ لیا اور تم دیکھ رہے تھے (۵۵) پھر تمہارے مر چکنے کے بعد ہم نے تمہیں زندہ کر دیا تاکہ تم شکر بجا لاؤ (۵۶) پھر وہ وقت یاد کرو جب (تم خانہ بدوش جنگلوں میں پھر رہے تھے تو تمہیں گرمی کی شدت سے بچانے کے لئے) ہم نے تمہارے اوپر بادلوں کا سایہ کیا اور من[3] و سلوٰی

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل تورات میں کتاب الخروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۸ میں دیکھ لیجئے۔

[2] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہود کے سرداران قوم کوہ طور پر اللہ تعالےٰ کو حضرت موسیٰ کے ساتھ ہمکلام ہوتا دیکھنے گئے تھے مگر یہ ہمکلامی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے لئے مخصوص تھی انکی سمجھ میں یہ بات نہ آئی اور مطالبہ کیا کہ ہم کو اللہ [illegible] دے اور تم سے کلام کرے تب ہم مانیں گے چنانچہ اللہ کے نور کی تجلی بجلی کی ایک کڑک کی شکل میں ظاہر ہوئی اور یہ کڑک اتنی شدید تھی کہ وہ سنتے کے ساتھ ہی ایسے حواس باختہ اور بیہوش ہو گئے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں اور التجاؤں کو اللہ تعالےٰ نہ سنتا تو وہ مر چکے تھے۔ مگر اللہ نے اُن کے قصور کو معاف کیا اور اُس صدمہ سے بچا کر زندہ کر کے کھڑا کر دیا۔

[3] من اوس کے قطروں کی شکل میں شہد جیسی میٹھی اور لذیذ ایک چیز تھی اور سلویٰ بٹیر یا بٹیر کی قسم کا پرندہ یا کوئی اور ایسی چیز جس کو تم

تمہارے لئے بھیجا (اور کہا کہ) ان حلال و پاک چیزوں کو جو ہم نے تمہیں دی ہیں کھاؤ۔ (انہوں نے کچھ عرصہ کے بعد ناشکری کی اور اُن چیزوں کے کھانے سے انکار کر کے اپنے اوپر ظلم کیا) اور گو ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا مگر اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے وہ عادی ہو چکے تھے ﴿۵۷﴾ اور وہ بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس گاؤں (اریحا) میں داخل ہو جاؤ اور وہاں سے جو کچھ چاہو آزادانہ کھاؤ پیو اور (اس فتح و ظفرمندی کے وقت نہایت عاجزانہ طور پر) دروازہ میں سے جھکتے ہوئے گذرو اور یہ کہتے ہوئے گذرو کہ "اے اللہ! ہماری لغزشوں کو معاف کر دے"۔ ہم تمہاری غلطیوں کو ضرور معاف کر دینگے اور ہمارے احکام بجالانے اور ہماری ہدایات پر پوری طرح عمل کرنے والوں کو ہم اور بہت کچھ دینگے ﴿۵۸﴾ لیکن جنہوں نے زیادتی اور بے انصافی سے کام لیا انہوں نے اُس (دعا و التجا کے) لفظ کو جو انہیں بتایا گیا تھا ایک دُوسرے (گستاخی اور مضحکہ کے) لفظ سے تبدیل کر دیا لہٰذا جنہوں نے بے انصافی اور زیادتی کی تھی اُن پر ہم نے آسمانوں سے عذاب نازل کیا۔ (اور وہ طاعون میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئے) کیونکہ وہ نافرمانی اور زیادتی کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ﴿۵۹﴾ ع ۶ اور اس امر واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ نے اللہ سے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا۔ ہم نے کہا کہ اپنے عصا کو پتھر پر مار۔ سو (اُس کا عصا سے پتھر کو مارنا تھا کہ) اُس میں سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ کر بہنے لگے۔ (اور یہود کے بارہ ہی قبیلے تھے۔) ہر ایک قبیلہ نے اپنا اپنا گھاٹ نشان کر لیا (ہم نے اُن سے کہا کہ لو) اللہ کے رزق کو کھاؤ اور پیو اور روئے زمین پر فساد نہ کرتے پھرو ﴿۶۰﴾ اس کے بعد تم وہ واقعہ بھی یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم سے ایک ہی کھانے (منّ اور سلویٰ) پر صبر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اپنے رب سے کہہ کہ وہ ہمارے لئے (اس صحرا میں) وہ چیزیں اگا دے جو زمین میں اُگتی ہیں مثلاً سبزیاں ترکاریاں، ککڑیاں کھیرے، گیہوں، دال

اور پیاز۔ موسیٰؑ نے کہا کہ کیا تم اُس چیز کے بدلے جو بہت بہتر ہے وہ چیز لینا چاہتے ہو جو بہت
ادنیٰ ہے (چنانچہ جب انہوں نے اپنے مطالبہ پر اصرار کیا۔ تو موسیٰؑ نے کہا کہ اچھا) تم کسی شہر
میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں وہی کچھ ملیگا جو تم مانگتے ہو اور (اس دن سے) ذِلّت اور محتاجی کا ٹھپّہ
اُن پر لگا دیا اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ٹھہر گئے۔ یہ ذِلّت و محتاجی کا ٹھپّہ اُن پر اس لئے لگا
اور غضب کے مستحق اِس لئے ہوئے کہ انہوں نے پے در پے اللہ کے احکام کو ماننے سے انکار
کیا اور کئی نبیوں کو بلا حقِ شرعی جان سے مار دیا۔ یہ کفر و انکار اور یہ قتل انبیاء کا ارتکاب اُن
سے اسلئے ہوا کہ انہوں نے پے در پے نافرمانیاں کیں اور حد سے گذرنے کے عادی ہو چکے
تھے۔ ؏ (۶۱) اس بات کو خوب یاد رکھو کہ جو لوگ مسلمان[۱] ہوئے ہیں اور جو یہودی بنے ہیں اور ؏

[۱] الذین آمنوا سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی فہرست مردم شماری میں نام لکھا دیا ہو جو مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہوں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہوں۔ اسی طرح الذین ھادوا سے مراد بھی وہ لوگ ہیں جو یہود کے گروہ میں شامل ہیں۔ مقصود اس آیت سے یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک گروہ بندیوں اور جماعتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اُس کے ہاں قدر جو کچھ بھی ہے وہ ایمان و عمل کی ہے محض مسلمان کہلا لینے یا یہود میں شامل ہو جانے سے نجات نہیں مل سکتی۔ جب تک ایک سچے مسلمان، یا ایک سچے یہودی کا ایمان دل میں موجود نہ ہو اور وہ عمل نہ کئے جائیں جن کا مطالبہ ایمان کرتا ہے گو اس مقام پر روئے سخن تمام تر یہود کی طرف ہے مگر قرآن پاک کی تعلیمات خواہ وہ اشارہ کنایہ میں ہوں خواہ بالتصریح اور خواہ وہ "حدیث دیگراں" کی شکل میں ہوں خواہ براہِ راست مسلمانوں پر فرض ہے کہ اُن پر عمل پیرا ہوں۔

اِس آیت اور اس قسم کی اور متعدد آیات میں جو قرآن پاک میں آئی ہیں یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اللہ کا کسی گروہ کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ نہ نجات پر کسی قوم کا اجارہ ہے کوئی شخص مجرد اس بنا پر کہ وہ فلاں قوم میں پیدا ہوا ہے یا فلاں جماعت سے منسوب ہے کسی خاص اور امتیازی برتاؤ کا حق نہیں رکھتا۔ خدا کی نگاہ میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ کوئی قوم نہ بجائے خود مقبولِ بارگاہ ہے اور نہ کوئی قوم صرف اِس لئے راندۂ درگاہ ہے کہ فلاں نام سے موسوم اور فلاں طبقہ سے منسوب ہے۔ خدا کے ہاں اصل وزن انتسابات اور قومیتوں کا نہیں ہے بلکہ اصول اور حقائق کا ہے۔ سچے دل سے ایمان لاؤ گے اور نیک عمل کرو گے تو اچھا بدلہ پاؤ گے اور اگر ایمان و عمل صالح سے خالی رہو گے۔ تو کوئی چیز تمہیں بُری جزا سے نہ بچا سکے گی خواہ تم کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہو ؛

Registered No. L. 4584

مارچ ۱۹۳۲ء ۸۶ھ جلد ۳

ماہنامہ

پیغامِ حق

اصلاحی اور اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا ذخیرہ

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم ۔ اے

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ ۔ لاہور

قیمت سالانہ چار روپے قیمت فی پرچہ چھ آنے

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے — رؤسا سے چھ روپے

پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

جلد ۶	مارچ ۱۹۴۲ء	عدد ۳

سید محمد شاہ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق"
ظفر منزل۔ تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

پیغام حق کا اجراء ۱۹۳۹ء میں جب عمل میں آیا، تو میرے محترم دوست پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے مجھ سے پورا پورا تعاون کرنے کا یقین دلایا تھا مگر افسوس کہ ۱۹۴۰ء سے ادھر وہ اپنے مواعید کو پورا نہ کر سکے۔ الحمدللہ کہ اب انہوں نے ہمت کر کے پھر پورے انہماک اور توجہ کے ساتھ "پیغام حق" کا پیغام مسلمانوں تک پہنچانے کے لئے تہیہ کر لیا ہے جس کی پہلی قسط ہدیۂ ناظرین ہے۔ آئندہ سے انشاء اللہ العزیز یہ سخنہائے گفتنی لازمی طور پر پروفیسر صاحب موصوف ہی لکھا کریں گے۔ (محمد شاہ)

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسٹر گاندھی "نور نہانی" کی بدولت، فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہو چکے ہیں اور اسی لئے اُن کے "بھگت" انہیں "مہاتما" کے شاندار لقب سے پکارتے ہیں۔ لیکن سعی بلیغ کے باوجود ہمیں آج تک مسٹر موصوف کی زندگی میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی جس سے "بوئے کچوری" نہ آتی ہو۔ موصوف اپنی رفتار اور گفتار، افکار اور کردار غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں خالص ہندو اور سخت متعصب ہندو نظر آتے ہیں۔

سوال ہوگا کہ پھر وہ کیا شے ہے جو گاندھی جی کو مونجے سے جدا کر سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مونجے اور ساورکر وغیرہما کا ظاہر و باطن دونوں یکساں ہیں۔ وہ جس طرح دل سے مسلمانوں کے دشمن ہیں، اس طرح زبان سے بھی دشمنی کا اعلان کرتے ہیں۔ لیکن مسٹر موصوف چونکہ "مہاتما" ہیں اس لئے دل میں کچھ اور رکھتے ہیں اور زبان پر کچھ اور لاتے ہیں۔ دراصل اسلام دشمنی میں آپ کسی مالویہ، مونجے یا ساورکر سے کمتر نہیں ہیں لیکن زبان سے اسلام دوستی کا اقرار کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ مسلمان جو موجودہ زمانہ میں قوموں کی بنیاد اوطان پر رکھتے ہیں، یہ کہہ کر اپنے نفوس

کو فریب دے سکیں کہ مہاتما جی مسلمانوں کے دوست ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں جب الہ آباد کے ایک مشہور کشمیری برہمن کی لڑکی نے، ایک مسلمان سے شادی کرنے کا ارادہ کیا، یہ بدقسمت نوجوان اُس انگریزی اخبار کا اڈیٹر تھا جسے لڑکی کے باپ نے اپنے روپیہ سے جاری کیا تھا، تو مسٹر گاندھی نے علی برادران سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے اس "گئو ھتیا" کو نہ روکا تو دھرتی اور آکاش دونوں میں تصادم واقع ہو جائے گا اور ہندو مسلم اتحاد، جس پر سوراج کا انحصار ہے، گوگرد احمر کی صورت اختیار کر لیگا۔

لیکن جب ۱۹۳۵ء میں عباس طیب جی کی پوتی نے شنکر لعل کے فرزند سے پریم دیوتا کی آگیا انوسار، خالص ویدک ریتی کے انداز میں "وواہ" کر لیا تو اُسی گاندھی نے اس پوتر جوڑے کو اپنی آشیرواد سے بھرپور کر دیا۔

محترمی ظفر علی خاں صاحب نے اس واقعہ کو چند اشعار میں نظم کیا تھا جنہیں ناظرین کی عبرت اندوزی کے لئے درج کرنا چاہتا ہوں ؎

مسلماں ہو کے شنکر لعل کے بیٹے کے گھر آئی — دیا ایشر کی ہے عباس طیب جی کی پوتی پہ
مسلماں کا پھٹا تہمد نہ کچھ بھی اُس کے کام آیا — نچھاور ہو گئی شرعِ نبیؐ زنّار دھوتی پہ
حسین احمد سے کہتے ہیں مدینہ کے خزف ریزے — کہ لٹو ہو گئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پہ

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر کوئی ہندو لڑکی، کسی مسلمان سے شادی کا ارادہ کرے تو مہاپاپ ہے اور اگر کوئی مسلمان لڑکی، کسی ہندو سے شادی کرلے تو مہاپُن ہے!

کیا گاندھی جی کی فرقہ پرستی کو ثابت کرنے کے لئے کسی اور مثال کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو تازہ ترین مثال ۱۵ مارچ کے ٹریبیون سے مل سکتی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا، مالابار میں، ایک کانگرسی ہندو نوجوان گوپالن نمبیار نامی نے ایک سیاسی جلسہ میں، عوام کو بھڑکایا کہ پولیس

سب انسپکٹر کو، جو اس جلسہ میں موجود ہے، قتل کر دو۔ چنانچہ عوام کالانعام نے، اس مہا پرش کے فرمان کے مطابق، اس سرکاری افسر کا اُسی جگہ خاتمہ بالخیر کر دیا۔ یعنی دیش بھگتی بذریعہ تشدد!

عدالت عالیہ مدراس نے مسمی گوپالن نمبیار مذکور کو، بجا طور پر پھانسی کی سزا دی تاکہ قانون کا منشا پورا ہو سکے اور آئندہ کسی شخص کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ عوام کو قتل و غارت پر برانگیختہ کر سکے۔

لیکن مسٹر گاندھی کو، جو فرقہ پرستی سے بالاتر ہیں آہنسا کے دیوتا ہیں، اور نظریۂ عدم تشدد کے پجاری ہیں ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ چنانچہ موصوف نے ۵ مارچ کے "ہریجن" میں لکھا ہے کہ

"گوپالن نمبیار ایک محب وطن نوجوان ہے۔ اُس نے جوش میں آکر، مجمع کو اسسٹنٹ انسپکٹر پولیس پر حملہ کرنے کی ترغیب دی چنانچہ اس حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسر مذکور ہلاک ہو گیا۔ مدراس ہائیکورٹ نے، نوجوان مذکور کو پھانسی کی سزا دی ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ بربنائے شہادت یہ سزا درست ہے لیکن اس جرم کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ حکومت کو اس سزا میں تخفیف کر دینی چاہیے ملزم نمبیار نے بیشک افسر کو قتل کرنے کی ترغیب دی لیکن ذرا حالات حاضرہ پر بھی تو نگاہ کرو۔ ہم لوگ آج ایسے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جبکہ قتل کا، کاروبار ہول سیل پیمانہ پر ہو رہا ہے، اور روزانہ قتل کے صدہا واقعات ایسے رونما ہوتے رہتے ہیں، جو قانون کی دسترس سے بالاتر ہیں پس میری رائے میں، ایک نوجوان کو ایک ایسے جرم کی پاداش میں، جس کے ارتکاب میں ذاتی دشمنی اور عداوت ([illegible]) کا نام نشان تک نہ ہو، پھانسی کی سزا دینا، قانون کے ساتھ سراسر استہزاء کرنا ہے۔ اندریں حالات میں بہت خوش ہوں کہ اخبارات اور رہنمایان رائے عامہ دونوں اس امر میں کوشاں ہیں کہ سزا میں تخفیف ہو جائے۔" (بحوالہ ٹریبیون ۱۶ مارچ ۱۹۴۲ء)

یہ ہیں وہ جذبات اور خیالات جو مسٹر گاندھی نے، ایک قاتل سے متعلق، بذریعہ الفاظ سپرد قلم کئے ہیں، ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ یہ وکالت یا حمایت اچھا ہے یا بیجا، سوال یہ ہے کہ جب ۱۹۲۸ء میں میاں علم الدین شہیدؒ نے ایک شاتم رسول ﷺ کو قتل کیا تھا تو اس وقت مسٹر گاندھی کے دل میں اس مرحوم کے لئے ہمدردی کا جذبہ کیوں پیدا نہ ہوا؟ مرحوم نے بھی، راجپال کو کسی ذاتی دشمنی یا عداوت کی بنا پر قتل نہیں کیا تھا۔ مزید براں یہ کہ گوپالن نمبیار نے ایک ایسے شخص کو قتل کرایا جس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا، اور شہید موصوف نے ایسے شخص کو قتل کیا تھا جس نے اتنا بڑا جرم کیا کہ ایک مسلمان کی نظر میں اس سے بڑا اور کوئی

جرم متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس نے مسلمانانِ عالم کی دل آزاری کی تھی۔

علم الدین کی حمایت تو کجا، مسٹر گاندھی نے راجپال کے اس فعل پر اس کی مذمت تک نہیں کی۔ اس کے معنی صاف یہ نکلتے ہیں کہ مسٹر گاندھی اپنے درجے کے فرقہ پرست ہیں۔ افسوس گاندھی جی کی اس ذہنیت پر نہیں کیونکہ ہندو بہرحال ہندو یعنی دشمن ملت ہے افسوس اگر ہے تو اُن مسلمانوں پر جو ان حقائق ثابتہ کی موجودگی میں بھی گاندھی جی کو "روحانیت کا بادشاہ" کہتے ہیں اور ان کی رہنمائی پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔

چہ گویمت ز مسلماں نامسلمانے جز این کہ پور خلیلؑ است و آذری داند (اقبالؒ)

جاوید نامہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی وہ تصنیف ہے جس کا شمار ادبیات عالم میں ہوتا ہے اور بلاشبہ اس کتاب میں اُن کا فلسفیانہ تخیل، کمال کے اس نقطہ پر پہنچ گیا ہے جس سے بالاتر مقام باعتبار فن کسی غیر نبی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ میں ایک عرصے سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا کہ اس لازوال اور عدیم المثال علمی کارنامہ کو مسلمانوں سے روشناس کرایا جائے الحمدللہ کہ اس ضرورت کو ایک ایسے بزرگ نے پورا کر دیا، جن کو دینی علوم سے بھی بہرۂ وافر حاصل ہے اور جن کے دل میں ملت کا درد بھی موجود ہے۔ میری مراد مولینا مولوی محمد صبغۃ اللہ صاحب بختیاری مدظلہ سے ہے جو جامعہ دارالسلام عمرآباد (مدراس) میں شیخ الحدیث ہیں، اور حکیم الامت کے کلام سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شرح جاوید نامہ کو سریع الفہم بنا دینے کے علاوہ، اقبال کے پیغام کو متعارف بھی کر سکے گی۔ جنوری کے پرچہ میں اس کا ابتدائی حصہ شائع ہو چکا ہے۔ باقی انشاء اللہ العزیز آئندہ درج کیا جائے گا

ناظرین، اُس پاکیزہ تحریک سے ناواقف نہ ہوں گے، جو حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی نے ۱۸۲۱ء میں شروع کی تھی۔ اس تحریک کا مقصد وہی تھا جس کے حصول کے لئے، آج بھی ہر سچے مسلمان کا دل نعل در آتش بنا ہوا ہے۔

زمانہ کی ستم ظریفی اور مسلمانوں کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ شعبدہ بازانِ فرنگ کی سحر کاریوں کی بدولت، حضرت مجددؒ کی شخصیت اور ان کی تحریک دونوں، عامۃ المسلمین کی نظر میں، قابل اجتناب بن کر رہ گئیں اور جاہل مسلمان آپ اور

آپ کی تحریک سے واقف نہ ہو سکے۔ برطانی مصنفین نے حضرت موصوف اور ان کی اسلامی تحریک کو نہایت مکروہ انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگرچہ اب ہمارے زمانہ میں، یہ طلسم باطل ہو چکا ہے اور خاک پاک بالاکوٹ کے ذرات نے بذریعہ اسکی اپنا پیغام نوجوانوں کو پہنچانا شروع کر دیا ہے تاہم ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر کی مشہور کتاب " دی انڈین مسلمانز اینڈ دی برٹش گورنمنٹ"، کے مضامین کا ترجمہ شائع کرنا بے محل نہ ہوگا، تاکہ اگر ایک طرف ناظرین کو یہ معلوم ہو سکے کہ انگریز، اس تحریک کو کیا سمجھتے تھے، تو دوسری طرف گذشتہ صدی کے مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ بھی ہو سکے کہ اُن کی خودی، چونکہ اس وقت تک تعلیم کے تیزاب میں نہیں ڈالی گئی تھی اس لئے اسلام کی محبت اُن کے دلوں سے محو نہیں ہوئی تھی۔ یہ کتاب ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے جو بنگال میں انڈین سول سروس کے ایک معزز رکن تھے ۱۸۷۱ء میں سول سروس والوں کی رہنمائی کے لئے لکھی تھی۔ چونکہ اس کتاب میں ایسی معلومات ہیں جن سے ہم مسلمان بھی بہت کچھ درس عبرت حاصل کر سکتے ہیں اس لئے اس کا اُردو ترجمہ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایس لاہور نے لکھا ہے اس کتاب میں چار باب ہیں پہلے باب میں مجاہدین سرحد کی مختصر تاریخ اور اُن کے حالات درج ہیں۔ اگرچہ مجاہدین کے لئے ولیم ہنٹر نے باغی کا لفظ استعمال کیا ہے مگر اس باب میں مجاہدین کی مساعیٔ جمیلہ کے صحیح صحیح حالات بہت حد تک آ گئے ہیں۔ اس پرچہ میں صرف باب اول درج کیا جاتا ہے۔ آئندہ ماہ انشاء اللہ العزیز باب دوم درج کریں گے۔

میرے رفیق کار اور محترم دوست سید محمد شاہ صاحب نے کچھ عرصہ ہوا قرآن مجید کا ترجمہ لکھا تو جو پیکو لمیٹڈ نے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ بفضلِ خدا بہت مقبول ہوا، اور میں علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اس ترجمہ کی بدولت اکثر مسلمانوں کو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔ لیکن سید صاحب موصوف اسے مسلسل مطالعہ کی بنا پر یہ محسوس کیا کہ دراصل کلام اللہ کا لفظی ترجمہ تقریباً ناممکن ہے اور اس خیال نے مجبور کیا کہ، افضال الٰہی کے اس بحر بے پایاں میں دوبارہ غوطہ لگائیں اور حقائق و معانی کے آبدار موتی

نکال کرلائیں۔ یعنی قرآن مجید کی آیات کے مفہوم کو، اپنی بساط کے مطابق، اپنے الفاظ میں ادا کردیں۔

راقم الحروف نے پہلے پارہ کا ترجمہ دیکھا ہے، اس میں تین خوبیاں بہت نمایاں ہیں۔

اولاً ترجمہ سلف صالحین کے مسلک کے مطابق ہے کسی جگہ یہ کوشش نہیں کی گئی ہے کہ کلام اللہ کو اپنے مزعومات کے سانچہ میں ڈھالا جائے۔

ثانیاً عبارت نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے، اس لئے اُس کا مفہوم بآسانی ذہن نشین ہوتا جاتا ہے اور آگے پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

ثالثاً کلام اللہ کا مفہوم اس نہج پر پیش کیا گیا ہے کہ نہ صرف متن کا منشا، مفہوم واضح ہوجاتا ہے بلکہ پڑھنے والا، تفسیروں کے مطالعہ سے بھی، بڑی حد تک بے نیاز ہوجاتا ہے

میں اس اہم نکتہ کو، مثال دے کر واضح کردوں۔

عام طور سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے "سب تعریفیں اُس اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار سب جہانوں کا ہے وہ رحمٰن اور رحیم ہے"، لیکن شاہ صاحب نے یوں لکھا ہے "تمام حمد وثنا اور ہر قسم کی تعریف وتوصیف کے لائق اللہ ہی کی ذات ہے اور وہی اس کا مستحق ہے کیونکہ صرف وہی تمام مخلوقات کا رازق اور مربی اور نگہبان ہے۔ اس کے انعامات واکرامات اور فیضان ورحمت کا حلقہ اس قدر وسیع ہے جس کی انتہا نہیں ہے۔ وہ ہر لحظہ اور ہر آن، تازہ بتازہ نو بنو، احسانات کرتا رہتا ہے اور یہ انعامات واکرامات عارضی نہیں، بلکہ مستقل اور دائمی ہیں۔"

یعنی اس ترجمہ سے رب الرحمٰن اور رحیم تینوں اہم اسمائے صفات کا مفہوم واضح ہوگیا۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ کلام اللہ کے مطالعہ میں، ذوق وسرور اُسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جبکہ قاری، مفہوم سے آگاہ ہوسکے۔

التزام یہ کیا گیا ہے کہ اس ترجمہ یعنی "مطالب القرآن" کو بالاقساط "پیغام حق" میں شائع کیا جائے۔ اس پرچہ میں اس ترجمہ کی دوسری قسط ہدیۂ ناظرین ہے پہلی قسط جنوری وفروری ۱۹۷۷ء کے مشترکہ پرچہ میں ملاحظہ

فرمائیں امید ہے کہ ناظرین اس قیمتی ترجمہ سے کما حقہٗ استفادہ کریں گے۔ سردست بہت مختصر حواشی پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن میرا ارادہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ ترجمہ مکمل ہو جائے گا، تو میں شاہ صاحب سے ضروری اور اہم مقامات پر تفسیری نوٹ لکھوا دوں گا تاکہ یہ چیز اپنی جگہ مکمل ہو جائے۔

میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ماہ سے رسالہ میں باب التقریظ والانتقاد کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا جائے۔ اس باب میں، ہر ماہ کسی ایک مشہور علمی کتاب پر تفصیلی تبصرہ لکھا کروں گا۔ یہ تبصرہ "ریویو" سے مختلف چیز ہوگی۔ جیسا کہ ناظرین کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ جو پبلشر حضرات اپنی کتابوں پر تبصرہ کے خواہشمند ہوں وہ بخوشی اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کتاب بھیجنے کا پتہ:- (پروفیسر سلیم چشتی ۴۷، ٹمپل روڈ، لاہور)

ندوۃ العلماء کے ایک قابل احترام پروفیسر سید ابوالحسن علی صاحب نے جو سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ہیں، ایک کتاب موصوف کے حالات اور سیرت میں "سیرت سید احمد شہید" کے عنوان سے شائع کی ہے۔ ہمارے خیال میں جو حضرات سید موصوف اور اُن کے مجاہد متبعین کے کارناموں سے واقف ہونا چاہیں اُنہیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ سید صاحب ممدوح کے حالات آج اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی معلوم نہیں۔ یہ کتاب دفتر اقبال اکیڈمی سے بھی مل سکتی ہے۔ قیمت ۲ روپے محصول ڈاک ۵ر

ہندوستانی مسلمان اور انگریزی حکومت

(از ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر)

باب اوّل

[مجاہدینِ سرحد کی مختصر تاریخ، سید احمد بریلوی کی مساعی، اور ہندوستانی مسلمانوں کا انگریزی حکومت سے غیر مطمئن ہونا]

بنگال کے مسلمان ایک دفعہ پھر عجیب کش مکش میں مبتلا ہیں۔ سالہا سال سے سرحد کے مجاہدین کی آبادی ہماری سرحد پر چھاپے مار رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً وہ متعصب لوگوں کے گروہ بھیج دیتی ہے جو ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور ہمارے گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہماری فوج کو اُن کے ساتھ تین تباہ کن لڑائیاں لڑنی پڑی ہیں۔ اس مخالف نو آبادی کے لئے نہایت ہی منظم طریقہ پر بنگال میں آدمی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے مختلف سازشی مقدمات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ سازش کا یہ جال ہمارے تمام صوبوں میں پھیلا ہوا ہے اور پنجاب سے پرے کا غیر آباد کوہستانی علاقہ گرم ملک کی اُن دلدلوں سے جہاں پر دریائے گنگا سمندر میں جا گرتا ہے اِس قسم کے مسلسل سازشی اداروں سے ملا ہوا ہے۔ اُن سے ایسے سازشی اداروں کا پتہ بھی چلا ہے جو گنگا کے[1] دہانے سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ روپیہ اور آدمی حاصل کرتے ہیں اور اُن کو ہماری جرنیلی سڑک پر منزل بمنزل گزارتے ہوئے باغی کیمپ میں پہنچا دیتے ہیں جو یہاں سے دو ہزار میل کی مسافت پر واقع ہے۔ بڑے بڑے ذہین اور دولت مند اشخاص اس سازش میں حصہ لے رہے ہیں۔ روپیہ پہنچانے کے

[1] یعنی جنوبی بنگال۔

طریقے کو جو باغیانہ سازش کا ایک نہایت ہی خطرناک کام ہے کمال ہشیاری سے ایک بے ضرر مہاجنی کاروبار کا رنگ دے دیا گیا ہے۔

جو مسلمان زیادہ متعصب ہیں وہ تو کھلم کھلا بغاوت میں حصہ لے رہے ہیں اور باقی تمام مسلمان علانیہ جہاد کی فرضیت پر بحث میں مصروف ہیں۔ گذشتہ نو ماہ سے بنگال کے سرکردہ اخبارات نے اس بحث پر کالم کے کالم سیاہ کر دیئے ہیں کہ مسلمانوں پر ملک کے خلاف بغاوت کرنے کا فرض عاید ہوتا ہے یا نہیں سب سے پہلے شمالی ہندوستان کے علماء کا متفقہ فتویٰ شائع کیا گیا۔ اس کے بعد بنگال کے مسلمانوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ شائع کیا۔ اور شیعہ جماعت بھی جو ہندوستان میں بہت ہی اقلیت میں ہے کچھ نہ کچھ شائع کرنے سے گریز نہ کر سکی۔ کچھ مہینے تو ہمارے انگلو انڈین اخبارات اُن چند وفادار مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے رہے جو بڑی سرگرمی سے اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں سرگرداں تھے کہ اگر ہم نے ملک کے خلاف بغاوت نہ کی تو کیا ہم اپنی روح کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ مگر علماء اور فقہاء کے متفقہ فتوے کی تمام اشاعت کے بعد ہمارے ہموطنوں پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ یہ مسئلہ مذاق ہی مذاق نہیں بلکہ ایک خطرناک پہلو بھی رکھتا ہے۔ وہ متعلقہ کاغذات جو خود مسلمانوں نے شائع کئے ہیں اس بات کا صاف صاف پتہ دے رہے ہیں کہ اس وقت ہماری ہندوستانی سلطنت ایک نہایت ہی خطرناک دور سے گزر رہی ہے۔

اس شائع شدہ مواد سے ہر عقلمند آدمی کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ مسلمانوں کا نڈر طبقہ تو کئی سال سے کھلم کھلا بغاوت میں حصہ لے رہا ہے اور باقی تمام قوم ایک نہایت ہی اہم ملکی مسئلہ میں پریشان ہو رہی ہے "بغاوت کے فرض" کو باقاعدہ طور پر اور علی الاعلان شریعت اسلامی کا ایک اہم قانونی مسئلہ بنا لیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان مجبور ہو گیا ہے کہ اپنے عقیدہ کا اظہار کرے اور اپنے ہم مذہبوں کے سامنے کھلم کھلا بتلائے کہ وہ سرحد پار کے باغی کیمپ میں کچھ نہ کچھ حصہ لیگا یا نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اپنے متعلق قطعی فیصلہ کرے کہ آیا اسے ایک سچے مجاہد مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنا ہے یا ملکہ معظمہ کی پُرامن رعایا کی حیثیت سے مسلمانوں نے کسی قطعی فیصلہ پر

پہنچنے کے لئے صرف ہندوستان کے علماء ہی کے فتوؤں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ مکہ معظمہ کے علماء تک بھی پہنچے ہیں اور کچھ مہینوں تک تو مسلمانان ہندوستان پر بغاوت کرنے یا نہ کرنے کے فرض کا تصفیہ مکہ معظمہ کے تین اہل سنت وجماعت علماء کے فتوے پر منحصر رہا۔

میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر اپنی مسلمان رعایا کی اس مضطربانہ کیفیت سے بحث کروں جس نے تین صورتیں اختیار کر رکھی ہیں

میں اُن واقعات کا جن کی وجہ سے ہماری سرحد پر باغیوں کی نوآبادی قائم ہوئی اور اُن خوفناک نقصانات میں سے بعض کو بھی جو اس کی وجہ سے سلطنت برطانیہ کو برداشت کرنا پڑے قارئین کے سامنے مجملاً بیان کروں گا۔ اور دوسرے باب میں باغیوں کی اس تنظیم کا ذکر کروں گا جس کے ذریعہ سے باغی کیمپ نے ہماری سلطنت کے اندرونی اضلاع سے آدمی اور روپیہ مسلسل طور پر حاصل کیا۔ پھر میں اُن شرعی مباحث کی تفصیل بیان کروں گا جن کی بنا پر تشویشناک حالات رونما ہوئے۔ یہ وہ مباحث تھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عام طبقہ کس پرجوش طریقہ پر باغی پیشواؤں کی زہر آلود تعلیم سے متاثر ہو رہا ہے اور کس طرح مسلمانوں کا ایک طبقہ جو تعداد میں بہت ہی کم ہے فرض جہاد سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لئے شریعت مقدسہ میں عجیب و غریب تاویلیں پیش کر رہا ہے۔ لیکن اگر میں صرف اسی پر بس کر دوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ میں نے پوری بات بیان نہیں کی۔ مسلمانانِ ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصہ پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور اُن تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے اپنے لئے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چوتھے باب میں مسلمانوں کی اُن شکایات کو جو انہیں انگریزی عہد حکومت میں پیدا ہوئی ہیں معلوم کروں اور اُن کی واقعی شکایات کو بیان کروں اور ساتھ ہی اُن کے رفع کرنے کے طریقوں پر بھی روشنی ڈالوں۔

سرحد پر باغی کیمپ کے بانی مبانی سید احمد[1] تھے۔ وہ ان بیباک اور باہمت نوجوانوں میں سے تھے جو نصف صدی قبل پنڈاری قوت کے استیصال کے بعد تمام ہندوستان میں بکھر گئے تھے۔ سید صاحب نے اپنی زندگی اس مشہور لٹیرے[2] کی فوج میں ایک سوار کی حیثیت سے شروع کی جس نے مالوہ کے افیم پیدا کرنے والے دیہات کو مدتوں تک تاخت وتاراج کیا تھا۔ مگر رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی قوت نے جس سختی کے ساتھ اپنے مسلمان ہمسایوں کو دبائے رکھا اس سے مسلمان لٹیروں کا کام بہت ہی خطرناک اور غیر منفعت بخش ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ مہاراجہ مذکور کے ہندوانہ مذہبی تعصب نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے جوش وخروش کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ سید احمد نے نہایت دانشمندی سے اپنے آپ کو زمانہ کے مطابق بدل دیا۔ انہوں نے قزاقی کا پیشہ ترک کر دیا اور ۱۸۱۶ء میں احکام شرعیہ پڑھنے کے لئے دہلی جاکر ایک جید عالم[3] کی شاگردی قبول کی۔ اور پھر تین سال کی اس طالب علمانہ حیثیت کے بعد ایک مبلغ کی زندگی اختیار کی۔ انہوں نے پرزور طریقہ پر ان بدعات کے خلاف جہاد شروع کیا جو مسلمانان ہند کے اسلامی عقائد میں داخل ہو چکی تھیں اور اس طرح پرجوش اور حوصلہ مند لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا۔ ان کی تبلیغ کا پہلا مرکز روہیلوں کی قوم تھی[4] جن کو صفحہ ہستی سے نابود کرنے کے لئے ہم نے محض دولت کے لالچ میں اپنی فوجیں عاریتاً دوسروں کو دے دی تھیں۔ اور جس کی افسوسناک تاریخ وارن ہسٹنگز کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا بدنما داغ ہے۔ ان کی اولاد گذشتہ نصف صدی سے متواتر اس کا انتقام لیتی چلی آ رہی ہے اور اس وقت بھی سرحد کے باغی کیمپ کو اس کے بہترین شمشیر زن مہیا کر رہی ہے۔ روہیلوں کے معاملہ میں بھی اور ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ہم نے مظالم کئے ہیں ہم نے جیسا بویا تھا ویسا ہی کاٹا ہے ۱۸۲۰ء میں اس مجاہد نے آہستہ آہستہ اپنا سفر جنوب کی طرف شروع کیا۔ ان کے مرید ان کی روحانی فضیلت کو

---

[1] آپ رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء کے مقدس مہینہ محرم میں پیدا ہوئے۔ [2] امیر خاں پنڈاری نواب آف ٹانک۔ مغربی اقوام کا یہ خاصہ ہے کہ ہر محب وطن اور آزادی خواہ کو پہلے لٹیرے کے ہی لقب سے یاد کرتی ہیں۔ مترجم

[3] شاہ عبدالعزیز صاحب۔ [4] روہیلکنڈ میں رام پور کے قریب فیض اللہ خاں کی جاگیر ہیں۔

تسلیم کرتے ہوئے اُن کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام کو بخوشی سرانجام دیتے تھے۔ اور صاحب جاہ اور علماء عام خدمتگاروں کی طرح اُن کی پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا اپنے لئے فخر سمجھنے لگے۔ پٹنہ میں طویل قیام کے بعد ان کے مریدوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت پیش آگئی۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے ایجنٹ مقرر کئے تاکہ ہر اُس شہر سے جو اُن کے راستے پر پڑتا ہو تجارت کے منافع پر ٹیکس وصول کریں اس کے بعد انہوں نے چار خلیفے مقرر کئے[1] یعنی روحانی نائب اور ایک قاضی القضاۃ مقرر کیا اور اس کے لئے ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا جیسا کہ مسلمان پادشاہ صوبجات میں اپنے گورنر مقرر کرتے وقت جاری کیا کرتے تھے۔ اس طرح پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد انہوں نے دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ کلکتہ کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں لوگوں کو سلسلہ مریدی میں داخل کرتے جاتے اور بڑے بڑے شہروں میں اپنے نائب مقرر کرتے جاتے تھے۔ کلکتہ میں اُن کے اردگرد اس قدر ہجوم جمع ہو گیا تھا کہ لوگوں کو مرید کرتے وقت اپنے ہاتھ پر بیعت کرانا اُن کے لئے مشکل تھا بالآخر انہیں اپنی پگڑی کو کھول کر یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہر وہ شخص جو اس کے کسی حصہ کو چھوئے گا وہ اُن کا مرید ہو جائے گا۔ ۱۸۲۲ء میں وہ حج کرنے کی غرض سے مکہ معظمہ چلے گئے اور اس طرح پر اپنی گذشتہ سوانح حیات کو جو بحیثیت ایک قزاق کے گذاری تھی حاجی[2] کے مقدس لباس میں چھپا کر اگلے سال ماہ اکتوبر میں بمبئی وارد ہوئے۔ یہاں پر بھی آپ کی تبلیغی کوششوں کو وہی کامیابی حاصل ہوئی جو کلکتہ میں ہوئی تھی۔ مگر اس لٹیرے دل کے لئے انگریزی علاقہ کے پُرامن شہریوں کے بجائے ایک اور زیادہ موزوں میدان موجود تھا انہوں نے شمالی ہند کو واپس ہوتے ہوئے اپنے وطن مالوف ضلع رائے بریلی میں بہت سے سرکشوں کو اپنا مرید بنا لیا[3]۔ اور ۱۸۲۴ء میں سرحد پشاور کے وحشی اور پہاڑی قبیلوں میں آ نمودار ہوئے یہاں انہوں نے سکھ

---

[1] مولوی ولایت علی۔ مولوی عنایت علی۔ مولوی محرم علی اور مولوی فرحت حسین اور شاہ محمد حسین کو قاضی القضاۃ مقرر کیا۔

[2] انگریز مصنفین ایسے ایسے ناپاک اور گمراہ کن الفاظ جگہ بہ جگہ موزوں کرکے اپنی گندی ذہنیت کا ثبوت دینے کے عادی ہیں۔

[3] ان کو اُن کے قاضی القضاۃ شاہ محمد حسین نے مرید کیا تھا جو ہمیشہ آپ کو روپیہ اور رنگروٹوں سے مدد دیتا رہا۔

سلطنت کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کی تبلیغ شروع کر دی۔

پٹھانوں کے قبائل نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ اُن کی دعوت پر لبیک کہی۔ اسلامی قبائل میں جو زیادہ پُرجوش اور توہم پرست تھے وہ اس بات سے بہت خوش ہوئے کہ اُن کو اپنے ہندو ہمسایوں کو لوٹنے کے لئے ایک مذہبی بہانہ ہاتھ آگیا ہے۔ امام صاحب نے اُن لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ جو شخص غازی ہوگا وہ مال غنیمت سے مالامال ہوکر لوٹے گا اور جو میدان جنگ میں کام آئے گا وہ سیدھا جنت کو سدھارے گا۔ اور شہادت کا درجہ پائے گا۔ انہوں نے کابل اور قندھار کا سفر اختیار کیا اور جہاں کہیں بھی گئے ملک کو جہاد پر آمادہ کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لئے مختلف قبیلوں میں[1] اتحاد و اتفاق پیدا کیا۔ انہوں نے اُن کو لوٹ مار کا لالچ دیا اور ان کا دین یہ کہہ کر خرید لیا کہ میں تمام دنیا کے مشرکین یعنی سکھوں سے لے کر چینیوں تک کی بیخ کنی کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوں۔ انہوں نے کوہستان کے سمجھدار سیاسی لیڈروں اور قبائل کے دنیادار سرداروں کو ہمسایہ سکھ قوم کی بڑھتی ہوئی طاقت کی روک تھام کی طرف توجہ دلائی۔ راجہ رنجیت سنگھ کے عہد کی پرانی نفرت و حقارت ہمیشہ اُن کے پیش نظر رہی۔ اس طرح پر مذہبی احکام کی کامیابی کے لئے راستہ صاف کرنے کے بعد انہوں نے خدا کے نام پر ایک باقاعدہ فرمان جاری کیا جس میں تمام سچے مسلمانوں کو جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ اس عجیب و غریب دستاویز کو اس طرح شروع کیا گیا تھا۔

"سکھ قوم نے مدت سے لاہور اور دیگر علاقوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اُن کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا ہے اور ہزاروں کو بے عزت اور بدنام کیا گیا ہے۔ انہوں نے

---

[1] یوسف زئی اور بارک زئی آپ کے وفادار حامیوں میں سے تھے پنجتار کا نواب (فتح خاں) بھی اُن کے ساتھ مل گیا تھا۔ بعد میں سوات کی طاقتور ریاست بھی اُن کے ساتھ ہو گئی۔ انہوں نے اپنا اقتدار ریاست امب میں بھی کر لیا تھا۔ نواب ٹونک جو ان کا گذشتہ لیڈر تھا ہمیشہ روپے اور رنگروٹوں سے اُن کی مدد کرتا رہا۔

مساجد میں اذان کا دینا بند کر رکھا ہے اور گاؤ کشی کی قطعی ممانعت کر دی ہے۔ آخر کار جب اُن کا ظلم و تعدی ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گیا تو سید احمد علیہ الرحمۃ نے صرف اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر کہ دین اسلام کی حفاظت کی جائے، اپنے ساتھ چند مخلص مسلمانوں کو لے کر کابل اور پشاور کی راہ لی۔ اور وہاں پر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور اُن میں جرأت و ہمت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہزاروں مسلمانوں نے اُن کی دعوت پر لبیک کہی اور خدا کے راستے میں قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ پس ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو سکھوں کے خلاف جہاد شروع ہو جائے گا۔"

اس اثنا میں امام صاحب کے قاصدوں نے اس اعلان کو شمالی ہندوستان کے اُن بڑے بڑے شہروں میں پہنچا دیا جہاں پر انہوں نے اپنے مرید بنائے ہوئے تھے۔ یہ اعلان اُس رسالہ سے لیا گیا ہے جو صوبہ اودھ کے ایک دور افتادہ مقام سے شائع⁽¹⁾ ہوا۔

اس کے بعد سکھوں کے خلاف مذہبی جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں کبھی ایک فریق غالب آیا اور کبھی دوسرے فریق کو فتح نصیب ہوئی۔ دونوں طرف سے بے تحاشا قتل عام کیا گیا۔ مسلمان مجاہدین اور ہندو سکھوں کے درمیان نفرت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُن کا اظہار ضرب المثل اور مقامی روایات کی صورت میں ہونے لگا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی سرحدوں کو ایک ایسے قابل جرنیل کے ذریعہ مستحکم کر لیا تھا جو نپولین اعظم کی فوج کے منتشر ہونے کے بعد تمام دنیا میں پھیل گئے تھے۔ پشاور کے کسانوں کو ایک اطالوی قسمت کے مارے جرنیل اویطابلی (AVITALULI) کا نام اب تک یاد ہے⁽²⁾۔ مسلمان وقتاً فوقتاً پہاڑوں سے نکل کر میدانوں پر چھاپہ مارتے اور جہاں جاتے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے تھے۔ اُن کے مقابلے میں گاؤں کے بہادر سکھ مسلح ہو کر اُن کی مدافعت کرتے اور ان کوہستانی خونیوں کو اپنے پہاڑوں کی طرف بھگا دیتے پھر ہندوؤں

---

۱ رسالہ ترغیب الجہاد یعنی مذہبی جنگ پر اکسانا۔ اس کے مصنف قنوج کے ایک مولوی صاحب تھے۔ سرکاری روداد ۱۸۶۵ء

۲ میں نے اس جرنیل کا نام مقامی تلفظ کے مطابق دیا ہے۔

کی طرح ان کا تعاقب کرتے۔ اس وقت کے انتہائی جوش وخروش نے پٹہ داری کی ایک نہایت ہی خوفناک صورت چھوڑی ہے۔ یعنی پٹہ داری بعوضِ خون، چنانچہ سرحد کے ہندو اب تک بھی بڑے فخر کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ اُن کے گاؤں کی اراضیات حسین خیل قبیلے کے ایک سو سر سالانہ کی پٹہ داری پر دی گئی تھیں

باقاعدہ جنگوں میں مجاہدین کی بے ترتیب فوج سکھوں کی منظم سپاہ کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ ۱۸۲۷ء کو امام صاحب نے اپنے قبائل کے ساتھ اُن کے ایک ایسے کیمپ پر حملہ کر دیا جس نے خندق کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا تھا۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ اُن کو سخت جانی نقصان کے بعد پسپا ہونا پڑا مگر میدانی جرنیل کو فتحمندانہ تعاقب کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ متعصب گروہ دریائے سندھ کے پار اپنے پہاڑوں میں چلا گیا۔ اس طرح سے انہوں نے جنگ چپاول میں فتحمندی سے اپنا نام پیدا کر لیا۔ یہاں تک کہ سکھ حاکم اِس بات پر مجبور ہو گیا کہ اُن قبائل کی حمایت خریدے جو چھاپہ مارنے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ ۱۸۲۹ء میں تو حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ میدان والوں کو پشاور شہر کے متعلق بھی خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ جو سرحدی صوبہ کا دارالخلافہ تھا۔ وہاں کے صوبہ دار[1] نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے دغابازی سے امام صاحب کو زہر دینے کی کوشش کی۔ اس افواہ نے کوہستانی مسلمانوں کے جوش کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیا۔ وہ نہایت ہی جوش وخروش سے میدانی علاقوں پر ٹوٹ پڑے اور کفار کی تمام افواج کو تہ تیغ دیا اور اُس کے جرنیل کو مہلک طور پر زخمی کر دیا۔ صرف شہر پشاور ہی اُس فوج کی وجہ سے جو شہزادہ شیر سنگھ اور جرنیل وینچو (VENTUE) کی ماتحتی میں تھی بچ سکا۔ اب امام صاحب کا احاطہ اقتدار بڑھتے بڑھتے کشمیر تک جا پہنچا تھا۔ شمالی ہند کے غیر مطمئن شہزادوں کی فوج اُن کے کیمپ میں پہنچنے لگی تھی۔ رنجیت سنگھ نے جو سکھ ریاستوں کے وفاق کا سردار تھا ایک لشکر جرار اپنے قابل ترین جرنیلوں کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ جون ۱۸۳۰ء میں شکست کھانے کے باوجود امام صاحب کی فوج نے بہت بڑی قوت کے ساتھ میدانی علاقوں پر قبضہ کر

---

[1] یہ ایک مسلمان تھا اور رنجیت سنگھ کا پٹھو تھا۔

[2] اُس فوج سے جو جرنیل ایلدرڈ (ALDARD) اور ہری سنگھ نلوہ کی ماتحتی میں تھی۔

اور اسی سال کے اختتام سے پہلے خود پشاور کو بھی جو پنجاب کا مغربی دارالسلطنت تھا فتح کر لیا تھا۔

یہ زمانہ امام صاحب کی زندگی کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ انہوں نے اپنے خلیفہ اسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور اپنے نام کے سکے جاری کر دیے جن پر یہ عبارت کندہ تھی

"احمد العادل محافظ دین اسلام جس کی شمشیر کی چمک کافروں کے لئے پیغام اجل ہے"۔

پشاور کے چھن جانے کا غم رنجیت سنگھ کے بے نظیر سیاسی تدبر کو بروئے کار لایا۔ اس چالاک سکھ نے معمولی معمولی مسلمان ریاستوں کو اُن کے اپنے مفاد کا واسطہ دے کر اسلامی فوج سے علیحدہ کر دیا۔ اس صورت حالات کو دیکھ کر امام صاحب اس بات پر مجبور ہو گئے کہ فدیہ لے کر پشاور کو خالی کر دیں۔ اُن کے مریدوں کی آپس میں لڑائی نے تمام نظم و نسق برد بار کر دیا تھا۔ اُن کی باقاعدہ منظم فوج ہندوستانی مذہبی مجنونوں پر مشتمل تھی۔ جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے بھرتی کئے گئے تھے۔ اور جنہوں نے ہر حالت میں خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اُس کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا۔ اور جن کے لئے اب اُن کو چھوڑ جانا بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ اس اسلامی فوج میں سرحد کے سرکش پٹھان بھی شامل ہو گئے تھے۔ جو اپنی بہادری کے ساتھ ساتھ کوہستانی لوگوں کا سا تکبر اور لالچ بھی رکھتے تھے ایک موقع پر تو ان سرحدی قبائل میں سے ایک نے عین لڑائی کے وقت غداری کی[1]۔ اور بعد میں ان مذہبی مجنونوں نے اس کا انتقام بہت ہی سخت لیا تھا۔ امام صاحب نے اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ اُن کو بہت فیاضی سے کام لینا چاہئے کیونکہ وہ ہر وقت اُن پر اعتماد کر سکتے تھے سب سے پہلے تو اُن کی ضروریات کے لئے آمدنی کا دسواں حصہ وہ اپنے سرحدی مریدوں سے حاصل کرتے تھے۔ اور وہ اُس کو دین کی حفاظت کے لئے ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر کچھ پس و پیش کئے ساتھ ادا کرتے رہتے مگر جب فریقین میں اس قسم کے چندوں کی بنا پر مناقشت پیدا ہو گئی تو امام صاحب کے اقتدار میں فرق آنا شروع ہو گیا۔ ان کا اصلی جوہر آتش بیانی تھا اور وہ اس قابل نہ تھے کہ مختلف گروہوں پر غیر جانبدارانہ حکومت کر سکیں۔ وہ حیرت انگیز اقتدار

[1] بارک زئی پٹھانوں نے سیدو کے مقام پر جب سکھوں سے لڑائی ہوئی تھی۔

جو آپ کو سرحدی قبائل پر حاصل ہوا تھا اس کے زائل ہونے کے آثار بہت جلد پیدا ہو گئے۔ جب اُن کو اپنی قوت کے زائل ہونے کا خدشہ پیدا ہوا تو انہوں نے زیادہ سختی سے کام لینا شروع کر دیا اور آخر کار سرحدیوں کے نہایت ہی نازک جذبہ کو مجروح کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کے ورغلانے سے نہایت ہی غیر دانشمندانہ طور پر سرحدیوں کے شادی بیاہ کے رسم و رواج میں اصلاح شروع کر دی۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی لڑکی کو اُس شخص سے بیاہ دیتے ہیں جو سب سے زیادہ بولی دیتا ہے۔ اُن کے ہندوستانی مریدوں نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا اور بغیر بیویوں کے تھے۔ انہوں نے ایک حکم نافذ کر دیا کہ جو لڑکی بارہ دن کے اندر اندر بیاہی نہ جائے گی وہ ان کے مریدوں کی ملکیت سمجھی جائے گی سرحدی قبائل برافروختہ ہو گئے اور انہوں نے سید صاحب کے ہندوستانی ساتھیوں کو قتل کر دیا اور خود انہوں نے بھاگ کر بڑی مشکل سے جان بچائی[1]۔ مگر اب ان کا عہد حکومت ختم ہو چکا تھا اور ۱۸۳۱ء میں جبکہ وہ اپنے ایک نائب کی جس نے اپنے لئے ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی بطور ایک النٹیر امداد کر رہے تھے سکھ فوج نے جو شہزادہ شیر سنگھ کے زیر کمان تھی ان پر اچانک حملہ کر دیا اور ان کو شہید کر ڈالا۔ اس تحریک کے مذہبی پہلو کے متعلق اس کتاب کے آخری باب میں بحث کی گئی ہے۔ ہندوستان میں یا کسی اور ملک میں ایک مذہبی لیڈر انسانوں کے دلوں کو اُس وقت تک نہیں گرما سکتا جب تک کہ وہ اپنی تحریک کی صداقت پر پورا پورا یقین نہ رکھتا ہو۔ میں اپنے دوسرے باب میں سید احمد کی زندگی کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کروں گا۔ یہاں پر

---

[1] وادی پنج تار سے وادی پکھلی کو۔

[2] ۵ مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر۔ سید احمد صاحب کے مندرجہ بالا حالات میں نے دفتر خارجہ اور محکمہ ہائے گورنمنٹ آف انڈیا کی دستاویزات اور ۱۸۵۲ء اور ۱۸۶۷ء کے شاہی مقدمات میں جو گواہیاں دی گئیں اور پٹنہ کے جج مسٹر (T.E. REVEN SHAW) کی ملفوظات سے حاصل کئے ہیں۔ اس کے بہت سے تفصیلی حالات کیپٹن کننگھم (CUNNEGHAM) کی تاریخ سکھ سے مل سکتے ہیں۔

ایک اور مصنف نے جس نے شاید وہابی مواد لکھا ہے ایک بہت ہی اچھا مضمون وہابیوں کے متعلق کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء میں شائع کیا ہے۔

میں نے مجاہدین کی نوآبادی کے ابتدائی حالات ذرا تفصیل سے بیان کر دئے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے بعد میں اس وقت تک کے واقعات کو مختصراً بیان کر دوں جب کہ وہ ہماری سرحد پر باغی کیمپ کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اس امام کے معتمد نائبوں میں سے دو بھائی تھے جو ایک مشہور و معروف قاتل کے پوتے تھے وہ اپنی جان کو بچانے کے لئے سندھ پار کی پہاڑیوں میں چلا گیا تھا۔ اور وہاں ستیانا کے مقام پر بطور ایک عابد و زاہد کے زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ اس پناہ گزین درویش نے سرحدیوں میں بہت عزت حاصل کر لی تھی وہ اُس جگہ کو جہاں ان کی کٹیا تھی جائے پناہ اور غیر جانبدار علاقہ تصور کرتے تھے اس سے اُن قبائل کے درمیان جو ہر وقت بر سر پیکار رہتے تھے ایک بہترین صورت حالات پیدا ہو گئی۔ اس درویش کے ایک پوتے نے[1] جو امام کا خزانچی تھا ستیانا کے نامون گاؤں میں اقتدار حاصل کر کے امام صاحب کی باقی ماندہ فوج کو وہاں آنے کی دعوت دی۔

اُسی زمانہ میں سوات کی ریاست کے مذہبی پیشوا نے انگریزی حکومت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف ہو کر مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں پر ایک مضبوط شاہی حکومت قائم کر لی جائے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس نے درویش مذکور کے دوسرے پوتے[3] کو سوات آنے کی دعوت دی اور اُس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح پر اُس نے باشندوں کی فطرتی شجاعت کو قائم رکھا۔ کیونکہ اب اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہلالی فوج کے ایک مجاہد کے زیر کمان ہیں اور جو کوئی بھی اس متوقع جنگ میں جو انگریزوں یا ہندو کافروں سے ہونے والی ہے کام آئے گا وہ شہادت کا درجہ پائے گا۔ لیکن سوات کے قبائل کے خطرات کبھی بھی شرمندہ معنیٰ نہ ہوئے اور اُن کے بادشاہ نے ۱۸۵۷ء تک حکومت کر کے اس دار فانی سے کوچ کیا اس کے بعد اُن کا کوئی جانشین منتخب نہ کیا گیا۔ فی زمانہ اُس کا لڑکا اس خاندان کا سردار ہے اور ستیانا کی مجاہد آبادی کا لیڈر ہونے کا دعویدار وہ ریاست سوات کی حکومت پر بھی نظر رکھتا ہے

اس طرح پر ان مجاہدین نے سرحد پر دو پہلوؤں سے اپنے اقتدار کو مستحکم کر لیا تھا۔ اور اپنے مبلغین کے

---

[1] زمان شاہ جو تخت نشین ہونے والا تھا۔ [2] سید عمر شاہ [3] سید اکبر شاہ۔

ذریعے سرحد کی توہم پرست قبائل میں جہاد کی آگ ہمیشہ سلگائے رکھتے تھے۔ کچھ سالوں تک اُن کی حیثیت
بے حقیقت سرحدی لٹیروں کی سی رہی جو کبھی کبھی ایک نہایت ہی خوفناک ہلالی فوج کی صورت اختیار کر لیتے
تھی۔ ہمارے الحاقِ پنجاب سے پہلے انہوں نے اپنے ہندو ہمسایوں میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا لامتناہی سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور
اُس زمانہ میں مسلمانوں کی فوج میں بہت سے رنگروٹ خود ہمارے ہی علاقہ سے بھرتی ہونے لگے تھے۔ اِس متعصب نو آبادی کے لئے ا
رعایات بھرتی روکنے کے لئے ہم نے کوئی تدابیر اختیار نہ کیں تھیں یہ فوج اپنا غصہ سکھوں پر نکالا کرتی تھی یہ قبائل کے ناپاک
اتحاد پر مشتمل تھی جو کبھی ہمارے موافق اور کبھی ہمارے مخالف ہو جاتی تھی۔ ایک بہت بڑے انگریز تاجر نے ج
ہمارے شمال مغربی صوبہ میں نیل کی بہت بڑی تجارت کرتا تھا مجھے بتلایا کہ اُس کے بہت سے دیندار مسلما
ملازمین کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ اپنی تنخواہ کا معین حصہ سیتانا کیمپ کے لئے علیحدہ کر دیا کرتے تھے۔ اور جو اُ
میں زیادہ جوشیلے اور بہادر تھے وہ کسی نہ کسی مدت کے لئے متعصب امام کے ماتحت خدمات انجام دینے
لئے چلے جاتے تھے۔ جس طرح کبھی کبھی اُس کے ہندو ملازم اپنے باپ کی برسی منانے کے لئے ہر سال چھٹی
درخواست کرتے تھے اُسی طرح اُس کے مسلمان ملازم جو نیلی کوٹھی میں کام کرتے تھے ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۶ء
درمیان اس عذر کی بنا پر ایک یا دو مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنے کے عادی تھے کہ انہیں اپنے مذہبی فر
کی ادائیگی کے لئے ہلالی فوج میں بھرتی ہونا ہے۔

اس غفلت کی وجہ سے ہماری رعایا کو اُس متعصب کیمپ میں ہمارے سکھ ہمسایوں کے خلاف ب
ہونے کی عام اجازت ہو گئی جس کا ہمیں بہت بڑا خمیازہ اُٹھانا پڑا۔ امام[1] صاحب نے سکھوں کی سرحد
اور ہمارے علاقہ میں باقاعدہ ایک گدی قائم کر لی تھی۔ اور اب یہ تحریک کسی رہنما کی موت و حیات سے بالکل
ہو گئی تھی۔ اور خود ان کی وفات کو بھی اُن کے پر جوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے ایک مقدس ذ

---

[1] امام صاحب کا لفظ جہاں کہیں بھی آئے گا اُس سے میری مراد سید احمد صاحب ہیں جنھیں حقیقت میں وہ سیاسی اعتبار سے ا
اور شرعی لحاظ سے ایک نبی۔ اصلیت یہ ہے کہ حضرت مسیح اور حضرت محمدؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

لیا تھا۔ ۱۸۲۱ء میں اُن کے دو خلفائے جن کو انہوں نے پٹنہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا زیارت کے لئے سرحد کا سفر اختیار کیا۔ اور پورے طور پر معلوم کر لیا کہ اُن کے امام صاحب معجزانہ طور پر غائب ہوگئے ہیں۔ اگرچہ وہ ابھی تک بقید حیات موجود ہیں اور وہ وقت مقررہ پر اپنے آپ کو ایک جہادی فوج کے قائد کی حیثیت سے ظاہر کریں گے اور انگریز کافروں کو ہندوستان سے نکال باہر کریں گے۔ اس لئے اُس کے خلفا نے دریائے گنگا کی وادی کے ساتھ ساتھ اُن تمام بڑے بڑے شہروں میں جہاں پر امام صاحب نے اپنے سفر کلکتہ ۱۸۲۰ء کے دوران میں تبلیغ کی تھی روپیہ اور آدمی جمع کرنے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا بالخصوص روپے کی فراہمی کا۔ اس طرح ہمارے ملک سے نکل کر متعصب نو آبادی تک غیر مطمئن لوگوں کے جانے کا ایک دائمی تانتا بندھ گیا۔ بھگوڑے مقروض۔ فرار شدہ قیدی ہر وہ فضول خرچ جو اب اس قدر برباد ہو چکا تھا کہ اپنوں میں رہنا اُس کے لئے دشوار تھا، اور غدار جس کے لئے قانون کی زد سے بچنا محال تھا تمام کے تمام انگریزی علاقے سے بھاگ کر سرحد پر جمع ہو جاتے تھے۔ وہاں پر اعلے طبقہ کے پناہ گزین بھی تھے اور ہر وہ دیندار مسلمان جس کو عیسائی حکومت کے ماتحت آرام سے زندگی بسر کرنا ہرگز گوارہ نہ تھا کمر ہمت باندھ لیتا اور ستیانا کے کیمپ کی طرف چل دیتا۔ وہ سکھوں کے گاؤں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے اور اس بات پر بھی خوش ہوتے تھے کہ اُنکو انگریز کافروں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جنگ کابل میں انہوں نے ایک لشکر جرار ہمارے دشمن کی امداد کے لئے روانہ کیا اور ایک ہزار کے قریب آخر دم تک ہمارا مقابلہ کرتے رہے۔ صرف فتح غزنی کے موقع پر تین سو کے قریب نے انگریزی تلواروں کے ذریعے جام شہادت نوش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

جب ہم نے پنجاب کا الحاق کیا تو تعصب کی اس رَو کا رُخ جو پہلے سکھوں کی طرف ہوتا تھا اب اُن کے جانشینوں کی طرف پھر گیا۔ ستیانا فوج کی نظر میں انگریز اور ہندو دونوں کافر تھے اور اس لئے اِس قابل تھے کہ تلوار کے ذریعہ اُن کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ سکھوں کی سرحد پر جس بدامنی سے ہم نے چشم پوشی کی تھی یا جس سے بے پروائی کی تھی وہ ایک تکلیف دہ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچی۔

پٹنہ کی عدالت کے کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے خلفاء[1] نے مذہبی آتش بیانوں کی حیثیت سے سرحد میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں سر ہنری لارنس کو گواہیوں[2] کے دوران میں معلوم ہوا کہ وہ پنجاب میں مجاہدین[3] کے نام سے موسوم تھے۔ اور اسی حیثیت سے محافظوں کے درمیان اُن کو اُن کے وطن پٹنہ میں پہنچا دیا گیا تھا۔

یہاں مجسٹریٹ نے اُن سے اور اُن کی جماعت کے دو اور دانشمند ممبروں سے آئندہ نیک چلنی کی ضمانت لے لی۔ لیکن ۱۸۵۰ء میں وہ پھر جنوبی بنگال کے راجشاہی ضلع میں بغاوت پھیلاتے ہوئے پائے گئے اور وہاں بھی اُن سے امن قائم رکھنے کے لئے مچلکہ لے لیا گیا۔ مگر اس جرم کا پھر اعادہ کرنے پر دو دفعہ ان کو اُس ضلع سے خارج کر دیا گیا۔ ۱۸۵۱ء میں یہی دونوں خلفاء[4] امام صاحب کے جانشین باوجود کہ وہ مچلکہ اور ضمانت کی بنا پر جہاں تک کہ یہ کاغذی مچلکہ اور ضمانت ان کو پابند کر سکتے ہیں اپنے گھر پٹنہ میں رہنے کے لئے مجبور تھے۔ پھر بھی پنجاب کی سرحد پر بغاوت پھیلاتے ہوئے پائے گئے[5]۔

۱۸۵۲ء کو اُنہوں نے خیال کیا کہ اپنے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مناسب وقت آگیا ہے روپیہ اور آدمی ہمارے علاقہ سے ستیانا کیمپ کو متواتر جا رہے تھے۔ حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط و کتابت بھی پکڑ لی تھی۔ انہوں نے کمال عیاری کے ساتھ ہماری نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اُس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی۔ اور متعصب نو آبادی کے بہت ہی قریب تھی۔ اگر وہ ہمارے صوبہ پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے اُن کے مقابلے کے لئے بھیجی جاتی۔ اُن خطوط سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود

[1] عنایت علی اور ولایت علی۔ [2] مجسٹریٹ کے ریکارڈ ۱۳ اپریل ۱۸۴۷ء

[3] غازی یا جہادی۔ ان کا نام وہابی بعد میں رکھا گیا تھا جس کی تشریح دوسرے باب میں آئے گی۔

[4] مجسٹریٹ راجشاہی کی عدالت میں بیانات ۲۳ فروری ۱۸۵۰ء [5] ریونیو بورڈ کی مثل ۱۲ مئی ۱۸۵۱ء

ہے۔ انہی دنوں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ دی کہ اس شہر میں باغی جماعت کے آدمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے انگریزی صوبہ کے دارالخلافہ کے مجاہدین شہر میں بغاوت کی اعلانیہ تبلیغ کر رہے تھے۔ پولیس بھی ان ہی دیوانوں کی طرفداری کر رہی تھی اور اُن کے لیڈروں میں سے ایک نے اپنے مکان پر سات سو آدمی اِس غرض کے لئے جمع کر رکھے تھے کہ اگر اس سلسلہ کی کوئی مزید تفتیش ہوئی تو اس کا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا جائے۔

سرحد پر مجنونوں کے کیمپ کو روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے جو باغیانہ نظام قائم تھا اُس کی طرف سے انگریزی حکومت اب زیادہ دیر تک آنکھیں بند نہ کر سکتی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۲ء کے موسم خزاں میں اس موضوع پر دو اہم یادداشتیں تحریر کیں۔ پہلی یادداشت میں لارڈ موصوف نے یہ حکم فرمایا تھا کہ اندرون ملک میں اس نظام کی پورے طور پر نگرانی کی جائے۔ دوسری یادداشت میں سرحدی قبائل کے ساتھ ایک سرحدی جنگ کی نوعیت پر بحث کی گئی تھی۔ جن کی کافروں کے ساتھ توہم پرستانہ نفرت کو ہندوستانی دیوانوں نے ہوا دے کر خوب ہی بھڑکا دیا تھا اُسی سال انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امبہ کے نواب صاحب پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۸۵۳ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔

میں اُن بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔ اس دوران میں دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا ایک ہی واقعہ تمام حالات کو واضح کر دے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ ۱۶ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد پینتیس[۱] ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۳ء تک ان مہمات کا نمبر بیس تک پہنچ گیا تھا۔ اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔ اس اثنا میں ستیانا کیمپ جو ہر وقت ہمارے خلاف سرحد میں تعصب کے جذبات کو ابھارتا رہتا تھا نہایت

---

[۱] ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء۔

عقلمندی سے ہماری فوج سے براہ راست مقابلہ کرنے سے گریز کرتا رہا۔ لیکن ۱۸۵۸ء میں انہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی[1] بنا ڈالی اور یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا کہ انگریزی حاکموں سے بھی مطالبہ کرنے لگے کہ وہ بھی اُن کی تخویف مجرمانہ میں مدد کریں۔ ہمارے انکار کرنے پر وہ اس قدر برانگیختہ ہو گئے کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے اور لفٹنٹ ہورن (Lt Horn) کے کیمپ پر شبخون مارا۔ یہ وہاں کا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے اب زیادہ دیر نہ کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ سر سڈنی کوٹن (Sir Sidney Cotton) پانچ ہزار فوج کی[2] جمعیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گئے۔ چونکہ یہ جنگ اُن جنگوں میں سب سے پہلی تھی جو اس جنونی کیمپ کی وجہ سے ہمیں لڑنی پڑیں اس لئے میں اس کو یہیں مختصراً بیان کئے دیتا ہوں۔ اور دوسری لڑائی کو جو ۱۸۶۳ء میں ہوئی صرف بطور مثال پیش کروں گا۔ کسی قدر دقت کے بعد جنرل سر سڈنی کوٹن کی فوج نے باغی اتحادیوں کے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا۔ اُن کے دو نہایت اہم قلعوں کو مسمار کر دیا۔ اور ستانا کی باغی نو آبادی کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ لیکن مجاہدین نے صرف یہ کیا کہ وہاں پہاڑیوں کی دشوار گزار وادیوں میں پیچھے ہٹ گئے اور اُن کی قوت کو ذرا بھر بھی ضعف نہ پہنچا کیونکہ فوراً ہی ہمسایہ قبیلہ نے ملکا کے مقام پر ایک نو آبادی قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

انگریزی حکومت کے علاوہ مجاہدین کے کیمپ کے اور بھی دشمن تھے۔ گاہے بگاہے انہوں نے اپنی دینی حمیت کی زیادتی کی وجہ سے اردگرد کے پہاڑی علاقہ سے بھی آمدنی کا عُشر وصول کرنے کی کوشش کی۔ یہ ٹیکس مُبلغ کے شخصی اقتدار کے مطابق جس کے سپرد ٹیکس جمع کرنے کا کام ہوتا تھا کبھی ادا کر دیا جاتا کبھی اس سے اغماض برتا جاتا اور کبھی بالکل ہی انکار کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح کوہستانی قبائل میں خلفشار کی حالت ہمیشہ قائم رہتی تھی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کس طرح وہ امام صاحب سے دل برداشتہ ہو گئے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے اُن سے علیحدگی اختیار

[1] خاص طور پر یوسف زئی اور پنج تار کے قبیلے۔

[2] توپ خانہ ۲۱۹۔ سوار ۵۵۱۔ پیدل ۱۱۰۷۵ کل ۱۷۸۸۸ باقاعدہ فوج۔

کی اور جس کی بنا پر آخر کار ۱۸۳۱ء میں ان کی موت واقع ہوئی۔ جب کوئی قبیلہ عشر دینے سے انکار کرتا تھا تو مجاہدین سارے کے سارے اُس پر ہلّہ بول دیتے تھے اور انکار کرنے والوں کی فصلوں کو کاٹ کر غلہ اٹھالے جاتے تھے ۱۸۳۵ء میں قبیلوں نے اس مذہبی ٹیکس کی مخالفت کی بنا پر ستیانا پر حملہ کر کے اُس کے لیڈر کو قتل کر دیا تھا[1]

یہ باغی کیمپ سر سڈنی کوٹن کی مہم اور ان کے طرفداروں کی علیحدگی سے کمزور ہو گیا تھا اور اس وجہ سے دو سال تک بالکل خاموش رہا۔ ہم نے ستیانا کے علاقہ کو ہمسایہ قبیلہ کے سپرد کر دیا جس نے عشر دینے کی مخالفت کی تھی۔ اور مجاہدین کے امیر کو قتل کر دیا تھا۔ اس قبیلے اور ایک دوسرے طاقتور قبیلے[2] سے ہم نے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ مجاہدین کو اپنے علاقہ میں گھسنے نہ دیں گے۔ اور وہ اُس تیسری قوم کی بھی مخالفت کریں گے جو اُن کو اس علاقہ میں لانے کے لئے اُن کی مدد و معاون ہو گی۔ نیز مجاہدین اور دوسرے شریر لوگوں کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہ دیں گے تاکہ وہ برطانوی علاقہ میں داخل ہو کر قتل و غارت برپا نہ کرنے پائیں۔

مگر ابھی دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ باغی نوآبادی نے از سر نو توہم پرست سرحدی قبائل میں پھر اقتدار حاصل کر لیا۔ ۱۸۶۱ء میں ملکاسے جو اُن کی پہاڑوں کے اندر جائے پناہ تھی مہابن پر حملہ کر دیا جہاں پر ۱۸۵۸ء میں سر سڈنی کوٹن نے اُن کو بھگا دیا تھا۔ اور عین ستیانا کی پرانی آبادی کے اوپر قلعہ بند ہو گئے[3]۔ اس مضبوط قلعے سے نکل کر وہ ہمارے گاؤں پر چھاپہ مارتے تھے اور اُن ہی قوموں نے جنہوں نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہ دیں گے ان کو لوٹ مار کی غرض سے اپنے علاقہ سے گزرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس امر کا گویا ببانگ دہل اعلان کرنے کے لئے کہ پرانی حالت پھر قائم ہو گئی ہے مجاہدین راولپنڈی کے ضلع میں گھس آئے اور دن دھاڑے شاہراہ عام پر پولیس کی چوکی سے[4] تھوڑے ہی فاصلہ پر دو تاجروں کو

[1] سید عمر شاہ صاحب کو اتمان زئی قبیلہ نے قتل کر ڈالا تھا۔ [2] اتمان زئی۔ [3] جادون
[4] سری کے مقام پر۔ (Siri) [5] چودہ فروری ۱۸۶۱ء

قتل کر دیا اس کے تین ہفتہ بعد انہوں نے ہمارے علاقہ پر پھر چھاپہ مارا اور تین دولتمند آدمیوں کو اٹھا لے گئے اور بعد میں نہایت متانت کے ساتھ ہمارے افسروں سے خط و کتابت شروع کر دی جس میں ان قیدیوں کو آزاد کرنے کے لئے ایک ہزار پانچ سو پچاس روپے فدیہ طلب کیا گیا تھا۔ (بمقام ۱۵۵) اس روپے کا نصف مجاہدین کے امیر کو ملنا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۸۶۱ء میں اغوا کی ایک اور واردات ہوئی سرحد کی حکومت نے رپورٹ دی کہ اپریل ۱۸۵۶ء کے شرمناک حالات پھر پیدا ہو گئے ہیں۔ انگریز افسروں نے اپنے حلیف قوموں کو اُن کے دین اور اُن کی تکالیف کا بے فائدہ واسطہ دیا۔ باوجودیکہ اُن کے بہت سے گاؤں ہمارے رحم و کرم پر تھے لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے ہم مذہبوں ہی کا ساتھ دیا اور ہمارے پاس سوائے بدلے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ اس لئے ہم نے اِن قوموں کا محاصرہ کر لیا اور باقی دنیا سے ان کا تعلق منقطع کر دیا۔ اور ہر اُس شخص کو گرفتار کر لیا جس نے سرحد عبور کرنے کی کوشش کی۔ اس سے اُن کی عقل ٹھکانے لگ گئی اور انہوں نے پھر ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا اور باغی آبادی کو ستیانا کے علاقہ سے نکال کر اندرونی وادیوں میں چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

تاہم ہماری بے وفا ہندوستانی رعایا باغی کیمپ میں متواتر جمع ہوتی رہی۔ ۱۸۶۲ء میں اُن کی تعداد یہاں تک بڑھ گئی کہ پنجاب گورنمنٹ ایک دوسری جنگ کا مشورہ دینے پر مجبور ہو گئی۔ حقیقتاً اب حالات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ وزیر ہند نے اپنے اس عقیدہ کا اعلان کر دیا کہ ان باغیوں کو جلد یا بدیر یہاں سے فوجی قوت کے ذریعہ نکال باہر کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک یہ سرحد پر مقیم رہیں گے اس وقت تک یہ ہمارے لئے ہمیشہ ہی خطرہ ثابت ہوتے رہیں گے۔

بہرحال اُس وقت مہم کا روانہ کرنا ناممکن تھا۔ اپریل ۱۸۶۳ء کے اوائل میں انہوں نے ہمارے علاقے میں پھر قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اسی سال ماہ جولائی میں وہ نہایت دلیری کے ساتھ ستیانا کے علاقہ پر پھر قابض ہو گئے اور ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب کو تباہ کن

خطوط لکھے۔ اُن کی ہمسایہ اقوام نے ایک دفعہ پھر اپنی وفاداری کو اپنے تعصب پر قربان کر دیا اور اُن مواعید کو جو ہمارے سامنے کئے گئے تھے بالکل فراموش کر دیا۔ اس باغی آبادی کو سرحد پر ایک دفعہ پھر حاکمانہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۲۳ء کو برطانوی علاقہ پر چڑھ دوڑے اور ہماری طلایہ گرد فوج کے کیمپ پر شبخون مار کر گویا قاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے حلیف ریاست امب کے نواب صاحب پر بھی حملہ کر دیا اور کوہ سیاہ پر ان کے دیہات کو جلا دیا اور سرحدی چوکیوں پر باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔ اسی مہینے میں انہوں نے تنا ول کی حلیف تحصیلوں پر بھی چھاپا مارا اور ایک ملکی افسر کو اس کے چند ساتھیوں کے ساتھ قتل کر ڈالا۔

پھر ہمارے دوستوں پر ہی حملہ کرنے پر اکتفا نہ کرتے ہوئے انہوں نے دریائے سندھ کے کنارے ہماری چوکی پر بھی حملہ کر دیا۔ اور انگریز کا فروں کے خلاف ایک باقاعدہ اعلان جنگ شائع کیا اور ہر دیندار مسلمان کو اس جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔

اب ہم تقریباً انہیں حالات سے دوچار تھے جو ۱۸۲۷ء و ۱۸۳۰ء کے درمیان پیدا ہو گئے تھے اور جس کے نتیجہ پر اس متعصب لشکر نے پنجاب پر اپنا تصرف جما لیا تھا یہاں تک کہ سرحدی دارالخلافہ ان کے قبضہ میں آگیا ۔ اب جنگ سے گریز کرنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا لیکن سرحدی لڑائیوں سے کوئی فوجی سبق حاصل نہیں ہوتا اور نہ کسی طاقتور سلطنت کی عزت میں کوئی نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی جنگ کے نتیجہ میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی جو برطانوی ہندوستان جیسی فوجی طاقت اور غیر مہذب اقوام کے اتحادیوں کے درمیان ہو خواہ وہ کتنے ہی بہادر کیوں نہ ہوں اور اُن میں دینی حرارت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ مزید براں ان لڑائیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور بے شک ان کا انجام ایک سخت انتقام کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ جو ایک سنجیدہ انسان کے لئے بہت ہی حوصلہ شکن ہوگا۔ اس متعصب نوآبادی کے خلاف اُن چار مہموں میں سے ایک مہم کو بہ تفصیل بیان کرنے کے لئے منتخب کروں گا۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح باغی کیمپ امن کے زمانہ میں ہماری سرحد پر ہمارے لئے باعث توہین تھا اُس سے کہیں زیادہ جنگ

کے زمانہ میں ہماری فوج کی تباہی کا سبب بن گیا تھا۔ جب تک ہم نے اُن سے بازپرس نہ کی وہ ہمارے علاقوں اور ہماری رعایا کو قتل اور اغوا کرنے کے لئے گروہ پر گروہ بھیجتے رہے اور جب ہم نے اُن کو فوجی قوت کے ساتھ صفحۂ ہستی سے نابود کر دینا چاہا تو انہوں نے ہمارے افسروں کو دھوکے میں رکھا اور ہماری فوج کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور کچھ عرصہ تک سارے برطانوی ہندوستان کی سرحدی فوج کا جم کر مقابلہ کرتے رہے۔

اس سے یہ سمجھ لینا نہایت آسان ہوگا کہ کس طرح باغیوں اور پناہ گزینوں کی آبادی نے جس کو پشت پناہ ہماری ہی سلطنت کے سازشی اور متعصب لوگ تھے نفرت و حقارت سے مغلوب ہو کر خود ہم کو ہی کھلم کھلا چیلنج دے دیا تھا لیکن اس بات کا سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ وہ کس طرح ایک منظم فوج کی قوت اور جنگی قابلیت کا مقابلہ کر سکتے تھے خواہ وہ تھوڑے ہی وقت کے لئے کیوں نہ ہو۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس ملک کے مختصر حالات بیان کر دیئے جائیں جس میں اُن کے امام صاحب نے اس جنگجو جماعت کا مرکز قائم کیا تھا۔

وادی سندھ کے عین شمال میں اُس سرحدی قبیلے کی حد پر جو برطانوی تاج کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرتے ہیں کوہ ہند کی مقدس پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن آریاؤں پر جنہوں نے پہلے پہل جنوب کی طرف سفر اختیار کیا تھا مہابن جس کا ترجمہ ہے بہت بڑا جنگل، کے سوائے اور کسی قدرتی رکاوٹ نے اتنا گہرا اثر نہیں چھوڑا تھا۔ انہوں نے اس پہاڑ کا نام بھی یہی تجویز کیا تھا۔ اور اُن تمام جنگلوں اور پہاڑوں کو جو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ۰۰۰،۷ فٹ کی بلندی تک چلے جاتے ہیں اب تک مہابن یعنی بہت بڑا جنگل ہی کہا جاتا ہے۔ اُس قوم کے نزدیک ان پہاڑوں کو وہی حیثیت حاصل تھی جو یہودیوں کے نزدیک وادی سینا کو حاصل ہے۔ اور سنسکرت کے گیتوں سے ابتدائی ایّام کی اس پرستش کو بقائے دوام حاصل ہو گیا ہے۔ مدت مدید تک دیندار ہندو کے لئے مہابن تیرتھ بنا رہا۔ یہی وہ متبرک پہاڑیاں تھیں جن پر ارجن نے تن تنہا ایک بہت بڑے دیوتا سے جنگ کی تھی[1]۔ اور اگرچہ زمانہ قدیم کے حضرت یعقوبؑ کی طرح شکست کھائی تھی لیکن اُس نے مہادیو۔

دیا تھا سے ایک ایسا ہتھیار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ زمانہ قدیم میں وہ سنیاسی بہت ہی خوش قسمت سمجھا جاتا تھا جو ان پہاڑیوں کے تلے جان دے دیتا تھا۔ اور جیسا کہ قدیم روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ معمولی معمولی دیوتاؤں کو بھی یہاں پر برت رکھنے اور ریاضت کرنی پڑتی تھی تاکہ تزکیہ باطنی کر کے روحانی ترقی حاصل کر سکیں [۱]۔

قدیم ہندوؤں کے اس مقدس علاقہ میں اب توہم پرست مسلمان قبائل آباد ہو گئے ہیں۔ کوہ سیاہ پر دریائے سندھ کے مشرق کی طرف بھی ایسی ہی متشدد اور متعصب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں۔ اور ایبٹ آباد کی سرحدی انگریزی چوکی کو ہر وقت اُن کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ آمدنی کا عشر اور دیگر مذہبی چندے ایسے امور ہیں جو اس متعصب آبادی کے ساتھ دیگر اقوام کا میل یا اتحاد پیدا کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان قبائل میں مذہبی جوش کے پیدا ہو جانے کا ہر وقت امکان رہتا ہے۔ اور ہماری سرحد کے اندر ہندوؤں کے دولت مند دیہات کو لوٹنے کا موقعہ ان کے لئے ہمیشہ بڑی مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ صرف سوات ہی کی مذہبی ریاست میں ۹۶۰۰۰ ہزار کی آبادی ہے اور اُن میں سے ہر ایک کے ذہن میں پشتہا پشت سے انگریزی حملہ کے خطرات ڈالے جا رہے ہیں۔ اور یہ ذہنیت پیدا کی جا رہی ہے کہ اگر اُن کو کافروں سے لڑنا ہی پڑے تو بہتر ہے کہ ایک مذہبی لیڈر کے جھنڈے تلے لڑا جائے تاکہ وہ لوگ جو میدان جنگ میں کام آئیں شہادت کا درجہ پائیں۔

۱۸۶۳ء کی لڑائی میں ہم نے کافی نقصان اٹھانے کے بعد یہ سبق حاصل کیا تھا کہ مجاہدین کے کیمپ کے خلاف مہم روانہ کرنا دنیا کے ۵۳۰۰۰ [۲] ہزار جنگجو اور بہادر انسانوں کی مجموعی طاقت کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔ ملک

---

[۱] اس میں میں نے اپنے اس مضمون سے استفادہ کیا ہے جو میں نے سات سال پہلے کلکتہ کوارٹرلی ریویو میں لکھا تھا۔

[۲] میں یہاں پر علیحدہ علیحدہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر ایک قبیلہ بغیر کسی تکلیف کتنے آدمی میدان جنگ میں لا سکتا ہے حسین زئی ۲۰۰۰ کلازئی ۱۰۰۰ ومکازئی ۲۰۰۰ ومدک خیل ۴۰۰۰ - آمازئی ۱۵۰۰ - جادول ۴۰۰۰ سخدا خیل ۲۰۰۰ - نیبری ۱۲۰۰۰ بلہ ۴۰۰۰ - ڈانی زئی ۲۰۰۰ - دیگر قبیلے ۶۰۰۰ - سوات کے قبیلے ۱۰۰۰۰ - مجموعہ ۵۳،۵۰۰ - یہ اعداد و شمار اگلے صفحہ پر

دشوار گزار ہونے کی وجہ سے ہمارے سرحدی افسر قبائل کے مزاج اور اُن کے آپس کے تعلقات کے متعلق اکثر مذبذب رہتے ہیں اور جب کبھی ان باغیوں کو شکست ہوتی ہے تو وہ صرف جبال کے اندر دشوار گزار درول میں چلے جاتے ہیں۔ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو ۷۰۰۰ ہزار برطانوی فوج نے سر نیول چمبرلین کی سرکردگی میں کوچ کیا۔[۵] ان کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا۔ اور ۴ ہزار خچر اور باربرداری کے دیگر جانور جن کو جمع کرنے کے لیے پنجاب کا کونہ کونہ چھان مارا تھا اُن کے ساتھ تھے۔ دوسرے دن شام کو ایک کالم تمام رات کوچ کرتا ہوا ایک ایسی گھاٹی پر جا پہنچا جس میں بہت سی جھاڑیاں تھیں اور بہت سے درخت لگے ہوئے تھے اور جو زیادہ تکلیف دہ طور پر درہ امبیلہ کے نام سے

نیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) میں نے دفتر خارجہ سے حاصل کیے ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکا کرنل میکریگر (MACRAGOR) اصلاح کرالی ہے۔ جو اس وقت فرنٹیر گیزیٹیر میں مشغول ہیں۔ ۱۸۶۲ء میں ایک موقع پر ہمارے خلاف ان جنگجوؤں کی تعداد ۶۰۰۰ ہزار ہو گئی تھی۔

۵ باقاعدہ پیدل فوج ۱۵۰۸، باقاعدہ سوار ۲۰۰، توپ خانہ ۲۸۰ – ۱۰۰۰۰ سے زیادہ بے قاعدہ فوج جو سول کمشنر کے ماتحت تھی اور ۱۲ توپیں در بند کے مقام پر ۲۵۰ یورپین پیدل فوج – ۲۵۰ ہندوستانی پیدل۔ اور ۳ توپیں۔ توبیلا کے مقام پر ہندوستانی سواروں کا سکوارڈرن۔ اور مختلف ہندوستانی فوج۔ اوگی کے مقام پر ۱۵۰ ہندوستانی سوار ۲۵۰ پیادے اور ۲ توپیں۔ ایبٹ آباد میں ہائی لینڈرز ایک کمپنی۔ ۵ گورکھا اور ایک پنجابی پیادہ فوج کا صدر مقام۔ ۵۰ ہندوستانی سوار۔ اور ۳ توپیں۔ رستم بازار میں ۴۰۰ ہندوستانی سوار ہندوستانی پیادے اور مردان گائیڈ کور کا صدر مقام۔ پشاور کے مقام پر مختلف توپخانہ کے علاوہ ہسار کی ایک رجمنٹ، پین پیادوں کی ایک رجمنٹ۔ بنگالی سواروں کی ۲ رجمنٹ اور ہندوستانی پیادوں کی ۳ رجمنٹ موجود تھیں۔ اخیر میں پیادے کردہ بٹ میں کارآمد اشخاص بہت کم تھے۔ اور اُن کا کام یہ تھا کہ سرحدی چوکیوں پر قابض رہیں اور اس کے لیے ایک رجمنٹ ضروری تھی۔ پنڈی کے مقام پر ہندوستانی پیادوں کی ایک رجمنٹ تھی جن میں ۱۲ آدمی مارے گئے تھے۔ توپخانہ کی ایک بیٹری ۹۳ ہائی لینڈرز کی ایک ی اور ۱۵ اور ۱۰۱ کا صدر مقام کوہاٹ میں ۲ توپیں۔ ہندوستانی سواروں کے ۲ سکواڈرن۔ پنجابی پیادوں کی ایک رجمنٹ گر تھی۔ بنوں میں ۲ توپیں ایک پنجابی سواروں کی رجمنٹ اور ایک پنجابی پیادوں کی رجمنٹ موجود تھی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ۲ توپیں

مشہور ہے۔ ہمارے جنگی مرکز[1] کی حفاظت کے لئے کافی فوج موجود رہتی تھی۔ اور اُس کے پیچھے سرحدی مقامات میں بھی طاقتور مورچہ بندی کی گئی تھی جس میں پیادہ اور سوار فوج اور کافی توپخانہ موجود تھا۔ یہ کچھ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ حملہ آور فوج کی پشت پر اتنی امداد موجود تھی کیونکہ ۲۰ تاریخ کو جرنیل کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ قبائل جن کو وہ اپنا دوست سمجھتا تھا اب مذبذب حالت میں ہیں۔ اور اُس کے دو ہی دن بعد اُس نے گورنمنٹ کو تار دے دیا تھا کہ فوج کو مجبوراً رکنا پڑا ہے۔ ۲۳ تاریخ کو قبائل نے اپنی مخالفت کا اعلان کر دیا اور بونیر والوں نے ہماری طلایہ گرد پارٹی پر حملہ کر دیا اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سوات کا روحانی پیشوا بھی ہمارے دشمنوں کے ساتھ جا ملا۔ اس اثنا میں گورنمنٹ کو سرحد پر سے تار پر تار چلے آتے رہے۔ جس میں مزید اور مزید پر مزید فوج بھیجنے کی التجا کی جاتی تھی۔ فیروزپور رجمنٹ کے ایک حصہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا گیا اور ایک اور رجمنٹ کو پشاور سے مغرب کی طرف کوچ کرنے کا حکم ملا۔ ۹۳ ہائی لینڈر سیالکوٹ سے اور ۳۲ اور ۴۲ ہندوستانی پیدل فوج لاہور سے یلغار کرتی ہوئی آگے بڑھی ابھی تین ہفتے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ پنجاب کے قلعے یہاں تک خالی ہو گئے کہ بہا نیر کے کمانڈر افسر کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ پنجاب کے گورنر کے لئے ۴۲ فوجیوں کی گارد کا انتظام کر سکے۔

اس اثنا میں قبائلی لشکر ہماری قلیل فوج کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اب آگے بڑھنا تو بالکل ناممکن تھا اور پیچھے ہٹنا شکست کھا جانے سے بھی بدتر۔ ہماری اس حالت نے قبائلی لشکر کو جس کے افراد بچپن سے ہی پہاڑی جنگوں میں ماہر ہو جاتے تھے۔ بہت ہی فائدہ میں رکھا اور ایک افسر کی یادداشت سے مندرجہ ذیل اقتباس بخوبی ظاہر کرے گا کہ ہماری فوج کیسے کیسے خطرات سے گھری ہوئی تھی۔

"۲۰ تاریخ کو ہم اپنے بکھرے ہوئے گروہ کو بلا کر واپس ہوئے۔ اور کیمپ پہنچنے تک برابر لڑتے رہے جہاں ہم کافی رات گئے پہنچے۔ دشمن کافی تعداد میں تھے۔ انہوں نے ہماری صفوں کو چیرنے کی بھی کوشش کی۔

---

[1] عبدالغفور ایک درویش صفت آدمی ہے جس نے یوسف زئی قبیلہ پر تو ہم پرستانہ اور حیرت انگیز اثر جما رکھا ہے۔ اور تمام پٹھان قبیلے اُس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مگر اب ہر شخص اُن کے مقابلے کے لئے تیار تھا ان کا استقبال ہماری قطاروں سے بندوق کی گولیوں اور پہاڑوں پر چڑھائی توپوں کے گولوں سے کیا گیا۔ یہ شبخون عجیب شاندار نظارہ پیش کر رہا ہے۔ جنگل کا سیاہ منظر سامنے ہے۔ اور دائیں اور بائیں پہاڑوں پر جلائی ہوئی آگ ستاروں کی طرح چمک رہی ہے۔ اُن کے درمیان وادی میں پیادہ فوج کی دھندلی سی لکیر نظر آ رہی ہے۔ اچانک اللہ اللہ کے خوفناک نعرے بلند ہوئے۔ اور درختوں کے سائے میں سے بندوقیں چلتی اور کھڑکتی ہیں۔ وہاں چلتی تلواروں کی جھنکار ہے اور سیاہی مائل شکلوں کا ایک جم غفیر کھلے میدان میں سے دوڑتا ہوا ہماری صفوں کے بالکل قریب آ کر حملہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد چمک پیدا ہوتی اور ساتھ ہی اُس کے گرج اور چھرے اور کنستر پتھروں اور سنگریزوں سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتے ہیں۔ پتوں کے درمیان بڑبڑانے کی آواز آتی ہے۔ قطاروں سے ایکدم بندوقیں چلنے کی چیکار سے تمام جگہ روشن ہو جاتی ہے۔ اور جوں ہی ان کا دھواں دور ہوتا ہے حملہ آوروں کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ میدان جنگ سے چیخ و پکار کی دھیمی آواز اور کسی پٹھانی زبان میں پانی مانگنے کی صدا سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری بندوقوں کی باڑ کچھ اثر ضرور پیدا کر گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسری طرف سے ایک دو گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ پہاڑوں پر سے لڑھکتے ہوئے پتھروں کی آواز ہمارے دیسی سپاہیوں کے تیز کانوں کو یہ خبر دیتے ہیں کہ دشمن اب ہمارے پہلو پر حملہ کیا چاہتا ہے اور وہ اُن کے مقابلے کے لئے اسی وقت اُس طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اس طرح پر مشعلوں کی روشنی اور رائفلوں کے چلنے کی آواز اندھیری رات میں بے آب و گیاہ پہاڑوں پر دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ اور جنگ کے شور و غوغا سے جو پہاڑوں کی صدائے بازگشت سے سوگنا ہو جاتا ہے تمام وادی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پُر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک دفعہ پھر نعرے لگتے ہیں اور حملہ ہوتا ہے اور چھروں اور کارتوسوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ اور اس کا خاتمہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جیسا پہلے ہوا تھا۔ مگر اس دفعہ جو سیاہ گروہ ہماری صفوں کی طرف آہستہ آہستہ آ رہا ہے ایک بھاری بوجھ کو نہایت احتیاط سے اٹھائے ہوئے ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی نشانہ بازی بھی خالی نہیں گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد صفوں کے درمیان سے ایک آواز تحکمانہ انداز میں سنائی

دیتی ہے۔ اور ہر شخص اُس کے لئے گوش بر آواز ہو جاتا ہے۔ تاکہ حکم بجا لائے۔ حکم یہ ہے۔ گولی چلانا بند کر دو اُن کو سنگینوں کے فاصلے تک حملہ آور ہونے دو اور پھر ـــــ بعد کے الفاظ سنائی نہیں دیتے لیکن ہر ایک سپاہی جانتا ہے کہ یہ جملہ کس طرح ختم ہوا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کو روک لیتے ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ جو اس سے پہلے کے شور و غوغا کے ساتھ عجیب قسم کا مقابلہ پیش کرتی ہے بالکل منتظر رہتے ہیں کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ عین سامنے پہاڑ کی چوٹی پر قد آور جرنیل دکھائی دیتا ہے جو اپنے عملے سے اُونچا نظر آتا ہے اور نہایت غور کے ساتھ اپنے سامنے اندھیرے میں دیکھ رہا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب کھیل ختم ہو چکا ہے۔ لیکن کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ دشمن جس کی تعداد کے متعلق ہم کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے ابھی تک ہمارے سامنے والے جنگل میں موجود ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم اُن کے پاؤں کی آہٹ بخوبی سن سکتے ہیں۔ اُن کے واپس جانے سے پتھر پہاڑوں پر سے گرتے ہیں اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ وہ اپنے مجروحین اور مقتولین کو جلدی جلدی اُٹھا کے لے جا رہے ہیں ورنہ وہ بہت خاموشی کے ساتھ واپس ہوتے۔"

ایک ایک دن کی دیر دشمنوں کے تعصبی جوش، اُن کی طاقت اور امیدوں کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ کمک کے باوجود ہمارے جرنیل کیلئے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ہفتوں تک برطانوی سپاہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈر کے مارے دڑبے میں دبکی پڑی ہے۔ اور وادی چمالہ میں بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ جہاں باجوڑ قبائل کے مل جانے سے دشمن کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور اس طرح ہماری فوج کا ہراول سے اور پشت کی آمد و رفت خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ ۸ نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے نہایت بے صبری کے ساتھ پوچھا کہ اگر جرنیل صاحب کو ۱۲۰۰ پیادہ فوج کی کمک بہم پہنچائی جائے تو کیا وہ ملکا کی متعصب آبادی کو فنا کرنے کے لئے آگے بڑھ سکیں گے ۱۲ تاریخ کو جواب آیا کہ آگے بڑھنا اُسی وقت قابل عمل ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے پاس ۲۰۰۰ پیادہ فوج اور کچھ توپیں ہوں۔ اور ساتھ ہی اُس کے یہ حوصلہ شکن پیغام بھی آیا کہ جرنیل صاحب اُس وقت تک ملکا پر حملہ کرنے کے خلاف ہیں جب تک کہ درمیانی قبائل کے ساتھ صلح صفائی نہ ہو جائے۔

سارے سرحدی علاقہ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ۱۳ نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے اپنی فوجی چوکیوں کو یہاں تک خالی پایا کہ ڈگشائی کے کیمپ کی حفاظتی فوج کا ایک حصہ عاریتاً مانگنا پڑا اور فوسلیرز کو بسرعت تمام سرحد کی طرف روانہ کر دیا

گیا۔ اور ملٹری پولیس کی ایک مضبوط جماعت جو سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی بھی بھیج دی گئی تاکہ ہمارے سلسلہ آمد و رفت کی حفاظت ہو سکے جو دشمنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ باربرداری کے سامان کے لئے ۲۰۰ اونٹ اور ۲۰۰ خچر بعجلت تمام بہت زیادہ خرچ برداشت کر کے پنجاب کے مختلف اضلاع سے بھیج دیئے گئے تھے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ اس مہم کی تمام تدابیر ناکامیاب ہو چکی تھیں۔ اصلی خیال یہ تھا کہ اچانک طور پر درہ سے کوچ کرتے ہوئے اس سے آگے کھلے میدان پر قبضہ کر لیا جائے۔[2] امپیریل گورنمنٹ نے یہ حکم دیا تھا کہ یہ تمام کام ۱۵ نومبر تک ختم ہو جانا چاہئے مگر ۲۰ نومبر کو یہ حالت تھی کہ ہماری فوج کے لئے آگے بڑھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ کھلے میدان میں جنگ لڑائی لڑی جاتیں جہاں پر موجودہ مہذبانہ لڑائی کے تمام آلات کام میں لائے جا سکتے تھے ہمیں ہر اس چوکی کی حفاظت کرنی پڑی جو ہم آگے بڑھتے ہوئے پہاڑوں پر قائم کرتے تھے۔ اسی دن پنجاب گورنمنٹ نے درخواست کی کہ ۱۵۰۰ آدمیوں کا ایک اور بریگیڈ سرحد پر روانہ کر دیا جائے گو جرنیل چیمبرلین کی ۱۹ تاریخ والی تار سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں کمک ضرورت کے وقت سے بہت بعد نہ پہنچے۔

۱۸ تاریخ کو دشمن نے نہایت جانفشانی سے ہم پر حملہ کیا اور ہماری ایک چوکی پر قابض ہو گئے اور افسروں کے علاوہ ۱۱۴ آدمیوں کو زخمی یا قتل کرتے ہوئے ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔ دوسرے دن دشمنوں نے ایک اور چوکی پر قبضہ کر لیا۔ جو بعد میں ایک خونریز جنگ کے بعد دوبارہ حاصل کر لی گئی۔ جس میں ہمارے جرنیل صاحب بھی شدید طور پر زخمی ہوئے اور افسروں کے علاوہ ۱۲۵ آدمی میدان جنگ میں کام آئے یا بالکل ناکارہ ہو گئے۔ ۲۰ تاریخ کو بیمار اور مجروحین کو واپس بھیج دینا ضروری سمجھا گیا تھا جن کی کل تعداد اب ۴۲۵ ہو گئی تھی جرنیل صاحب نے جو تار ۱۹ تاریخ کو دیا تھا اس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔ فوجیوں کو ایک مہینے تک دن رات بہت سخت کام کرنا پڑا ہے اور تازہ دم دشمنوں کا مقابلہ ایسے نقصان کے ساتھ کرنا بڑا حوصلہ شکن ہے۔ ہمیں کمک کی سخت ضرورت ہے۔ نیز لئے دشمن کا مقابلہ کرنا۔ خوراک بہم پہنچانے کے لئے آدمی مہیا کرنا اور زخمیوں کو واپس بھیجنا بہت مشکل ہو گیا ہے اگر آپ تازہ دم

---

[1] پنجاب گورنمنٹ کا خط نمبریہ ۱۸ فروری ۱۸۶۳ء پیرا نمبر ۶۔ [2] پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ یکم فروری ۱۸۶۳ء پیرا نمبر ۲۔ یہ ہی ایک کتاب ہے جس کو میں نے اس مہم کے بیان کرنے میں بہت زیادہ استعمال کیا ہے میں یہ قطعاً امید نہیں کر سکتا کہ اس قدر رتبہ رکھنے والی مہم مخالفانہ تنقید سے بچ جائے گی مگر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ نہایت احتیاط سے ٹھیک کی ہوئی سرکاری رپورٹوں پر مبنی ہے۔

فوج کے دستے اُن دستوں کی جگہ جو تعداد اور جوش و خروش میں بہت کم ہو گئے ہیں بھیج سکیں تو ان فارغ شدہ دستوں کو میدانوں میں بھیجا جا سکتا ہے تاکہ اُن سے حفاظت کا کام لیا جائے۔ یہ بہت ضروری ہے +

اب ایک بہت بڑی سیاسی مصیبت کا خطرہ لاحق ہو رہا تھا یعنی ممکن تھا کہ ہماری فوج میں جو ہر روز کے حملوں سے اکتا چکی تھی خوف و ہراس کی لہر دوڑ جاتی اور وہ بہت سی قتل و خونریزی کے ساتھ نہایت ابتر حالت میں اس درے سے نکال باہر کی جاتی مگر ایسی شکست گو اُس میں اتنی جانیں تلف نہ ہوتیں جتنی کہ ایک بڑی جنگ میں ہوتی ہیں۔ سرحد پر ہماری طاقت کو بالکل تباہ کر دیتی۔ اور اس کے ساتھ جو سیاسی مصیبتیں نازل ہوتیں اُن کی حد کے متعلق کسی قسم کی پیشینگوئی کرنا ممکن نہ تھا اس بنا پر پنجاب گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر جرنیل چیمبرلین یہ مناسب سمجھے تو تمام فوج کو پرولی کے مقام پر واپس لے آئے۔ مگر پنجاب کے حاکموں کی احتیاط پسندی نے برطانوی فوج کی پامردی و استقلال کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ ۲۲ تاریخ کو تار آیا جس میں لکھا تھا کہ ہماری فوج نے موجودہ جگہ پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور باوجودیکہ دشواریاں بہت تھیں لیکن پھر بھی ہمارے جرنیل کا خیال تھا کہ آخر کار فتح ہماری ہی ہو گی۔

دوسرے دن ۲۳ دیسی پیدل فوج مع چند یورپینوں کے کیمپ میں پہنچ گئی۔ دشمن اپنی تمام طاقتیں پہلے ہی صرف کر رہے تھے۔ اب ہماری تازہ دم فوج کے پہنچنے سے قبائل پر خوف و ہراس چھا گیا۔ اب وہ اس بات کو سمجھنے لگے کہ ایک وسیع فوجی سلطنت کے لامتناہی ذرائع سے جنگ کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں اور دوسرے ہی جمعہ کو (یہ ہفتہ کا وہ دن ہے جس دن مجاہدین عام طور پر حملہ آور ہوتے ہیں) کوئی حملہ نہ ہوا۔ لیکن پھر بھی ہم آگے بڑھنے کے قابل نہ ہوئے اور ۲۸ نومبر کو پنجاب گورنمنٹ نے بے فائدہ ایک یادداشت لکھی جس میں فوجوں کا ایک ہی جگہ جم جانے پر اظہار افسوس کیا گیا تھا اور آگے بڑھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ جونہی ہماری کمک پہنچی کوہستانوں سے تازہ دم قبائل بھی آ موجود ہوئے۔ صرف ایک سردار ... ۳ آدمی اپنے ہمراہ لایا اور ایک درویش[1] نے ... ۵ مجاہدین بھیجے جو یہ عہد کر کے آئے تھے کہ یا تو وہ غازی کہلائیں گے اور یا شہید۔

۵ دسمبر کو ہماری تمام کمک پہنچ چکی تھی اور آگے بڑھنے کی پُر زور تاکید کی گئی تھی۔ اب ہمارے پاس نو ہزار باقاعدہ فوج تھی جس میں بہت سی منتخب رجمنٹیں تھیں جیسے کہ ۹۳ ہائی لینڈز اور بے قاعدہ فوج اس کے علاوہ تھی۔ اور بظاہر یہ ناقابل تسلیم امر تھا کہ طاقتور برطانوی فوج اس طرح ہفتوں ہی ایک درہ میں بیکار بیٹھی رہے گی۔ اور دشمن اُس کو اپنے حملوں سے تنگ کیا کریں گے

---

[1] نصیحت لال خاں آف باجوڑ۔ [2] حاجی آف کنہار۔

اور وہ اس قابل نہ ہو سکے تھے کہ ان کو برطرف کر سکے۔ مگر مجاہدین نے سرحدی قبائل میں جو اقتدار حاصل کر لیا تھا ہم نے اُس کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ لوگ جو ان کے ساتھ مذہب کی بنا پر شامل ہوئے تھے وہ فتح یا شہادت کی امید پر انگاروں پر لوٹتے تھے اور وہ قبائل جو ذرا کم متعصب تھے ان کو اس خدشہ کو کام میں لا کر اکسایا گیا تھا کہ اُن کے علاقہ پر انگریزی فوجیں چڑھ آئی ہیں یا اُن کا علاقہ میدان جنگ بنایا گیا ہے۔ اس طرح شوق اور رقابت نے قبائلی لوگوں میں آگ لگا دی تھی اور وہ تربیت یافتہ فوج کی ہر کوشش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک چشمدید گواہ دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں سرحد کی حالت یوں بیان کرتا ہے "جوش و خروش دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پشاور کی سرحد پر بہت سے لارڈ کلائیڈ (Clyde) آنجہانی کے ہاتھوں ۱۸۵۲ء میں شب قدر کے مقام پر شکست کھانے کے بعد اسی مقام پر پہلی دفعہ مخالفانہ مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوہاٹ، وزیریوں اور ٹمان خیل کے چھاپوں کی افواہیں بھی مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ کابل اور جلال آباد کے ایلچی بھی اخوند صاحب سوات کے روحانی پیشوا کے ساتھ تھے اور مزید برآں اُن کو نواب دیر اور ۶۰۰۰ آدمیوں کی کمک بھی پہنچ چکی تھی۔ ۵ دسمبر کو ہمندوں نے شب قدر کے نزدیک ہمارے علاقہ پر چھاپہ مارا۔"[1]

کوہستانی قبائل کا اتحاد عام طور پر ناپائدار ہوتا ہے جس کام کو ہماری فوج سرانجام نہ دے سکی اسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی (حکمت عملی) نے پورا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے ۲۵ نومبر کو پشاور کا کمشنر بونیر کے بعض قبائل کو اتحاد سے توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک اور گروہ کو جس کی تعداد ۲۰۰۰ تھی اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ اور سوات کے مہتر کو بھی اپنے خاص مریدوں کو منتشر کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر علیحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے۔ ۱۵ دسمبر کو یہ بے اعتمادی اپنا پھل لانے ہی والی تھی۔ بونیر قبائل کا ایک بڑا جرگہ کمشنر کے پاس آیا مگر شرائط طے نہ ہو سکیں۔ ۱۵ تاریخ کو ہم نے اُن کو جلد فیصلہ کرنے پر مجبور کرنے کے لئے لالو پر شبخون مارا اور اُن کے چار سو آدمی ہلاک ہو گئے۔ ۱۶ تاریخ کو ہم نے امبیلا کے گاؤں کو جلا دیا اور قبائل کے دو سو آدمی میدان جنگ میں ہلاک یا مجروح ہوئے۔ پیشتر اس سے پہلے ہی بونیر کے قبائل نے فیصلہ کر لیا اور کمشنر کے پاس حاضر ہو کر احکامات کے صادر ہونے کی درخواست کی۔ یہ علیحدگی مجاہدین کی امیدوں کے لئے موت کا حکم رکھتی تھی۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی قبیلہ علیحدہ ہو جاتا تھا۔ دیر اور باجوڑ کے لوگ بھاگ گئے۔ سوات کے فوجی علیحدہ ہو جانے کے لئے ہر وقت پا بہ رکاب بیٹھے تھے۔ یہ اتحاد کوہستانی کُہر کی طرح فوراً دور

---

[1] میجر جیمز، پشاور ڈویژن کا کمشنر۔

ہو گیا اور بونیر کے قبائل نے جن پر مجاہدین کا بہت کچھ انحصار تھا ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ اُن کو اُن کی دہاکشی غاروں میں ہی جلا دیا جائے گا اور ہفتہ کے اندر اندر انگریزی فوج کا ایک دستہ بونیریوں کی کمک اور رہنمائی میں پوری سلامتی کے ساتھ پہاڑوں میں سے گزرتا ہوا مجاہدین کی آبادی مُلکا تک پہنچ گیا اور اُس کو جلا کر راکھ کر دیا ۲۲ دسمبر کو یہ بدقسمت فوج درہ امبیلا میں واپس آگئی اور ۲۵ دسمبر کو تمام کی تمام فوج میدانوں میں آگئی اور گھر کو واپس آتے ہوئے اُن پر ایک گولی بھی نہ چلائی گئی۔

بہر حال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا ہے تو اُس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں ہمارا نقصان جاں ۸۴۷ ہلاک و مجروح تک پہنچ گیا تھا۔ یعنی تمام فوج کا دسواں حصہ جو ایک وقت میں مجموعی طور پر نو ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ نقصان صرف درہ میں ہوا تھا اور اِس کا اُن لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا جو سردی لگ جانے سے بیمار ہو گئے یا کسی بیماری کی وجہ سے مر گئے تھے۔ پنجاب گورنمنٹ نے اس مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اِس سے پہلے اور کسی موقع پر بھی کوہستان میں اس قدر شدید اور دیرپا جنگ نہیں ہوئی تھی اور یہ کہ اِن مجاہدین نے قبائل کا ایک خطرناک اتحاد پیدا کر لیا تھا اور اِس اتحاد میں اُن کی رائے کو بہت وقعت حاصل تھی۔ اور یہ کہ مجاہدین بے ضرر اور بے طاقت مذہبی مجنون نہیں ہیں اور یہ ہندوستان میں ہماری سلطنت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں اور یہ جو جہاد کا وعظ ہر وقت کرتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے تمام سرحدی قبائل یہ ہی وطیرہ اختیار کر لیں۔ اِس بحران کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ اِس وقت ہندوستانی سلطنت کے سر پر کوئی ذمہ دار حاکم موجود نہ تھا۔ وائسرائے لارڈ ایلجن LORD ELGIN ایک پہاڑی مقام پر بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے۔ اور تار کے ذریعے اُن تک خبر رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور وہ کام کرنے کے قابل بھی نہ تھے۔ باوجودیکہ اِس مہم میں ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس نے چار سال کے لئے سرحد کو بالکل خاموش کر دیا نصف کے قریب مجاہدین شہید ہو چکے تھے اور باقی ماندہ مجاہدین کو قبائل اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے اس لئے کہ اُن کی پہاڑوں کی وادیوں میں بھی وہ جنگ کا باعث ہوتے تھے۔ اِن غداروں کے سرداروں نے اپنے آپ کو اس قدر غیر مامون پایا کہ [1] ان میں سے دو نے براہ راست ہمارے افسروں سے گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ اُن کی اِن کوششوں کو ایک تیسرے سردار [2] نے ضائع کر دیا جس نے بار دیگر اُن کے جذبات کو برانگیختہ کرنا شروع کر دیا تھا [3]۔ بہر حال وہ ۱۸۶۵ء کے اخیر تک اپنے اندرونی جھگڑوں

[1] مولوی عبداللہ۔ [2] مولوی اسحاق و محمد یعقوب نے سید محمود کی وساطت سے جو پہلے ہماری ملازمت میں تھا کوشش کی تھی۔

ہیں اس قدر مشغول رہے کہ وہ ہمارے علاقوں میں تاخت و تاراج کی جرأت نہ کر سکے۔ مگر فروری ۱۸۶۸ء میں وہ سات سو جنگجوؤں کا ایک جتھا بنا کر نکلے تاکہ مختلف قبائل میں اتحاد پیدا کرنے کی بنیاد رکھیں لیکن اُس سزا کی یاد نے جو ہم نے ۱۸۶۳ء میں اُن کو دی تھی اُن کے اس کام کو بہت مشکل بنا دیا لیکن آہستہ آہستہ قبائل کا دینی تعصب اُن کی عقل پر غالب آ گیا انہوں نے اگرور کی وادی میں ہماری ایک چوکی پر حملہ کر دیا تھا۔ اُس وقت گورنمنٹ نے لکھا تھا کہ اگر اس کے متعلق ہم جلد کارروائی نہ کرتے تو ہمیں پھر ایک دفعہ بہت بڑے قبائلی اتحاد سے دو چار ہونا پڑتا۔ بہرحال انگریزی حکومت نے اس دفعہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے گا۔ ۶ ستمبر کو حکومت عالیہ نے قبائل کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجنے کی اجازت دے دی اور ۲۰ اکتوبر کو ہماری فوج نے کمانڈر انچیف کی رہنمائی میں کوچ کیا جو جنرل وائلڈ C.B (Wilde) کی ماتحتی میں تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے ایک اعلان شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ کس طرح بعض قبائل جن کو ہم نے کسی طرح تنگ نہیں کیا تھا۔ اور اُن کے علاقہ میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی ہماری چوکی پر حملہ کرنے کے بعد تلواروں اور جھنڈوں کے ساتھ ہمارے علاقہ میں آگھسے تھے اور ہمارے بعض دیہاتوں کو جلا دیا تھا اور اب ان کو سزا دینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ لہٰذا انگریزی حکومت جس کو بہت پریشان کیا جا چکا ہے اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی اور اب آپ لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کا جواب دیں۔

میں یہاں پر اس مہم کے واقعات کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا۔ جولائی کے مہینے ہی میں پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے ضروری برقی پیغامات موصول ہوئے تھے جن میں شورش برپا ہونے کی اطلاعات دی گئیں تھیں۔ جیسا کہ فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل[1] نے لکھا تھا "کہ تنبیہ اس قدر ضروری تھی اور مدد کے لئے التجا اس قدر اہم تھی اور حقیقتاً ہماری فوج کا ایک دستہ باغیوں کے محاصرہ میں تھا کہ حکومت ہند نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ جیسا کہ ۱۸۶۳ء کی تباہی نے سبق سکھا دیا تھا کمانڈر انچیف نے پنجاب کی فوجی چھاؤنیوں کو کمزور کرنے یا سرحدی چوکیوں سے فوجی دستے منگوانے کے بجائے شمال مغربی صوبوں سے رجمنٹیں منگوائیں تھیں۔ لڑائی لڑنے والا دستہ چھ ہزار سے سات ہزار باقاعدہ

[1] گورنمنٹ کے ملٹری محکمے کے سیکرٹری کو خط نمبر ۱۷۳ مجریہ ۵ نومبر ۱۸۶۸ء پیرا (۴)

فوج پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ باقی سرحد کی تمام فوج دُگنی کر دی گئی تھی۔ اور ہندوستان میں انگریزی فوج کے منتخب شدہ سپاہی مجاہدین کے مقابلہ میں جمع کر دیئے گئے تھے[1]۔ اگست اور ستمبر کی چلچلاتی دھوپ میں ہمارے سپاہی ایسی یلغار کر رہے تھے جس کی مثال خوشگوار اور معتدل آب و ہوا میں بھی مشکل سے ملے گی۔ مثلاً سرنگ لگانے والے اور خندق کھودنے والوں نے ۲۹ دن میں چھ سو میل کی مسافت طے کی۔ اندرون ملک کے صوبجات سے ہماری فوج بہت زیادہ تعداد میں سرحد پر جمع ہو گئی تھی جس سے قبائل بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے تھے اور مجاہدین کی قبائل کو اکٹھا کرنے کی کوشش رائیگاں گئی۔ ہم نے بہت زیادہ خرچ برداشت کر کے اپنی فوج کو مع توپخانہ کے کوہ سیاہ پر چڑھا دیا تھا۔ اور سرحدی اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

کوارٹر ماسٹر جنرل نے لکھا تھا "یہ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کس طرح انگریزی فوج یورپین اور ہندوستانی دس ہزار فٹ کی بلند پہاڑیوں پر چڑھی ہوئی ہے اور اُن کے درمیان جنگ کر رہی ہے اور کمانڈر جنرل تک کے لئے کوئی خیمہ نہیں[2]۔ بہر حال اس دفعہ بھی ہم شرارت کی جڑ تک پہنچنے میں بالکل ناکام رہے۔

پنجاب گورنمنٹ نے مہم کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ مہم ختم بھی ہو گئی اور ہم اس قابل نہ ہوئے کہ ہندوستانی مجاہدین کو وہاں سے نکال باہر کریں یا اُن کو اس بات پر ہی آمادہ کر سکیں کہ وہ اطاعت قبول کر لیں اور ہندوستان

---

[1] رائل توپخانہ کی D بیٹری اور F برگیڈ E بیٹری ۱۹ برگیڈ RA اور ۲۲-۲ برگیڈ R.A - ۱۹ اور ۶ نمبر کی پہلی بٹالین ۶۲ کی دو کمپنیاں)۔ ۱۰ بنگال کیولری۔ ۲۲ گورکھا رجمنٹ۔ ۲۴ نیو انفنٹری۔ یکے بعد دیگرے راولپنڈی سے ایبٹ آباد کو روانہ کر دی گئیں جو ضلع ہزارہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ۲۰ N.I نے لاہور سے ایبٹ آباد کو کوچ کیا۔ ۳۸ فٹ سیالکوٹ سے دربند جو ہزارہ میں ہے کی طرف روانہ ہوئی دربند کے دوران میں 1×1/8/3 بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ پہلی اور چوتھی گورکھا دوران کے پہاڑی علاقوں بلکوہ اور دھرم سالہ سے دربند کے ساتھ جا ملی۔ اس کے علاوہ جو اوپر بیان کی گئی ہیں ۲۰ و ۱۰ و ۲۲ N.I - ۹ بنگال کیولری اور ۲۰ سوار اپنی مختلف چھاؤنیوں کا یہ علیگڑھ امرتسر لاہور کیمبلپور اور راولپنڈی سے روانہ ہوئیں۔ اور ریزرو رکھی گئی تھیں۔ پشاور اور نوشہرہ میں بھی فوج کو تیار رہنے کا حکم تھا جو کوہاٹ اور یوسفزئی مردان کے مقابل ہے تاکہ گائیڈ کور کو مدد دے سکیں۔

[2] گورنمنٹ کے ملٹری شعبہ کے سیکرٹری کو کوارٹر ماسٹر جنرل کا خط نمبر ۹۳ مورخہ ۱۸۶۳ء

میں اپنے گھروں کو واپس آجائیں[1]

اب ہم نے اپنی سرحد پر اس باغی کیمپ کی تمام تاریخ ۱۸۳۱ء سے جب کہ اس کی ابتدا ہوئی ۱۸۶۸ء تک جب کہ آخری مرتہ انہوں نے ہمکو جنگ میں دھکیلا بیان کردی ہے۔ وہ تمام پرانی مصیبتیں جو انہوں نے سکھ حکومت کے وقت سرحد پر نازل کیں تھیں وہ تمام ایک تلخ وراثت کی صورت میں ہم تک پہنچیں۔ اس نے تمام سرحد میں تعصبی جذبات کو برقرار رکھنے کے علاوہ تین مرتبہ قبائل کو ایک جا اکٹھا کردیا جس کی وجہ سے برطانوی ہند کو ہر ایک موقع پر بہت ہی مہنگی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ یکے بعد دیگرے ہر گورنر نے اعلان کیا کہ یہ ہمارے لیے ایک مستقل خطرہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کو تباہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اب تک بھی یہ ہماری غیر وفادار رعایا اور ہمارے سرحد پار کے دشمنوں کی امیدوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس وقت ہم قبائل کی خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں آجائیں گے جو وسط ایشیا میں ہر وقت جاری رہتی ہیں۔ مگر اس وقت یہ بھی ممکن ہے کہ ا سال کے ختم ہونے سے پہلے ایک اور افغانی جنگ لڑنی پڑے۔ یہ جنگ جب کبھی بھی ہوگی۔ اور جلد یا بدیر یہ ہو کر رہے گی ہماری سرحد پر غدار آبادی ہمارے دشمنوں کو ہزارہا آدمی مہیا کرسکے گی۔ ہمیں ان غداروں کی اپنی ذات سے کوئی ڈر نہ اگر ہمیں ڈر ہے تو ان شورش پسند عوام سے ہے جن کو یہ مجاہدین ہمارے خلاف جہاد کرنے کے لیے بار بار اک کرتے ہیں۔ نو صدیوں کے دوران میں ہندوستانی لوگ شمال کی طرف سے حملہ ہونے کے عادی ہوچکے تھے اور کو شخص اس اہمیت کے متعلق پیشگوئی نہیں کرسکتا جسے یہ باغی کیمپ مغربی مسلمان خانہ بدوش گروہوں کی مدد سے ایک ا لیڈر کی سرکردگی میں جو اپنے اندر ایشیا کی قوموں کو جہاد کرنے کے لیے اکٹھا کرسکتا ہو حاصل کرسکتا ہے۔

---

[1] پنجاب گورنمنٹ کا خط مجریہ ۲ نومبر ۱۸۶۳ء پیرا نمبر ۲۲ ۱۸۶۸ء کی سرحدی مہم کی مندرجہ کیفیت بیان کرنے میں۔ نے اس خط سے مدد لی ہے۔ یا اس افسر کی رپورٹ سے جس کا ذکر کنیتا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ کوارٹر ماسٹر جنر خط مجریہ ۵ نومبر ۱۸۶۸ء مع ان فوجی کیفیات کے جو اس کے ساتھ ضمیمہ میں مدد لی گئی ہے۔

جو نصاریٰ اور بت پرست ہیں انہیں سے جو کوئی بھی صدقِ دل سے اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے اُسکے لئے اور ایسے تمام لوگوں کے لئے اُنکے رب کے ہاں اجر ہے اِنکے لئے نہ دنیا میں ڈرنے کی کوئی بات ہے نہ آخرت میں اِنکو حزن وملال اٹھانا پڑیگا اور اُس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم تورات کے قانون پر عمل پیرا ہوگے اور (جب تم نے تورات کے احکام پر عمل سے انکار کر دیا تو) ہم نے تمہارے سروں پر کوہِ طور کو لٹکا دیا اور (کہا کہ) ہم نے تم کو جو کتاب دی ہے اُس کو مضبوطی سے پکڑو اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اُسے یاد رکھو اور اُس پر عمل کرو اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارے اندر تقویٰ کا پیدا ہو جانا بہت یقینی ہے ﴿۶۳﴾ اسکے بعد پھر تم پھر گئے اور اگر تم پر اللہ کا احسان اور اسکی مہربانی نہ ہوتی تو تم خسارہ میں پڑ چکے تھے ﴿۶۴﴾ اور تم کو اُن لوگوں کا حال بھی خوب معلوم ہے جنہوں نے تم میں سے یوم سبت[1] کے حدود سے تجاوز کیا تھا اور ہم نے اُن سے کہا تھا کہ جاؤ ذلیل بندر ہو جاؤ ﴿۶۵﴾ اور اُس واقعہ کو ہم نے اُس زمانہ کے لوگوں نیز اُن کے بعد آنے والوں کیلئے ایک عبرت بنا دیا اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ایک نصیحت قرار دیا ﴿۶۶﴾ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ دیکھو خدا نے تمہیں حکم دیا ہے کہ ایک گائے کو ذبح کرو اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ اے موسیٰ! کیا تو ہم سے مذاق کرتا ہے؟ موسیٰ نے کہا کہ (مذاق کرنا جاہلوں کا کام ہے اور) میں جاہل بننے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں ﴿۶۷﴾ انہوں نے کہا "تو اپنے رب سے دعا کر وہ ہمیں بتائے کہ گائے کیسی ہو" موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے

[1] سبت ہفتہ کے روز کو کہتے ہیں۔ موسوی شریعت میں ہفتہ کا دن عبادت کے لئے مخصوص تھا اور اس دن دنیا کا روبار کرنا بالکل ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ مگر یہود ـــــ نام کے یہود، مردم شماری کے یہود، نہ کہ سچے ایمان اور نیک اعمال والے یہود ـــــ نے اُن تمام پابندیوں کو توڑ ڈالا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل تورات میں کتاب الخروج باب ۳۱ آیت ۱۴-۱۵ میں ملاحظہ کیجئے۔

کہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ جوان۔ درمیانی عمر کی ہو۔ سو تمہیں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے وہ بجا
لاؤ (۶۸) اُنہوں نے کہا "تو اپنے رب سے دعا کر وہ ہمیں بتلائے کہ اُس کا رنگ کیسا ہو"
موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد رنگ کی گائے ہو۔ جس کا رنگ خوب گہرا ہو۔
یہاں تک کہ دیکھنے والوں کو بہت اچھا لگتا ہو (۶۹) اُنہوں نے کہا کہ اے مُوسیٰ! تو اپنے رب سے کہہ وہ
ہمیں بتلائے کہ وہ گائے کیسی ہے کیونکہ یہ گائے جس کی شکل و شباہت تو نے بیان کی ہے
اسکا ہمیں پتہ نہیں چلتا اور اگر اللہ نے چاہا تو ہمیں ضرور اس کا پتہ چل جائے گا (۷۰) مُوسیٰ نے
کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہو جسے ابھی ہل میں جوتا نہ گیا ہو جو نہ زمین جوتتی ہو اور نہ
کھیتی باڑی کو پانی دیتی ہو کسی قسم کا عیب نہ رکھتی ہو اور ہر قسم کے داغ دھبے سے خالی ہو۔ انہوں
نے کہا کہ اب تو نے صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک بتایا ہے اسکے بعد اُنہوں نے اُسے
ذبح کیا گو وہ پہلے ایسا کرتے نظر نہ آتے تھے (۷۱) اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر
ڈالا تھا اور الزام ایک دوسرے پر تھوپنے لگے تھے اور اللہ کو وہ چیز ظاہر کرنی تھی جو تم چھپاتے
تھے (۷۲) لہٰذا ہم نے کہا کہ اس مُردہ پر گائے کا ایک ٹکڑا مارو اور چنانچہ اُن کا ایسا کرنا تھا کہ وہ
شخص جسے قتل کیا گیا تھا زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کا نام بتا دیا۔ لوگو! خوب یاد رکھو
اللہ اسی طرح مُردوں کو زندہ کرے گا۔ اور وہ تم کو اپنے نشانات دکھاتا رہتا ہے ہو سکتا ہے
کہ تم سمجھ جاؤ (۷۳) (اس واقعہ سے تمہارے دلوں میں کچھ عرصہ کے لئے اللہ کا خوف پیدا ہو گیا مگر)
پھر اُس کے بعد تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے۔ بلکہ سختی میں پتھر سے بھی زیادہ بُرے کیونکہ
پتھروں میں سے بعض ایسے پتھر بھی ہیں جن سے دریا نکلتے ہیں اور اُن میں ایسے پتھر بھی ہیں جو اللہ
کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اے یہود اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے (۷۴) (مسلمانو!
تم یہود کی سنگ دلی اور نافرمانیوں کی طویل حکایت سن چکے ہو) کیا اب بھی تم طمع رکھتے ہو

کہ وہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے جبکہ ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہو چکا ہے جو اللہ کے
کلام کو سنا کرتے تھے۔ پھر جب وہ سوچ سمجھ چکتے تو اُسے بدل ڈالتے اور خوب جانتے ہوتے
کہ کیا کر رہے ہیں (۷۵) اور اب ان کی یہ حالت ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں
کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ
تم مسلمانوں سے وہ باتیں کیوں کہتے ہو جنکا علم اللہ نے تمہیں دیا ہے کیا اسلئے کہ وہ اللہ کے سامنے
تم پر اتمام حجت کریں کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے (۷۶) کیا انکو معلوم نہیں ہے کہ جن صداقتوں
کو یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں وہ سب اللہ کو معلوم ہیں (۷۷) اور انہیں سے بعض
ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا کوئی علم نہیں۔ انکو صرف جھوٹی اور خوش آئند تمناؤں اور خود
ساختہ قصوں اور افسانوں کے سوا کسی چیز کا علم نہیں اور وہ جو بات بھی کرتے ہیں قیاس اور
تخمینے سے کرتے ہیں (۷۸) اسی طرح بُرا ہو اُن کے عالموں کا جو اپنے ہاتھوں سے تورات کو
لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اسطرح وہ اُسے بیچکر کچھ مالی
فائدے حاصل کر سکیں۔ بُرا ہو اُنکا اس تحریر کی وجہ سے جو انہوں نے لکھی اور بُرا ہو اُن کا
اُس چیز کی وجہ سے جو انہوں نے حاصل کی (۷۹) اور ان تمام بداعمالیوں، نافرمانیوں اور سرکشیوں
کے نہ ختم ہونیوالے سلسلے کے باوجود) وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہم کو نہ چھوئیگی اور اگر اس
نے چھوا بھی تو صرف چند گنے چنے روز۔ تم ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد
لے رکھا ہے اگر عہد لے رکھا ہے تو اللہ ہرگز اُسکی خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ کے
متعلق یونہی ایسی باتیں کہتے رہتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں (۸۰) سنو جو کوئی بھی برے
کام کرے گا اور اُس کو گناہوں نے گھیر رکھا ہو گا (وہ خواہ کوئی یہودی ہو یا غیر یہودی) ایسے
سب لوگ دوزخ میں جائیں گے اور دوزخ ہی میں ہمیشہ رہیں گے (۸۱) اور وہ لوگ

جو سچے دل سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ وہی لوگ اہل جنت ہونگے اور وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے (۸۲) اور وہ واقعہ یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے، والدین، قرابت داروں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرو گے حسن اخلاق اور حسن معاملت کی تعلیم دو گے، نماز پڑھو گے اور زکواۃ دو گے لیکن چند ایک کو چھوڑ کر باقی تم سب نے اس معاہدہ کی طرف سے منہ پھیرا اور اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور تم ہو ہی اُلٹے راستے جانے والے (۸۳) اور وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم آپس میں خون نہ کرو گے اور نہ ایک دوسرے کو اپنے شہروں سے نکالو گے۔ تم نے اس معاہدہ پر قائم رہنے کا اقرار کیا اور (اے یہود) تم اس بات کو مانتے ہو (۸۴) اس کے بعد تم لوگ وہ ہو جو آپس میں خون کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک فریق کو اُن کے شہروں سے نکال دیتے ہو۔ اُن کے خلاف، اُن کے دشمنوں کو ناجائز اور سراسر ظالمانہ مدد دیتے اور اُن سے مدد لیتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو تم معاوضہ[1] دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو۔ حالانکہ اُن کا شہروں سے نکالنا ہی سرے سے تمہارے اوپر حرام قرار دیا گیا تھا۔ یہ کیا بات ہے کہ تم تورات کے بعض احکام پر ایمان للاتے انہیں مانتے اور اُن پر عمل کرتے ہو اور بعض سے عملاً انکار کر دیتے ہو۔ خوب سن رکھو کہ تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا۔ اُس کی سزا دنیا میں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہو نہیں سکتی اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب میں پہنچایا جاوے گا۔ اور خوب یاد رکھو کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں (اُس کو تمہاری حیلے سازیاں، تمہاری فریب کاریاں تمہارا اخلاص اور تمہاری منافقت سب چیز کا پورا پورا

---

[1] موسوی شریعت میں اس امر کی بڑی تاکید تھی کہ اگر کوئی یہودی قید ہو کر آئے تو اُسے معاوضہ دے کر چھڑا لیا جائے اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم لوگ اکثر احکام الہٰی کو تو چھوڑ دیتے ہو مگر وہ چند ایک احکام جن پر تم بوجہ رسم و رواج پابند ہو انہیں بجا لاتے ہو حالانکہ یہ بھی ایک جرم ہے۔

حال معلوم ہے) (۸۵) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کو دے کر دُنیا کی زندگی کو خرید لیا ہے لہٰذا
اُن کی سزا کو (خواہ وہ دُنیا میں دی جائے یا آخرت میں) ہلکا نہ کیا جاوے گا اور نہ کسی طرح اُن
کی مدد کی جاسکے گی (۸۶) اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو تورات دی اور اس کے بعد پے در پے
کئی رسُول بھیجے اور عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے صریح معجزات دیئے اور جبریل کے ذریعے اسکی امداد کی۔
لیکن اسکے باوجود کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کبھی کوئی رسُول وہ احکام اور ہدایات لیکر تمہارے
پاس پہنچا جو تمہارے ذوق پر گراں تھیں تو تم نے اپنی اہمیت اور اپنی معلومات کو بڑا ثابت کرنا
چاہا اور اسطرح بعض نبیوں کو تم نے کہا کہ تم جھوٹے ہو اور بعض کو جان سے ہی مار دیا (۸۷)
(یہود کے گذشتہ حالات و واقعات تم سن چکے اب جبکہ اسلام اُنکے سامنے پیش کیا گیا ہے)
انہوں نے کہہ دیا ہے کہ ہمارے دِلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے (ہم پر اب اسلامی تعلیمات کا
کوئی اثر نہیں پڑ سکتا) سنو یہ بات نہیں ہے، بلکہ اُنکے پیہم کفر و انکار کی وجہ سے اللہ نے
اُن پر لعنت کر دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لا سکتے (۸۸) اور جب اُنکے پاس
اللہ کی طرف سے قرآن آیا جس نے اس کتاب کی تصدیق کی جو اُن کے پاس ہے (۸۹)
اور اس سے قبل وہ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ! ان کافروں کے خلاف جو تورات کو نہیں
مانتے۔ نبی آخر الزمان کو بھیجکر ہماری مدد کر ـــــ تو جب اُنکے پاس وہ رسول آیا جسے انہوں
نے تورات کے بتلائے ہوئے نشانات کی مدد سے) پہچان لیا، تو انہوں نے اس پر ایمان لانے
سے انکار کر دیا (ایسے ضدّی، غیر معقول اور بد ذوق منکروں پر اللہ کی لعنت ہو (۹۰)
کس قدر بری ہے وہ قیمت جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچا کہ اللہ نے جو کلام نازل
کیا ہے اُس سے وہ انکار کریں (اور وہ بھی محض) اس حسد کی بنا پر کہ اللہ اپنے بندوں میں سے
جس کسی پر چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے اپنا کلام نازل کر دیتا ہے۔ بدیں وجہ وہ اپنے اوپر

غضب پہ غضب لے آئے اور کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب ہو گا (۹۱) اور جب اُن سے
کہا جاتا ہے کہ (اے یہود ا) اللہ نے اب جو کلام نازل کیا ہے اُس پر ایمان لے آؤ۔ تو وہ کہتے ہیں
کہ جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے ہم اُسے مانتے ہیں۔ اور اُس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اُسے نہیں مانتے
حالانکہ یہ (قرآن) کلام حق ہے۔ اور اُس کتاب کی جو یہود کے پاس ہے تصدیق کرتا ہے (ذرا
اُن سے) پوچھو کہ اگر تم واقعی اپنی کتاب کو مانتے ہو۔ تو (بتاؤ کہ) اس سے قبل تم نے نبیوں کو قتل
کیوں کیا (۹۲) مُوسیٰ تمہارے پاس صریح احکام اور کھلے نشانات لیکر آیا لیکن اس کے باوجود
تم نے اُس کے پیچھے گائے کے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اور تم تو قوم ہی ایسی ہو جو عادۃً ظالم
و نافرمان ہو (۹۳) اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تمہارے سروں کے اُوپر
طور کو لٹکا دیا تھا۔ (اور کہا تھا کہ) جو کچھ ہم نے دیا ہے اس کو قوت سے پکڑے رہو اور فرمانبردار
بن کر سنو۔ (تمہارے بڑوں نے جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا) کہا کہ ہم نے سنا اور نہیں مانا۔
اور (وُہ سنتے اور مانتے بھی کس طرح کیونکہ) پیہم کفر و انکار کی وجہ سے اُن کے دلوں میں گائے کے
بچھڑے کی محبت رچا دی گئی تھی (اے پیغمبر اسلام ان کو بتا دو کہ تمہارا ایمان جس بات پر تمہیں لگا
رہا ہے وہ بہت ہی بُری ہے تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے اگر تم ایمان والے لوگ
ہو (۹۴) (اے پیغمبر! یہودیوں سے) تم کہدو کہ تمام لوگوں میں سے آخرت کی آسائشیں اور اُس کی
نعمتیں تنہا تمہارے ہی لئے ہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو (۹۵) تم خوب یاد رکھو کہ اپنے
اعمال کے پیش نظر وہ ہرگز کوئی ایسی تمنا نہ کرینگے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے (۹۶) (اے
پیغمبر اسلام) تم ان یہودیوں کو تمام لوگوں سے بڑھکر جان کے پیارے دیکھو گے حتیٰ کہ یہ اُن
مشرکوں سے بھی زیادہ اس جان کو عزیز رکھتے ہیں جن کو آخرت پر کوئی ایمان نہیں۔ ان میں
سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ وہ ایک ہزار سال تک جیتا رہے (سنو او راس حقیقت کو یاد

رکھو کہ) کوئی شخص عذابِ الٰہی سے محض اس لئے نہیں بچ سکتا کہ اس نے لمبی عمر پائی ہے اللہ
تمہارے اُن اعمال کو دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۹۷﴾ (اے پیغمبر) کہہ دو کہ جو کوئی جبریل کا محض اِس لئے
دشمن ہے کہ اُس نے اللہ کے حکم سے تیرے دِل پر اُس کلام کو اتار لیا ہے جو اُس کتاب کی تصدیق
کرتا ہے جو اُنکے پاس ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے راہ دکھانے اور خوشخبری دینے
والا ہے ﴿۹۸﴾ سو، جو کوئی اللہ کا، اس کے ملائکہ کا، اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکائیل
کا دشمن ہے تو وہ یاد رکھے کہ اللہ کافروں کا دشمن ہے ﴿۹۹﴾ اور (اے پیغمبر) ہم نے تجھے بالکل
کھلے کھلے اور واضح احکام دیئے ہیں اور اُن کی تعمیل کرنے سے ماسوا اُن کے جو عادی بدکار
اور نافرمان ہیں کوئی انکار نہیں کر سکتا ﴿۱۰۰﴾ یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے جب کبھی (اللہ
اور اُس کے رسُول کی اطاعت کا) عہد باندھا تو اُن میں سے ایک فریق نے اُسے دے پھینکا
بلکہ اکثروں نے تو سروں سے اُس عہد کو مانا ہی نہیں ﴿۱۰۱﴾ اور جب بھی اللہ کی طرف سے اُن
کے پاس کوئی رسول آیا ہے جس نے تورات کی جو اُن کے پاس ہے تصدیق کی، تو انہیں
سے جو تورات کے علم سے واقف تھے اِن میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو ایسا پسِ پشت
ڈالا کہ گویا اُن کو اُس کا کوئی علم ہی نہیں ﴿۱۰۲﴾ اور (بجائے تورات کے ٹھوس علم کے) وہ اُن
خرافات کے پیچھے ہو لئے جن کی اشاعت شریر النفس جہلاء سلیمان پیغمبر کے زمانہ میں کیا کرتے تھے اور
سلیمان پیغمبر کافر نہیں تھا کہ وہ خرافات اور بے سروپا سنی سنائی باتوں کے پیچھے ہو لیتا)
ہاں کافر تھے وہ شریر النفس جہلاء جو لوگوں کو جادوگری، شعبدہ بازی، ہپناٹزم، مسمریزم اور
اسی قسم کی دُوسری خرافات سکھاتے تھے اور وہ (علمائے یہود بجائے کلام الٰہی کے) اُن تعلیمات
کو سیکھنے اور ماننے لگے جو (بقول اُن کے) بابل کے دو فرشتوں ہاروت ماروت پر نازل

۱؎ نجات کا دارومدار عمر کے لمبا یا چھوٹا ہونے پر نہیں ہے بلکہ اُس کا دارومدار اعمال کے اچھا یا برا ہونے پر ہے

کی گئی تھیں۔ یہ ہاروت و ماروت کسی کو یہ خرافات نہ سکھاتے تھے جب تک (جذبِ قلوب کیلئے) یہ نہ کہہ لیتے تھے کہ دیکھو ہم تو محض مصیبت اور عذاب میں پڑے ہوئے ہیں تو الٰہی کلامِ الٰہی کو چھوڑ کر اور ان خرافات کے پیچھے وقت ضائع کر کے) کافر نہ بن لیکن وہ اس کے باوجود اُن سے ایسی ایسی باتیں سیکھتے جن سے وہ میاں بیوی تک میں جدائی ڈلوا دیتے ——— اور یاد رکھو کہ یہ لوگ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے جب تک اللہ کی طرف سے اجازت نہ ہو ——— اور وہ لوگ (کتابِ الٰہی کو چھوڑ کر) وہ وہ خرافات سیکھتے جن سے اُن کا وقت ضائع ہوتا اور انہیں نقصان پہنچتا اور فائدہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ حالانکہ اُن کو خوب معلوم ہے کہ جو کوئی کتابِ الٰہی کے بدلے کسی اور چیز کو حاصل کریگا۔ آخرت میں اُس کا کوئی حصّہ نہ ہوگا۔ اور کتنی بری ہے وہ قیمت ——— دنیاوی فوائد اور لذّاتِ نفس ——— جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے۔ اے کاش اُن کو اس بات کا علم ہوتا (۱۰۳) اے مسلمانو! اپنے نبی کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لئے لفظ "رَاعِنَا" کا استعمال نہ کیا کرو (کیونکہ یہود اس لفظ کے تلفّظ میں تھوڑا سا تصرّف کر کے اسے گالی اور تضحیک کا کلمہ بنا لیتے ہیں) تم "اُنْظُرْنَا" کے لفظ سے نبی کو مخاطب کرو اور جو کچھ وہ کہے اُسے (ادب سے) سنو۔ یاد رکھو نہ ماننے والے بے ادب اور گستاخ لوگوں کے لئے دردناک عذاب تیار ہے (۱۰۴) دیکھو ان اہلِ کتاب میں سے جو لوگ ایمان لا کر مسلمان نہیں ہوئے۔ نہ یہ اور نہ مشرکین اس بات کو پسند کرتے ہیں۔ کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی اچھی چیز (خواہ وہ علم و نصرت ہو اور خواہ برکاتِ نبوّت) نازل ہو لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کیلئے چُن لیتا ہے (وہ کسی ایک قوم یا کسی ایک قبیلہ کے لئے مخصوص ہو کر نہیں رہ گیا) یاد رکھو اللہ بڑے فضل و کرم اور بڑی بلند شان والا ہے (۱۰۵) (اے پیغمبرِ اسلام! یہود جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تورات کو تم اللہ کا کلام مانتے ہو اور قرآن کو بھی حالانکہ قرآن کے بعض

احکام صریحاً تورات کے احکام کے خلاف ہیں پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ تورات میں اللہ نے جو کچھ حکم دیا ہے قرآن میں اُسکے خلاف کچھ اور کہے، تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ) اگر ہم کسی حکم کو منسوخ کرتے ہیں یا اُسے بھلا دیتے ہیں، تو اس سے بہتر یا اُس جیسا اور حکم (بمقتضائے وقت) دے دیتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۱۰۶) کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے (اور اس بادشاہت کو چلانے کے لئے وہ جسے اور جب چاہتا ہے احکام بھیجتا رہتا ہے اور اس کے احکام کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ سنو، لوگو! اگر تم اللہ سے بغاوت کرو اور اس کے احکام کے ماننے میں پس و پیش کرو تو یاد رکھو کہ) اللہ کے ماسوا کوئی نہیں ہے جو تمہیں اُس کے عذاب سے پناہ دے سکے اور اُس کے مقابلہ میں تمہاری مدد کر سکے (۱۰۷) (اے مسلمانو! یہود کے اکسانے پر) کیا تم بھی چاہتے ہو کہ اپنے رسُول سے سوالات پوچھو جیسا کہ اس سے قبل موسیٰ سے سوالات پوچھے گئے (اور اُسے پریشان کیا گیا۔ سنو، اس طرح شک و شبہ میں پڑ کر سوالات کا پوچھنا یا پیغمبر کے لئے پریشانی کا موجب بننا، ایمان کو ضائع کرنا ہے) اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر حاصل کرے، تو سمجھ لو کہ وہ شاہراہ کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستہ پر ہو لیا (۱۰۸) اے مسلمانو! بعد اس کے کہ یہود کو حق بات معلوم ہو چکی ہے اُن میں سے اکثر از راہ حسد دل سے چاہتے ہیں کہ تمہارے مسلمان ہو جانے کے بعد وہ تمہیں پھر کافر بنا ڈالیں۔ مگر سر دست تم اِن شرارتوں کو معاف کرو اور اِن سے در گذر کرتے رہو حتیٰ کہ (اس بارہ میں) اللہ تمہیں کوئی حکم دے۔ خوب یاد رکھو کہ (یہ یہود تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے) گو علم و فضل واثر و رسوخ، مال و دولت اور کثرتِ افراد کے لحاظ سے تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر قوی اور مضبوط ہیں مگر) اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے (وہ جو کچھ کرنا چاہے اُس کے لئے مشکل نہیں) (۱۰۹) اے مسلمانو! یہود کی شرارتوں سے بچنا چاہتے ہو۔ تو اپنے اندر اعلیٰ

قوت پیدا کرو اور منظم ہو جاؤ اور وہ اسطرح کہ) تم پابندی سے نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور (اسکے
علاوہ) قوم کے لئے جو کچھ تم از راہِ خیرات وصدقات دوگے یا انفرادی و اجتماعی نیکی کا کوئی کام
کروگے۔ اُس کا اجر تم اللہ کے پاس پاؤ گے خوب ذہن نشین کر رکھو کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ
اُسے دیکھتا ہے (۱۱۰) (اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں کہ جنت میں صرف وہی جائیگا جو
جو یہودی ہو یا نصرانی"۔ یہ اُن کی خوش عقیدگیاں اور جھوٹی آرزوئیں ہیں۔ اِن سے کہدو کہ اگر تم سچے
ہو تو اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل لاؤ (۱۱۱) مسلمانو! یہود و نصاریٰ کا یہ دعوے بالکل غلط
ہے سُنو جنّت میں صرف وہی داخل ہوگا جس نے اپنے آپ کو اللہ پر چھوڑ دیا، اُسی کا ہو رہا اور
دل سے مخلص ہو کر نیکی کے کام کرنے والا ہو۔ ایسے شخص کا اجر اُس کے رب کے پاس ہے اور
ایسوں کے لئے نہ دنیا میں کوئی ڈر ہے نہ آخرت میں اُن کو غم کھانا پڑے گا (۱۱۲) ع اور سُنو
یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ حق پر نہیں ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود حق پر نہیں ہیں حالانکہ
دونوں ایک ہی کتاب[۱] پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کی باتیں وہ لوگ[۲] بھی کرتے ہیں جن کو کچھ معلوم
نہیں۔ یاد رکھو کہ اِن جھگڑا کرنے والوں کے درمیان قیامت کے روز اللہ اُن تمام باتوں کا
فیصلہ کردے گا جن میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہیں (۱۱۳) (مسلمانو!
یہود، نصاریٰ اور مشرکین جو اس وقت تمہارے مدِ مقابل ہیں، تم اُن کی اخلاقی حالت، اُنکی
مذہبیت اور اُن کی سیاہ کاریوں سے واقف ہو چکے ہو۔ یہ لوگ وعظ و نصیحت سے راہِ راست
پر آنے والے نہیں ہیں۔ یہ تمہیں مسجدوں میں جانے سے روکتے اور تمہاری عبادت میں مخل
ہوتے ہیں) اور اُس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں کو اسلئے بند
کردے کہ انمیں اللہ کا نام لیا جارہا ہے اور انکی خرابی اور بے آبادی کے لئے کوشش کرے

[۱] بائیبل [۲] مشرکین جن کے پاس کوئی آسمانی صحیفہ نہیں ہے

حق تو یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ کی مسجدوں میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوتے (چہ جائیکہ یہ گستاخانہ وہاں
آئیں اور عبادت گذاروں کو تنگ کرکے وہاں سے نکال دیں) ان لوگوں کے لئے دُنیا میں
ذلّت ورسوائی[1] ہے اور آخرت میں ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہوگا (۱۱۴) (مسلمانو!) تمہیں
مسجدوں میں نماز گذارنے سے روکا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کھلے میدانوں میں گھروں میں
یا جہاں تمہارا جی آئے نماز گذارو یاد رکھو کہ) یہ مشرق ومغرب اللہ ہی کے ہیں، سو تم جدھر
منہ کروگے اُدھر ہی اللہ کو پاؤگے۔ یہ یاد رکھو کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے وہ کسی خاص جگہ میں گھرا
ہؤا نہیں اور اُسے ہر چیز کا علم ہے کوئی اُسے دھوکا نہیں دے سکتا (۱۱۵) (مسلمانو! یہ یہود
ونصارٰی اور یہ مشرکین خدائے واحد کی عبادت نہیں کرتے) یہ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد (بھی)
رکھتا ہے (سو یہ اُس مزعومہ اولاد کو اپنا قاضی الحاجات بنائے بیٹھے ہیں) مگر خبردار مسلمانو!
اللہ ان عیوب سے پاک اور بالاتر ہے، اُس نے کسی کو اولاد نہیں بنا رکھا (اور اس کو اس کی
ضرورت ہی کیا ہے) یہ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور ہر چیز اس کی مطیع اور
اور فرمانبردار ہے (۱۱۶) ان آسمانوں کا اور زمین کا وہی خالق ہے اور ایسا خالق کہ اُس نے
ان کو کسی سابقہ نمونہ پر نہیں بنایا اور نہ پہلے سے موجود کسی مادہ سے اِن کو تخلیق کیا ہے بلکہ
یہ اُس کی صنعت وکاریگری کا بے مثال، لاجواب اور حیرت زا نمونہ ہے اور اُسکے لئے یہ کیں
مشکل ہی کیا ہے وہ جب کسی کام کو سرانجام دینے کا ارادہ کرلیتا ہے اور اُسے صرف اتنا کہتا
ہے کہ "ہوجا" اور وہ ہوجاتا ہے (۱۱۷) اور وہ لوگ جو[2] کچھ نہیں جانتے وہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ
ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی (کہ ہم پیغمبر اسلام
کو سچا مانیں) ــــ اسی طرح کی باتیں وہ لوگ بھی کیا کرتے تھے جو ان سے پہلے ہوگذرے

[1] - یہ پیشگوئی تھوڑے ہی عرصے کے بعد حرف بحرف پوری ہوکر رہی اور تاریخ اب تک اس پر شاہد ہے۔
[2] مشرکین عرب۔

ہیں ان سب کے دِل ایک جیسے ہیں ـــــ ایک کیا ہم نے کئی نشانیاں[1] واضح کر دی ہیں لیکن
انکو دیکھتے وہی لوگ ہیں جو یقین لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ﴿۱۱۸﴾ یہ بات شک و شبہ سے بہت
بالا ہے کہ ہم نے تجھے مذہب حق دے کر بھیجا ہے تاکہ تو ایمان لانے والوں کو انکے نیک انجام
کی خوشخبری دے اور نہ ماننے والوں کو اُن کی بدانجامی کے نتائج و عواقب سے ڈرائے اور (ایمان
لانا یا نہ لانا لوگوں کا اپنا کام ہے) تجھ سے ایسے لوگوں کے متعلق کوئی بازپرس نہ ہوگی جو دوزخ
کے مستحق ہیں ﴿۱۱۹﴾ اور یہ یہود و نصاریٰ تجھ سے اُس وقت تک ہرگز خوش نہیں ہوسکتے جب
تک تو اُن کے دین کا تابع نہ ہوجائے ـــــ ان کو کہدو کہ اصل ہدایت وہی ہے جو اللہ کی
طرف سے ہے ـــــ اور اگر تو نے اب اُن کی خواہشات کی پیروی کی جبکہ تجھے دین کا
صحیح صحیح علم پہنچ چکا ہے تو (یاد رکھ لے کہ) تجھے اللہ سے نہ کوئی پناہ دے سکیگا اور نہ کوئی
تیری مدد کر سکے گا ﴿۱۲۰﴾ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے (اور) وہ اُسے پڑھتے ہیں جیسا
کہ پڑھنے کا حق ہے (یعنی نہ اُسکے معنیٰ و تاویل میں تحریف کرتے ہیں اور نہ عمل سے جی چراتے
ہیں) حقیقت میں وہی لوگ ہیں جو اُس کتاب کو مانتے ہیں اور جو کوئی اسے نہیں مانتا وہ اور
ویسے سب لوگ خسارہ میں رہنے والے ہیں ﴿۱۲۱﴾ ع اے اسرائیل کی اولاد! تم میری اُن مہربانیوں　ع
کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیں اور اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تم کو تمام اہلِ جہاں پر ترجیح
دے رکھی تھی ﴿۱۲۲﴾ اور پھر اُس دن سے ڈرو جس دن کوئی متنفس کسی دوسرے کے کام نہ
آسکے گا، نہ کسی کی سفارش کام دیگی اور نہ ایسے لوگوں کو کہیں سے مدد پہنچ سکے گی ﴿۱۲۳﴾ اور
یاد کرو اُس واقعہ کو جب تمہارے مورثِ اعلےٰ حضرتِ ابراہیم کو اُسکے رب نے چند باتوں میں
آزمایا اور وہ اُن میں پورا اترا تھا، تو اللہ نے کہا کہ اے ابراہیم میں تجھے تمام لوگوں کا پیشوا بنانے

---

[1] قرآن جیسا بےمثال کلام جس کی نقل اتارنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔

والا ہوں۔ ابراہیم نے کہا اے اللہ! میری نسل میں سے بھی بعض کو لوگوں کا پیشوا بنا دے اللہ
نے کہا (کہ بہت اچھا مگر یاد رکھ) کہ میرا یہ اقرار اُن سے نہیں ہے جو نافرمان، بدکار، بدعمل
اور اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑنے والے ہونگے (۱۲۴) اور یاد کر جب ہم نے خانہ کعبہ
کو لوگوں کے جمع ہونے اور امن و امان سے محفوظ رہنے کا مقام بنایا ——— تم اے
مسلمانو! مقامِ ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ ——— اور ابراہیم اور اسماعیل دونوں سے ہم نے اقرار
لیا۔ کہ دیکھو تم دونوں نے میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں، یہاں ٹھہرنے والوں، اور
رکوع سجود کرنے والوں کیلئے صاف ستھرا رکھنا ہوگا (۱۲۵) یاد کرو اس دُعا کو جب ابراہیم نے کہا تھا
کہ اے میرے رب! اس شہر مکہ کو امن و امان کا ایک شہر بنا دے اور اس شہر میں رہنے والوں میں
سے جو کوئی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے انکو کھانے کیلئے پھل اور میوے دے۔ اللہ نے کہا کہ جو
کوئی ایمان نہ لائیگا۔ اسکو بھی ایک قلیل عرصہ تک (یہاں رہنے کا) فائدہ اٹھانے دونگا پھر اس کو
دوزخ کے عذاب کی طرف کھینچ لاؤنگا ——— بہت بری جگہ ہے دوزخ (۱۲۶) اور اے یہود یاد
کرو اُس واقعہ کو) جب ابراہیم اور اسماعیل (دونوں باپ بیٹا) بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے
(اور زبان سے کہہ رہے تھے کہ) اے ہمارے رب! (ہماری اس محنت، کوشش اور خلوص کو)
ہماری طرف سے قبول فرما۔ اے اللہ! تو ہماری التجا کو سننے اور ہماری نیت اور خلوص کو جاننے
والا ہے (۱۲۷) اے ہمارے رب! تو ہم دونوں کو اپنا مخلص فرمانبردار بنا لے اور ہماری نسل میں سے ایک
ایسی جماعت بنا لے جو تیری فرمانبردار ہو اور (اے رب!) ہمیں اپنی عبادت کے راستے دکھا دے اور
بالخصوص حج کے طریقے بتا دے اور ہم پر (ہمیشہ) مہربان رہ۔ صرف تو ہی (اے رب) توبہ قبول کرنیوالا
رحم کرنے والا ہے (۱۲۸) اے ہمارے رب! اس فرمانبردار جماعت (اُمت مسلمہ) میں ایک ایسا
رسول پیدا کر جو انہیں میں سے ہو جو انہیں تیرے احکام اور تیری وحی پڑھ کر سنائے۔

اور انہیں قرآن اور اس کے حکمت و فلسفہ کی تعلیم دے اور انہیں شرک اور نافرمانی کی نجاست سے پاک کرے ـــــ تو ایسا غالب ہے کہ جس بات کا ارادہ کرے اُس سے تجھے کوئی روک نہیں سکتا اور ایسا دانا ہے کہ تیری حکمت و دانائی تمام عیوب سے پاک ہے (۱۲۹) اور ابراہیم کے اعتقاد اور طریقے سے کون مُنہ موڑ سکتا ہے ماسوائے اس کے جو خود بخود بے وقوف بن بیٹھے ــــ ہم نے تو اُسے دُنیا میں منتخب کر لیا ہے اور آخرت میں بھی یقیناً وہ صلحاء کے زمرہ میں ہوگا (۱۳۰)

(اگر تم چاہتے ہو کہ ابراہیم کو تمہارا پیشوا بنائے جانے کی وجہ تمہیں معلوم ہو، یا یہ معلوم ہو کہ ہم نے اُسے اتنے بڑے اعزاز اور انعام کے لئے کیوں منتخب کیا تو اسوقت کو یاد کرو) جب اسکے رب نے اس سے کہا تھا (کہ اے ابراہیم!) اپنے آپ کو میرے سپرد کر دے اور میرا فرمانبردار بن جا تو اس نے (جھٹ سے) پکار دیا تھا کہ ہاں میں نے اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیا اور اس کا فرمانبردار بن گیا جو تمام کائنات کا خالق، مربّی اور نگہبان ہے (صرف اسی ایک واقعہ سے تم اندازہ کر لو کہ ابراہیم ہمارا کس قدر مخلص فرمانبردار تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے ہماری نگاہ میں عزت کا وہ مقام پایا جو کسی دُوسرے کو کم نصیب ہوگا) (۱۳۱) اور اسی موحدانہ اعتقاد اور مخلصانہ فرمانبرداری (دینِ ابراہیمی) کی وصیت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب کو، کی (اُن سے کہا کہ) اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے اس دین[1] کو منتخب فرمایا ہے لہٰذا تمہاری موت نہیں ہونی چاہیئے الّا محض ایسی حالت میں جبکہ تم اس دین پر پوری طرح قائم ہو یا بالفاظِ دیگر پکے موحّد، خدا پرست خدا شناس اور خدا کے پُورے پُورے مطیع و فرمانبردار رہو (۱۳۲)

(اے یہود! تم غلط کہہ رہے ہو کہ یعقوب نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کو "یہودیت" پر قائم رہنے کی وصیّت کی تھی سنو) جب یعقوب کی موت کا وقت قریب آیا، جب اس نے اپنے بیٹوں سے

---

[1] دین سے مراد دینِ ابراہیمی یعنی کامل اطاعت اور موحدانہ اعتقاد کا دین جو حضرت ابراہیم کا دین تھا اور خواہ عبرانی وغیرہ زبانوں میں اسکا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو، عربی زبان میں اسکا نام "اسلام" ہے۔

چھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے، تو تم حاضر نہ تھے۔ (معلوم ہے انہوں نے کیا جواب
یا) انہوں نے جواب دیا تھا کہ (ابا!) ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادوں، ابراہیم، اسماعیل اور
سحاق کے معبودِ واحد، کی عبادت کرینگے اور اُسی کے فرمانبردار اور عبادت گذار ہم اب ہیں (۱۳۳)
دیکھو یہود وانبیاء فرمانبرداروں اور خدائے واحد کے پرستاروں کی) یہ جماعت تھی جو گذر چکی ہے
ہ اپنا بویا کاٹیں گے اور تم اپنا بویا کاٹوگے (نہ تم کو اُنکے نیک اعمال کا کوئی فائدہ اور
اُن کو تمہاری بداعمالیوں سے کوئی نقصان) اور نہ تم سے اُن اعمال کے متعلق بازپرس
ں جاوے گی جو وہ کرتے رہے ہیں (۱۳۴) یہود اور نصاریٰ کی تنگ ظرفی دیکھو) یہ کہتے ہیں کہ یہودی
نصرانی بن جاؤگے تو دین کی سیدھی راہ پاؤگے تم ان سے کہدو کہ نہیں تمہارا یہ خیال غلط
ہے۔ سیدھی راہ یہودی یا نصرانی بننے سے نہیں ملتی وہ ملتی ہے۔ دینِ ابراہیمی کی پیروی سے
لٰذا) ہم تو دینِ ابراہیم کے متبع ہیں جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے متبع کو ہمیشہ باطل سے
ن کی طرف مائل رکھتا ہے اور ہم چلتے ہیں ابراہیم کے نقشِ قدم پر جو تمام معبودانِ باطل سے
نہ موڑ کر ایک اللہ کا ہو رہا تھا اور مشرکوں سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا (برعکس اسکے تم ابراہیم
ے متبع بھی بنتے ہو اور پورے پورے مشرک بھی ہو) (۱۳۵) (اے مسلمانو! تم کہدو کہ ہم ایمان
لائے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اُن صحیفوں پر جو ابراہیم اسمٰعیل
سحٰق یعقوب اور اولاد یعقوب پر اترے تھے اور مانتے ہیں اُن کتابوں کو جو موسیٰ عیسیٰ اور
دیگر انبیاء کو اُنکے رب کی طرف سے دی گئی تھیں، ہم ان نبیوں میں سے کسی کو دوسروں سے
جدا نہیں کرتے (اور تمہاری طرح نہیں ہیں کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں) اور ہم تو

لے یہود کا عقیدہ تھا کہ بعض کو تو اس بات کا فائدہ پہنچ جاتا ہے کہ اُنکے بڑے نیکوکار اور خدا پرست تھے اور بعض کو
اس بات کا کہ اُن کی اولاد اور نسل میں نیکوکار اور خدا پرست لوگ ہوتے ہیں۔ قرآن نے یہود اور تمام اقوام
دنیا کے اس زعم کو باطل قرار دیا ہے۔

صرف اللہ ہی کے فرمانبردار اور اطاعت گذار ہیں (وہ جس کو ماننے کے لئے کہتا ہے ہم مانتے ہیں اور جس سے روک دیتا ہے اُس سے ہم رُک جاتے ہیں) (۱۳۶) اب (جبکہ اسلام کا نظریۂ اعتقاد و عمل انکے سامنے صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے) اگر یہ لوگ[1] اللہ پر اسی طرح ایمان لائیں جیسا کہ تم لائے ہو تو وہ ہدایت پا جائینگے اور اگر مُنہ موڑ لیں تو سمجھ لو کہ وہ ضد اور مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں (مگر تم تسلّی رکھو کہ) اس کے بعد اُنکی مخالفت کے شر سے تمہیں بچانے کے لئے اللہ کافی ہوگا وہ اُن کی معاندانہ سرگوشیوں کو سننے اور اُنکی خفیہ سازشوں کو جاننے والا ہے (۱۳۷) (کہدو کہ اعتقاد و عمل کا یہ جذبہ جو ہم کو اللہ نے دیا ہے یہ) اللہ کا رنگ ہے اور اُسکے دئے ہوئے بپتسمہ کا اثر ہے) اور اللہ کے رنگنے یا بپتسمہ دینے سے کس کا رنگنا یا بپتسمہ دینا بہتر ہو سکتا ہے (محض رسمی طور پر کسی کا بپتسمہ لے لینا کوئی معنے نہیں رکھتا اپنے اوپر رنگ چھڑک لینے یا کسی خاص رسم کو بجا لانے، یا کسی خاص جگہ خاص طریقہ سے نہا لینے سے نجات نہیں ہو سکتی جب تک انسان کا ایمان، صادق اور عمل، صالح نہ ہوں۔ اللہ نے ہمارے اوپر جو اپنا رنگ چڑھایا ہے، تو دیکھ لو کہ اُس کا اثر یہ ہے کہ) ہم محض اسی کے عبادت گذار ہیں (اور اسکی عبادت میں نہ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں اور نہ ہوائے نفس، ریا اور ظاہریت کو دخل دیتے ہیں) (۱۳۸) ان سے پوچھو کہ کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور وہی تمہارا رب (پس مخلوق ہونے کے لحاظ سے ہم سب اسکے بندے ہیں اور اسکی رحمت کے ایک جیسے حقدار ہیں پھر تمہیں یہ کیوں اعتراض ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر اہل عرب میں سے ایک پیغمبر مبعوث کر دیا ہے۔ اور اگر تم یہ سمجھو کہ انعامِ نبوّت کے حقدار صرف وہی لوگ ہیں جو فرمانبرداری اور

---

[1] یہود اور نصاریٰ بالخصوص اور عامۃ الناس بالعموم۔

Registered No. L. 4884

منظور کردہ صوبہ سندھ و ریاست بہاولپور برائے گورنمنٹ سکولز

…گست ۱۹۵۲ء

جلد ۷ عدد

شرح پس چہ باید کرد

ماہنامہ

پیغامِ حق

اصلاحی اور اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا ذخیرہ

مرتبہ

سید محمد شاہ، ایم۔ اے

دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

ماہنامہ پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد | اگست ۱۹۶۲ء | عدد ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنہائے گفتنی

اسلام ایک تاریخی قوت (HISTORICAL FORCE) ہے۔ ہر تاریخی قوت کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے ترکیب وامتزاج کے لحاظ سے انسان کے داعیات نفس کی عادلانہ تکمیل کرتی ہے قرآن کا یہ دعوے ہے کہ وہ ایک دین فطرت پیش کرتا ہے۔ قرآن نے دعوے کیا ہے کہ کائنات کے ہر ذرے ذرے میں اسی دین فطرت کے مطابق عمل ہو رہا ہے۔ انسان کو ذات باری نے جو تھوڑا بہت اختیار محض امانت کے طور پر تفویض کیا ہے وہ اس لئے ہے کہ انسان ذات باری عز اسمہ کے فرائض و نواہیں کی ضیاء میں اپنے ارادہ اور شعور کا ارتقاء کرے۔ اس مقام کو قرآن نے عبادت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی دعوے ہے کہ داعیات نفس کے عادلانہ اور حکیمانہ تعاون و تعامل کا لائحہ عمل فکری اسلوب ترتیب نہیں دے سکتا فکر انسان کی قوت احاطہ بہت سست رو اور محدود ہے۔ فکر سے زیادہ تیز فہم اور دور رس تو انسان کا ذوقی تجربہ ہے۔ سوچ، اور فکر حقیقت کے ادراک میں اتنی سریع السیر نہیں جتنا کہ انسان کا وجدانی احساس۔ وحی اس سے بھی کئی گنا بلند ہے۔ اس کی قوت بسط و نفوذ اپنے اندر ہر ترقی جوہر مخفی رکھے ہوئے ہے۔ واقعہ معراج جو وحی کی کیفیت کا نہایت ہی ترقی یافتہ مظہر تھا اسی واقعیت کا اثبات کرتا ہے۔ آنحضرتؐ اس معین وقت میں ان تمام قوانین کی زنجیروں سے سبکدوش ہو چکے تھے جو معمولی کردار کا جزو لاینفک ہیں۔ اس بارے میں توجیہ اور تشریح کے اختلافات پیدا کئے

جا سکتے ہیں مگر اسلام کے ان محیرّ العقول تاریخی انقلابات کو ہم کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو تاریخ اور واقعیت کا ایک جزو لا یتجزٰی بن چکے ہیں اور جن پر اس مصرع کا اطلاق صادق آتا ہے ؎

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اسلام نے اجتماعی ارتقاء کے باب میں انسانیت کے پامال اور پژمردہ طریقوں کے استعمال سے اجتناب کیا۔ اس نے علم کے ہاتھ میں حقیقت کا سر رشتہ نہیں دیا۔ اکتشافِ حقیقت کے باب میں اس نے وحی ہدایت کے عروۃ الوثقیٰ کو میزان قرار دیا۔ نہ کہ علم کے ظن اور تخمین کو معیارِ خیر و شر کا منصب تفویض کیا۔ ہم اس وقت جو شے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایک بہت بڑی بنیادی حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ وجود اور کائنات ایک مطلق ہستی جو صاحب الارادہ ہے، کے مائدکرہ وہ قوانین کی زنجیر عمل میں اپنے آپ کو وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کے دو اہم رُخ ہیں۔ بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس حقیقت کبریٰ کا عقیدہ دو حصص پر مشتمل ہے۔

(- واجب الوجود ہستی کا عقیدہ وحی کے ذریعے ہم تک پہنچا۔

ب - اسی قوت وحی نے انسان کے داعیاتِ نفس کے عادلانہ توازن و حکیمانہ تعامل کیلئے ایک دستور وضع کیا ہے۔ انسان کا ارتقاء معاشرت کی ہم آہنگی، عمران کے مختلف اجزاء کا تشاکل معنوی، صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم اس ترتیب دیے ہوئے قانون کے سامنے اپنا سرِ اطاعت خم کر دیں ساقی ازل کے سامنے اعزاز و احترام کے استحقاق کی یہی شرط ہے کہ رسم و راہ میخانہ کا التزام کیا جاوے

اسلام بحیثیت ایک اجتماعی عمل کے آج تک دُنیا سے ختم نہیں ہو سکا۔ اس بحر بیکراں میں مد و جزر کی

کیفیت مندوروار دہوتی رہی مگر یہ ایک ناقابل تردید اور واضح حقیقت ہے کہ اسکی قوت تخلیق اب تک برقرار ہے اور اقوام ملّت اسلامیہ پر کوئی بڑے بڑے خوفناک اور دردانگیز عوالم طاری ہوتے رہے مگر اسلام کا سمٹنا اور اضمحلال ایک عارضی اور وقتی وقفے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ وقت ملنے پر اس نے زیادہ قوت نفوذ حاصل کرکے اپنے ماحول کو متاثر کیا ہم اپنے اس کلیہ کو صرف خالی دعویٰ تک ہی محدود رکھنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے اثبات کے لئے ہمارے پاس قطعی شواہد ہیں۔ ان شواہد کے مطالعے سے اس حقیقت کا اثبات وایقان نہایت واضح صورت میں ہوسکے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے زوال کا باعث ہم اسلام کے اجتماعی تصوّر کو ہرگز قرار نہیں دے سکتے اس وجہ سے کہ تاریخ اور واقعات اس کیلئے کوئی سند مہیا نہیں کرتے اسکے برعکس حقائق اور واقعات کی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے معاشرتی تصوّر سے انحراف اور وحی کی ہدایت کے عقیدہ سے اجتناب نے ملّت اسلامیہ کیلئے فتنوں کے بند دروازے کھول دیئے۔

اسلام نے معاشرت کا ایک ایسا نظام پیش کیا جہاں طبقات کی کشمکش اور دولت کے اکتناز اور احتکار کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسلام کا نیا نظام ایک ایسی اجتماعیت کا قصر تعمیر کرنے کا داعی تھا جہاں دولت کی ذاتی ملکیت کا تصوّر عقیدہ کی حیثیت سے مفقود تھا مگر دولت کی امانت کا تصوّر ضرور رائج تھا۔ انسان کو ذات باری نے تمام قوتیں بطور امانت تفویض کی ہیں اس کے لئے لازم آتا ہے کہ امانت کے تصوّر میں انسان اس کی مرضیات کا پابند رہے جس نے زندگی کی امانت انسان کے سپرد کی ہے۔ مغرب نے بہت کدوکاوش کے بعد اشتراکیت کے تصوّر کو ترویج دی مگر چونکہ بنیادی طور پر مغرب کا نظام زندگی غلط تھا اس لئے اس کو بروئے کار لانے کے لئے مغرب کے سیاسی مصلحین نے زبردست ٹھوکریں کھائیں انہوں نے حالات کے غلط تقاضاؤں سے متاثر ہوکر ماحول اور زندگی کے بارے میں غلط تصوّرات قائم کر لئے۔ اس تمام کشمکش کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ آگے

واروں سے زمین سرخ ہو رہی ہے۔ لاشوں کے ڈھیروں سے زمین کے راستے اٹے پڑے ہیں اور فضائے نیلگوں جنگ کی تہ رمانیوں سے اپنی رفعت کی حفاظت نہیں کر سکی۔

اسلام ہندوستان میں اس وقت آیا جب یہ اپنے دور تغیر (TRONSFORMATION PHASE) میں داخل ہو چکا تھا اس کی نمانت اور شفاف سطح پر اب ملوکیت اور استبداد کا زنگ لگ چکا تھا سلاطین اب صرف سلاطین ہی تھے اسلام کے داعی اور نقیب کے پایہ سے ساقط ہو چکے تھے مگر اس وقت بھی اسلام میں ایک خاص طرح کی قوت حرب و ضرب تھی۔ دنیا میں اسلام کے بقا اور نمو کا منطقہ مشرق وسطے تھا اور وہ تمام آبادیاں تھیں جو بحیرہ روم کے گرد زمین پر عظموں میں پھیل گئی ہیں

اسلام کا یہ تفضل اس لئے تھا کہ ابتدا ہی سے اس میں دو اوصاف اپنی کامل صورت میں جمع کر دیئے گئے تھے:۔

ا۔ معاشرت انسانی کی تعمیر کا الہامی اسلوب۔

ب۔ ایک ایسی اجتماعی زندگی کا تصور جو عدل اور حکمت کے تصور پر مبنی ہے۔

داخلی طور پر معاشرت اسلامی ایک ایسی ترکیب ہے جس کے اجزا میں کامل ہم آہنگی ہے خارجی طور پر یہ ایک زبردست قوت عمل ہے یہ ایک جہاد اور حرکت کا نام ہے اسلام کا یہ تصور تھا جس نے ایک بانفوذ اور اقتدار کی قوت حاصل کر کے اس کو اب تک پوری معنویت سے باقی رکھا ہے۔

یورپ نے اب تک معاشرت کا کوئی ایسا تصور پیش نہیں کیا جو داخلی طور پر ہم آہنگ اجزا کا ہو۔ مسلمانوں کی تمام لڑائیاں اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار رہیں جب تک ان کی معاشرت داخلی طور پر ہم آہنگ رہی مسلمانوں نے بعد میں اس غلط تصور کو رواج دیا جس کا مقصد علمی مباحث وعقیدہ تراشی کر حرب و ضرب اور بحث و مناظرہ کی مجالس کا انعقاد تھا ورنہ اسلام حقیقت کے لئے صرف اسی پر اکتفا کرتا ہے جو اس نے اپنے پیرؤں کو بتا دیا ہے اسلام کے بارے میں فلسفہ زدہ

لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُمّتِ اسلامیہ کا ایک تاریک منظر ہے جو ہمارے سامنے کھولتا ہے مگر فی الحقیقت سماج کے داخلی اتحاد کی بہترین راہ یہ ہے کہ وجودِ مطلق کے بارے میں صرف اس حد تک اکتفا کر لیا جاوے جو اسلام نے ہمارے سامنے رکھ دیا ہے غیر ضروری مسائل کو اس باب میں دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ملتِ اسلامیہ کے تشتت و افتراق کا سب سے بڑا دروازہ اسی قسم کی ذہنیت نے کھولا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عملی اور اصطلاحی مسائل میں ہم بہت پیچھے رہ گئے۔ اسلام کا زاویۂ نظر جدید حکیمانہ مسلک عمل سے بہت قریب ہے اسلام نے اپنے فکری نظام میں یونانی تہذیب کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ یونان کے تصورات اپنی اسپرٹ کے لحاظ سے فکری ہیں۔ اسلام بعض بنیادی حقیقتوں کے اعتراف و اذعان کے لئے استقراء اور استقصاء کو بہت اہمیت سے دیکھتا ہے مگر اس نے مغرب کے جدید ملحدانہ رجحانات کا علم کی حدود معین کر کے سدّباب کر دیا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ ہندو تہذیب کا ہے۔ اس سے قبل ہم بتلا چکے ہیں کہ ہندوستان اور چین بھی ہمارے سامنے دو مختلف اجتماعی اعمال (SOCIAL PROCESS) کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلام سے ان کا تصادم جاری ہے۔ فی الحقیقت اسلام ایک انقلاب انگیز اجتماعی عمل ہے اس کو ازمنہ وسطیٰ کے ایک زبردست عالمِ دین نے اکالِ الامم کا لقب دیا تھا گو اس وقت قائم شدہ تہذیبوں کی قوت اپنے اصطلاحی معنوں میں بہت زیادہ ہے مگر اس سے اسلام کے غلبہ کے تصور پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ بالآخر شیطان کی مہلت ختم ہوگی اور اس کو تمام باطل قوتوں کے خاتمہ کے بعد اپنی روح کے مطابق انسانیت کے اصلاح و تزکیہ کے لئے قوتِ تنفیذ مہیا ہو جاوے گی ہم اس وقت صرف ہندوستان کے حالات کا مطالعہ اسی بہ دستہ اجتماعی عقیدہ کے اثر اور نفوذ کے زاویہ نظر سے کرتے ہیں۔

ل۔ ہندوستان میں اسلام کو غوری اور غزنوی ترکوں نے ایک نافذ العمل قوت کی حیثیت دلانے میں اپنی عسکری قوت کا مظاہرہ کیا۔ اس زمانے میں حرب و ضرب، ہجوم اور جہاد کے فرائض ازبک ترکوں نے ادا کئے مگر تبلیغ اور دعوت کا کام خاندان چشتیہ کے اکابر یعنی حضرت علی ہجویریؒ اور ان کے متعلقین نے کیا۔

ب۔ خاندان غلامان نے التمش، بلبن اور ناصر الدین کی شخصیتیں پیدا کیں جنہوں نے اسلام کے دونوں پہلوؤں یعنی دعوت اور جہاد کے لئے اہلیت کا ثبوت فراہم کیا۔

ج۔ علاؤ الدین خلجی نے نظم و نسق سلطنت کے باب میں کلیات کو ترتیب دیا۔ اس کو اسلام کے فولادی انسان کے نام سے یاد کریں گے۔

د۔ محمد تغلق اور فیروز تغلق کو ہم دعوت اور جہاد کے مختلف مظاہر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ہ۔ شیر شاہ سوری کی شخصیت نظم و نسق مملکت اور اسلام کے عادلانہ نظام کے تحفظ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

اس وقت تک ہندوستان کی اصلاح و تذکیر کے لئے صوفیائے کامل سرگرمی اور جوش سے حصہ لیا چونکہ گزشتہ تمام سلاطین اسلام نے مذہب اور دیگر نوامیس شریعت کے نظام کو نہیں چھیڑا تھا اس لئے وہ علماء سے تعرض نہ کرتے مگر بعد کے واقعات ایسے رونما ہوئے کہ دور مغلیہ میں اسلام کے علماء کو اس جانب اپنی توجہ مبذول کرنا پڑی چنانچہ شیخ احمد سرہندی نے دعوت اور تذکیر کے لئے علم بلند کیا۔ اکبر نے ہندو مجلسی تصور کو اسلام سے مخلوط کر کے ایک نئے مذہب کے سنگ بنیاد رکھنے کا عزم کیا یہ بدعتی تھی جس کا قوت سے فعل میں آنا اسلام کیلئے سخت مہلک ثابت ہوتا اس وقت علمائے اسلام کی معیت کے ساتھ اس مداخلت مذہبی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

جہانگیر اور شاہجہان کے دور حکومت میں ہندوؤں نے اپنے شر اور فساد کا سلسلہ جاری رکھا۔

دارا شکوہ کی صورت میں یہ فتنہ ایک خطرناک صورت اختیار کرنے لگا مگر اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت نے اس فتنہ کو تباہ کر دیا اور بیچارہ پہنچ تک اسلام فتنوں کے سیلاب سے بچ گیا۔

(باقی آئندہ)

اس پرچہ میں علامہ ڈاکٹر اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی شرح میرے محترم دوست پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی کے قلم سے شائع ہو رہی ہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں کی قومی مرض کے بہترین نبض شناس تھے انہوں نے قوم کی موجودہ پستی کا نقشہ کھینچ کر اس مثنوی میں بتایا ہے کہ ان کے اندر کیا کیا خرابیاں ہیں اور وہ خرابیاں کس حد تک اُن کے لئے مہلک امراض کا باعث بن گئی ہیں۔ پھر ان امراض کا علاج بھی بتا دیا ہے۔

سلیم چشتی کے قلم نے علامہ اقبال کے شاہکار کی شرح لکھ کر سونے پہ سہاگہ کا منظر پیدا کر دیا ہے۔ یہ شرح پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کو اپنی انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں اور خرابیوں کا پتہ چلے گا اور پھر ان کو دور کرنے کے طریقے معلوم ہوں گے اسکے پڑھنے سے آپ اقبال کے مقام بلند سے واقف ہو جائیں گے اور جاننے لگیں گے کہ اقبال نے آپ کے نام کیا پیغام چھوڑا ہے۔

یہ شرح ابھی نامکمل ہے میں اپنے دوست سلیم صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ مثنوی کا باقی حصہ بھی لکھ دیں تاکہ اس شرح کو بھی کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

احباب یہ معلوم کر کے شاید خوش ہوں گے کہ اس مثنوی کی انگریزی شرح بھی ایک دوست نے لکھ ڈالی ہے اور عنقریب اُس کے شائع ہو جانے کی توقع ہے جو حضرات اُردو یا انگریزی شرح "پس چہ باید" کتابی شکل میں حاصل کرنا چاہیں وہ براہ کرم اپنے نام درج رجسٹر کرا دیں تاکہ کتاب شائع ہوتے ہی اُن کی خدمت میں ارسال کی جاسکے۔ فرمائش درج رجسٹر کرانے کے لئے کسی پیشگی رقم کی ضرورت نہیں۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق!

پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی۔ اے (آنرز)

پیش لفظ

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد" کے ابتدائی صفحات کی شرح بالاقساط موقر جریدہ "ندائے وقت" لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ اب اسے یکجائی طور پر رسالہ "پیغام حق" میں شائع کیا جا رہا ہے اور اگر کوئی مانع پیدا نہ ہوا تو کوشش کروں گا کہ بقیہ مباحث کی شرح بھی بہت جلد مرتب کر دوں تاکہ اقبال اکیڈیمی اُسے کتابی صورت میں شائع کر دے۔ مجھے کلام اقبالؒ کو کماحقہ سمجھنے کا ادعا نہ تھا اور نہ ہے، یہ جو کچھ لکھا ہے محض اُسی عقیدت کا اظہار ہے جو اس ہیچمداں کو علامہؒ کی ذات گرامی سے ہے اور یقیناً تادم آخر رہے گی (انشاء اللہ) اور مقصد یہ ہے کہ اس طرح نوجوانوں کے قلوب میں، کلام اقبالؒ سے گرویدگی کا رنگ پیدا کیا جائے۔ اگر افراد ملت کے اندر یہ رنگ پیدا ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ ان کا خون، جو غیر اسلامی افکار کی سردی سے منجمد ہو چکا ہے، پھر تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگے گا اور وہ انقلاب جس کے برپا ہونے کی آرزو علامہؒ کو ساری عمر عاشق صادق کی طرح تڑپاتی رہی، اسی گردش خون پر منحصر ہے۔

دو تاؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اقبالؔ کے کلام کا مطالعہ —— اور پھر اس کے ساتھ ایک شدید روحانی اُنس —— مسلمانوں کے دل میں سوزِ یقیں پیدا کر سکتا ہے اُن کے کلام میں شاعر کا سوز، فلسفی کے افکار، اور مومن کے واردات یہ تینوں عناصر من وجہ الکمال موجود ہیں کیونکہ ان کی شخصیت میں شاعری، فلسفہ اور ایمان، ان تینوں عناصر کا امتزاج پایا جاتا ہے اور کسی شخص واحد میں ان تینوں خوبیوں کا بیک وقت جمع ہو جانا، نوادرات عالم میں سے ہے اور اسی امتزاج میں اقبالؔ کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے پس میں اقبالؔ ہی کے الفاظ میں، نوجوانانِ ملت کو صلائے عام دیتا ہوں کہ

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

بخواندہ کتاب

علامہ اقبالؒ کے دل میں اقوام شرق کی پستی اور زبوں حالی کا جس قدر شدید احساس تھا اس کا صحیح اندازہ لگانا مقصود ہو تو اس "فغان نیم شبی" کا مطالعہ کیجیے جو ۱۹۳۶ء میں مثنوی "پس چہ باید کرد" کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ اس مثنوی کے متعلق میرے محترم پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔اے سابق وزیر تعلیمات ریاست جوناگڑھ نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ

"جس طرح سورۂ اخلاص کو قرآن مجید کا دل کہا جا سکتا ہے اسی طرح بلا تشبیہ، ہم اس چھوٹی سی مثنوی کو کلامِ اقبال کا دل کہہ سکتے ہیں۔"

اس خیال کی تائید میں یہ کہنا خلافِ محل نہ ہوگا کہ اقبال نے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک جو کچھ لکھا اس کا مقصد یہ ہے کہ اقوامِ شرق استیلائے غرب سے آزاد ہو سکیں چونکہ اس مثنوی میں اس مقصد کی بہترین طریق پر وضاحت کی گئی ہے اس لئے اس کو "بلا شبہ" اقبال کی تمام تصانیف کا خلاصہ یا دل کہا جا سکتا ہے۔ پس ان اصحاب کی خاطر جو فارسی زبان میں مہارت نہ رکھنے کی وجہ سے اس مثنوی کے مطالب عالیہ سے کماحقہٗ بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا خلاصہ عام فہم انداز میں سپردِ قلم کر دوں۔

علامہؒ نے شروع میں تحت عنوانِ بالا چار شعر سپردِ قلم فرمائے ہیں جن کے مطالعہ سے اس مثنوی کے لکھنے کا مقصد واضح ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ان کی تشریح درج کی جاتی ہے۔

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را
جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است

بآں مقام رسیدم چو در برش کردم
طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست
نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

پہلی چیز جو ان اشعار سے واضح ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ علامہؒ نے ان اشعار میں عشق اور عقل کا موازنہ کیا ہے اور عقل کی پوزیشن واضح کی ہے۔ اقبالؒ کے فلسفہ میں عشق کو عقل پہ تفوق حاصل ہے۔ اور بانگِ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک تمام تصانیف میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من عشق است امام من عقل است غلام من

اقبالؔ کا عقیدہ ہے کہ عقل یا خرد علوم و فنون کے حصول میں تو مدد دے سکتی ہے لیکن قوموں کی زندگی میں ان کے عروج میں اور تسخیر کائنات میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ عشق ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبالؔ عقل کو بے کار یا فضول قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اسے رہنمائے کامل نہیں سمجھتے۔

عقل ہم عشق است و از ذوق نگہ بیگانہ نیست لیکن ایں بیچارہ راآں جرأت رندانہ نیست

یعنی عقل بھی اچھی چیز ہے لیکن اس میں ایک بات کی کمی ہے۔ اور وہ جرأت رندانہ ہے جس کے بغیر انسان محیرالعقول کارنامے سرانجام نہیں دے سکتا۔ بانگِ درا میں لکھتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اب میں ان اشعار کا مطلب بیان کرتا ہوں۔

(۱) فرماتے ہیں کہ خرد نے بغاوت پہ کمر باندھی ہے۔ اور اس بغاوت کی وجہ سے حرم (مسلمانوں کی ملی زندگی) کی ہستی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یعنی دانشِ حاضر (تہذیب مغرب اور فلسفۂ مغرب) نے مسلمانوں کے عقاید اور افکار کو متزلزل کر دیا ہے۔ اس لیے میں عشق کے ملک سے فوج بھرتی کرنا چاہتا ہوں جو اس باغی گروہ کا مقابلہ کرے۔ یعنی میں مسلمانوں کو عشق (حبِ رسولؐ) کا درس دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ "دانشِ حاضر" کا مقابلہ کر سکیں۔

(۲) افسوس یہ ہے کہ آج کل کے مسلمان اس حقیقت سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں کہ عشق ایسی قبا ہے جو عقل کے جسم پہ بالکل فِٹ (موزوں) آسکتی ہے یعنی جس

طرح انسان کا حسن لباس سے دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب عشق عقل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے تو عقل صحیح طریق پر گامزن ہو سکتی ہے یعنی عشق عقل کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں علم با عشق است از لاہوتیاں

(۳) فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے عشق (حب رسول ؐ) کا مسلک اختیار کیا ہے میں اس بلند مقام پر پہنچ گیا ہوں جس کے بام و در کا طواف کرنا عقل کے لئے موجب سعادت ہے یعنی عقل کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو روباہی سکھاتی ہے۔ (اور یورپ کی موجودہ حالت اس حقیقت پر شاہد ہے) لیکن جب ایک عقلمند آدمی عشق کا مسلک اختیار کر لیتا ہے تو اس کی عقل بھی پاکیزہ ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کو نیکی اور تقویٰ سے معمور کر دیتا ہے
اس کی مثال یہ ہے کہ جب عقل نے عشق کی غلامی قبول کی تو فاتحین کا طرز عمل اس قدر پاکیزہ اور مستحسن ہو گیا کہ مصر، شام اور ایران کے باشندوں نے اُن کو رحمتِ الٰہی قرار دیا لیکن جب عقل، عشق کی غلامی سے آزاد ہو گئی تو فاتحین کی ذہنیت اس درجہ خراب ہو گئی کہ مہدی سوڈانی کی قبر کھود کر اس کی مقدس ہڈیاں سرِ بازار جلا دیں۔

فاتح دونوں ہیں لیکن طرز عمل بالکل مختلف ہے کیوں؟ اس لئے کہ عمرؓ کی خودی مسلمان تھی۔ کچنر کی خودی کافر تھی۔

(۴) اے مسلمانو! یہ مت سمجھو کہ خرد کے حساب اور میزان نہیں ہے یعنی یہ غلط ہے کہ خرد (ultimate authority) ہے۔ بلکہ نگاہ بندۂ مومن خرد اور اس کے افعال کے حسن و قبح کے لئے بمنزلہ معیار ہے یعنی صحیح عقل وہ ہے جو ایمان کی کسوٹی پر پوری اُترے صحیح عقل وہ ہے جسے مومن صحیح کہے یعنی صحیح عقل وہ ہے جو قرآن مجید کے مطالعہ سے پیدا ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح عقل صرف قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

آج کل مسلمان خصوصاً مغرب زدہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ بس جو بات عقل کے خلاف ہو وہ غلط ہے کیوں؟ اس لئے کہ عقل سے بالاتر کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ اقبالؒ نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا کہ دنیا میں ایک چیز عقل سے بھی بالاتر ہے اور وہ عشق ہے۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر   کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

جس طرح یہ مثنوی اقبال کی تمام تصانیف کا خلاصہ ہے اسی طرح یہ چار شعر اس تمام مثنوی کا خلاصہ ہیں یعنی اقبال کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان اگر سربلندی چاہتے ہیں تو عشق (حب رسولؐ) کو اپنا شعار زندگی بنائیں۔

طبع مسلم از محبت قاہر است   مسلم ار عاشق نباشد کافر است

پیر رومیؒ کا فرمان

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کا آغاز اس عقیدت کے اظہار سے ہوتا ہے جو کہ مولانائے رومؒ کے ساتھ تھی۔ فرماتے ہیں:۔

پیرِ رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر   کاروانِ عشق و مستی را امیر

منزلش برتر زماہ و آفتاب   خیمہ را از کہکشاں سازد طناب

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش   جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

پیر رومیؒ عالم خیال میں اقبال سے کہتے ہیں کہ مشرق خواب گراں سے بیدار ہو چکا۔ اس کے قلب میں جذبہائے تازہ پیدا ہو رہے ہیں پرانی زنجیریں ٹوٹتی جاتی ہیں پس اے اقبال! تو چونکہ دانائے اسرار فرنگ ہے اور اس زمانہ میں مغربی حکمت اور سیاست کا مطالعہ تجھ سے بڑھ کر کسی مسلمان نے نہیں کیا ہے اس لئے اپنے اندر حضرت ابر

کا رنگ پیدا کر اور تمام پُرانے بت خانوں (خیالات) کو توڑ ڈال اور مسلمانوں کو توحید کی شراب سے مست کر دے۔

اس کے بعد پیرِ رومیؒ چند حقائق کا بیان کرتے ہیں۔ اول :-

امتاں را زندگی جذب دردل کم نظر ایں جذب را گوید جنوں

ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد بے جنونِ ذوفنوں کارے نکرد

پہلی حقیقت جس پر مسلمانوں کو یقین کرنا چاہیئے یہ ہے کہ دُنیا میں قوموں کی زندگی اور ترقی جذبِ دروں (IDEAL) کے وجود پر منحصر ہے۔ وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو اپنے سامنے کوئی آئیڈیل (IDEAL نصب العین) رکھتی ہے۔ لیکن جو لوگ کوتاہ بین ہیں وہ اس جذب دردل (عشق) کو جنوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ دُنیا میں وہی قوم کامیاب ہوئی ہے جس کے افراد کے دماغ میں جنونِ ذوفنون سمایا ہوا تھا۔

مومن از عزم و توکل قاہر است گر ندارد ایں دو جوہر، کافر است

خیر را او باز می داند، زشر از نگاہش عالمے زیر و زبر

کوہسار از ضربتِ او ریزہ ریز در گریبانش ہزاراں رستخیز

کامیابی کے لیے ایک مومن کے اندر دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک ارادہ دوسرے توکل اگر اس میں یہ دو صفات نہ ہوں تو وہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہے۔ کاش! بیسویں صدی کے مسلمان اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

عزم اور توکل کا فلسفہ

عزم کہتے ہیں ارادہ کو۔ مومن وہ ہے جس کے اندر اپنا جہاں آپ پیدا کرنے کی آرزو جو لانیاں کرتی ہیں۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو کرے تو پیدا یہ سنگ و خشت نہیں جو تمہری نگاہ میں ہے

پس عزم کے معنی ہیں تخلیق کی آرزو۔ یہ صفت (شرط) اس قدر اہم ہے کہ خدا تعالےٰ نے اقبال سے خود کہا:۔

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست نزد ما جز کافر و زندیق نیست (جاوید نامہ)

مومن کی دوسری صفت یا ایمان کی دوسری شرط توکل ہے توکل کے معنی ہیں عزم کر کے عمل کے میدان میں کود پڑنا اور کامیابی کے لئے اللہ تعالےٰ کے کرم پر بھروسہ کرنا۔ کاش مسلمان توکل کے معنی سمجھ لیں۔ آج کل توکل کا ایک غلط مفہوم دماغوں میں جاگزیں ہے۔ وہ یہ کہ "ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں" اور کامیابی کے منتظر ہیں۔

عزم وہ صفت ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے جس کی بدولت وہ سرگرم عمل ہو سکتا ہے اس کا تعلق فرد کی ذات سے ہے۔

توکل وہ صفت ہے جو اگرچہ پیدا تو انسان ہی کے اندر ہوتی ہے اور اس کی بدولت وہ ان مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہے جو عمل کے دوران میں پیش آتی ہیں لیکن اس کا تعلق خدا کی ذات سے ہے یعنی جو شخص خدا پر ایمان نہیں رکھتا وہ توکل بھی نہیں کر سکتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عزم درحقیقت اپنی خودی پر ایمان کا نام ہے۔ اور توکل درحقیقت خدا کی ذات (خودی) پر ایمان کا نام ہے۔

واضح ہو کہ توکل (ایمان علی اللہ) اسی وقت کارآمد ہو سکتا ہے جب عزم (ایمان علی النفس) پہلے موجود ہو۔ محض توکل بے کار ہے۔ قرآن مجید میرے دعوے پر شاہد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

عصر تو از رمز جاں آگاہ نیست دین او جز حب غیر اللہ نیست

موجودہ زمانہ میں لوگ مادہ پرستی کی طرف مائل ہیں۔ روح اور روحانیت کے رموز سے آگاہ نہیں ہیں۔ اور چونکہ ایسا ہے اس لئے لوگوں کا مذہب صرف غیر اللہ سے محبت کرنا ہے۔ اور غیر اللہ کیا ہے؟ زن۔ زر۔ زمین۔

فلسفی ایں رمز کم فہمیدہ است   فکر او بر آب و گل پیچیدہ است

خود اس زمانے کے فلاسفر اور حکماء روح کی حقیقت سے ناآشنا ہیں اور مادیت کی طرف مائل ہیں اور ان کی نظر آب و گل یعنی مادیات سے آگے نہیں بڑھتی۔

نوٹ:۔ یہ اشارہ ان مذاہب فلسفیانہ کی طرف ہے جو انیسویں صدی اور زمانہ حال میں یورپ میں پیدا ہوئے مثلاً POSITIVISM , AGNOSTICISM , HUMANISM PESSIMISM , MATERIALISM , MARXISM یہ جملہ مذاہب خدا کا انکار کرتے ہیں۔ اور انسان کو مادہ پرستی سکھاتے ہیں۔

ان حقائق سہ گانہ کے اظہار کے بعد مرشد رومیؒ یہ فرماتے ہیں:۔

اے خوش آں مردے کہ دل باکس نداد   بند غیر اللہ را از پا کشاد

یعنی اقبال کا فلسفہ اور ان کا پیغام جیسا کہ ڈاکٹر نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا خالص مذہبی پیغام ہے یعنی اقبال کی نظر میں خوش نصیب وہ ہے جو غیر اللہ سے یکسر قطع تعلق کرے اور ارباب علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ انسان سب سے قطع تعلق کر کے صرف ایک اللہ کا ہو رہے۔ وگرنہ ہیچ۔ آخر میں مرشد رومیؒ اقبال کو نصیحت فرماتے ہیں کہ:۔

معنیٔ دین و سیاست باز گوے   اہل حق را زیں دو حکمت باز گوے

یعنی اے اقبال! اس زمانے میں مسلمان دین اور سیاست کے مفہوم سے بیگانہ ہوگئے ہیں اس لئے ان کو ان کی حقیقت سے از سرِ نو آگاہ کردو تاکہ وہ کسی مہاتما کے سحر سامری کا شکار نہ ہوجائیں۔

آخر میں اقبال ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ:

سرِ حق بر مردِ حق پوشیدہ نیست — روحِ مومن ہیچ می دانی کہ چیست

یعنی "مردِ حق" سرِ حق سے آگاہ ہے۔ مردِ حق اور مردِ مومن دونوں مترادف ہیں یعنی اگر سرِ حق سے آگاہی مطلوب ہے تو مومن بن جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ مومن کسے کہتے ہیں؟ اس کا جواب ذیل کے اشعار میں ملاحظہ کیجئے:

قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود — عقدۂ خود را بدستِ خود کشود

از خودی اندر ضمیرِ خود نشست — رخت خویش از خلوتِ افلاک بست

رخ سوئے دریائے بے پایاں نکرد — خویشتن را در صدف پنہاں نکرد

اندر آغوشِ سحر یک دم تپید

تا بکامِ غنچۂ نورس چکید

مومن کی روح کیا ہے؟ اس کو شبنم کے قطرہ سے مثال دی جاسکتی ہے۔ جو ذوقِ نمود کی وجہ سے اپنی گرہ کو اپنی قوتِ بازو سے کھولتا ہے۔ جو اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اور اس ---------- مطالعہ باطنی کی بدولت اپنی حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ اور اس لئے آسمان کی خلوت کو چھوڑ کر اس کائنات مادی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو نہ دریا کی طرف رخ کرتا ہے اور نہ صدف میں پوشیدہ ہوتا ہے بلکہ آغوشِ سحر میں چند منٹ کے لئے جلوہ گر ہوتا ہے تاکہ غنچوں کو شگفتہ کرسکے یعنی مومن وہ ہے جو (۱) ذوقِ نمود رکھتا ہو (۲) اپنی خودی پر اعتماد رکھتا ہو (۳) اپنے من میں ڈوب کر زندگی کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرے (۴) نہ اپنی خودی کو ہنگامہ ہائے کائنات

میں غرق کرے (۵) اللہ ترکِ دُنیا کرے (۶) بلکہ قرآن مجید کی روشنی حاصل کرے (۷) اور انسانوں کی خدمت کرے۔

تطہیر فکر

اے امیرِ خاور۔ اے مہرِ منیر　　می کُنی ہر ذرہ را روشن ضمیر

خوش بیا صبح مراد آوردۂ　　ہر شجر را نخلِ سینا کردۂ

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں "خطاب بہ مہرِ عالم تاب" کے عنوان کے ذیل میں علامہ نے ابتدائی سات اشعار میں آفتاب کی (جو اللہ تعالےٰ کی قدرت کاملہ کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اور فائدہ رسانی کی صفت اس درجہ رکھتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں ہندوستان، ایران، یونان در دیگر ممالک کے باشندوں نے اس کی پرستش اختیار کرلی تھی) فیض رسانی کا ذکر شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:-

تو فروغ صبح و من پایانِ روز　　در ضمیرِ من چراغے بر فروز

تیرہ خاکم را سراپا نور کن　　در تجلی ہائے خود مستور کن

یعنی اے آفتاب! تُو نوری ہے میں خاکی ہوں میں چاہتا ہوں کہ تُو میرے ضمیر میں ایک چراغ روشن کر دے تاکہ میری تاریک مٹی منور ہو جائے کیوں؟ اس لئے

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق　　بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

یعنی اے خدا جس طرح تُو نے آفتاب کو یہ صفت عطا کی ہے کہ وہ اپنے وجود سے رات کی تاریکی دور کر دیتا ہے اور ہر شے کو منور کر دیتا ہے تو مجھے بھی یہی صفت عطا کر تاکہ میں مشرق کے افکار (کی) رات کا خاتمہ کر دوں۔ اور مشرقی ممالک کے باشندوں کے دل و دماغ کو حریت کے جذبات و خیالات

سے منور کر دوں۔

مقصود و مدعائے شاعر از یں مثنوی

از نوائے پختہ سازم خام را گردش دیگر دہم ایام را
فکر شرق آزاد گردد از فرنگ از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

"اے خدا! مشرقی اقوام کے خیالات کی دُنیا اس وقت تاریک ہے میں چاہتا ہوں کہ اپنے پیغام کی بدولت ان کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آؤں۔ ان میں جو لوگ خام طبع ہیں میرے کلام (پیغام) کو پڑھ کر پختہ ہو جائیں۔ اے خدا! میں مشرق میں ایک انقلاب برپا کرنا چاہتا ہوں نئی دُنیا پیدا کرنی چاہتا ہوں"

میرا مقصود اس مثنوی لکھنے سے یہ ہے کہ مشرقی اقوام کے افکار اور خیالات مغرب کی گرفت سے آزاد ہو جائیں۔ مشرقی اقوام اس وقت ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں اور جب تک کوئی قوم ذہنی غلامی سے رہائی حاصل نہ کرے۔ اس وقت تک اسے سیاسی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مشرقی اقوام میری تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں تاکہ ذہنی آزادی حاصل ہو سکے۔

اظہارِ حقیقت

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس حریت از عفتِ فکر است و بس

یہ شعر اقبال کے مخصوص رنگ کا حامل ہے۔ اور اُس کی شاعری کی ماہیت کا سمجھنا اس شعر کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

شاعری کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) قافیہ پیمائی۔ مثلاً

ہوئی حجت جو وصل غیر پہ اس ماہ پیکر سے
گواہی ہم نے دلوا دی شکن آلودہ بستر سے

معشوق کو "ماہ پیکر" اس لیے باندھا کہ دوسرے مصرعہ میں "بستر" لانا ضروری تھا اگر دوسرے مصرعہ میں بستر کی جگہ "قسمت" باندھنا پڑتا تو پیکر کی جگہ طلعت ہو جاتا۔

(۲) مضمون آفرینی مثلاً

جور بیہم نہ کرے شان توجہ پیدا
دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

(۳) اظہار حقائق ابدی یا پیغام حیات سرمدی مثلاً

زندگی از گرمیٔ ذکر است وبس
حریت از عفت فکر است وبس

یہ وہ شاعری ہے جو ضمیر کائنات کو انسان کے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے اور اس کو اسرار و امکانات حیات سے روشناس کر دیتی ہے جس میں معشوق کے لب و رخسار اور شکوۂ فراق یار کے بجائے زندگی کے اہم مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ اسی لئے اس شاعری کا معشوق ہمیشہ دلکش اور حسین رہتا ہے اور ہر شخص کا محبوب ہوتا ہے۔ اقبال کے پیغام کو گوکل چند اور نریندر ناتھ بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جس سے ظفر علی خاں اور حسرت موہانی۔ اسی شاعری کے متعلق اقبال نے یہ لکھا ہے:

غوطہ ہا زد در ضمیر زندگی اندیشہ ام
تا بروں آوردہ ام افکار پنہان شما

ے شاعروں کو GREAT WORLD POETS کہا جاتا ہے مثلاً رومی۔ حافظ۔ گوئٹے۔ دانتے شیکسپیئر۔

اقبال کا تمام کلام اسی قسم کی بلند ترین شاعری سے معمور ہے چونکہ یہ مرتبہ بہت بلند ہے اور صدیوں میں کسی خوش نصیب کو ملتا ہے اس لئے پست فطرت اور حاسد افراد جو خود کسی اصول کے پابند نہیں ایسے شعرا پہ زبان طعن دراز کرتے رہتے ہیں۔

باز آمدم بر سر مطلب۔

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس حریت از عفت فکر است و بس

اس شعر میں دو لفظ قابل غور ہیں۔ ایک ذکر دوسرا فکر علامہ کی اصطلاح میں ذکر سے مراد عمل ہے۔ اور فکر سے مراد عقائد۔ ایمان تصورات یا یقین ہے چنانچہ اس کی تشریح جاوید نامہ میں خود فرماتے ہیں۔

جز بہ قرآن ضیغمی روباہی است فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

فقر قرآں ؟ اختلاط ذکر و فکر

فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

یعنی قرآن مجید انسان کو ایمان اور عمل دونوں کے اختلاط کا حکم دیتا ہے۔ اور جب تک عمل صالح نہ ہو محض ایمان مفید نہیں ہے۔

پس علامہ فرماتے ہیں کہ زندگی خواب و خورش کا نام نہیں بلکہ گرمیٔ فکر (تسلسل عمل) کا نام ہے۔ اور آزادی کی بنیاد عفت فکر پہ قائم ہے یعنی سیاسی آزادی ضمیر کی آزادی پہ منحصر ہے۔ وہی قوم آزاد ہو سکتی ہے جو پہلے اپنے ضمیر کو تقلید تعصب۔ جہالت۔ اور توہمات کی غلامی سے رہا کرا سکے۔ ہندی مسلمان سیاسی غلامی میں مبتلا ہونے سے بہت پہلے ذہنی غلامی میں مبتلا ہو چکے تھے اس نکتہ کی تشریح اقبال نے خود کی ہے۔

چوں شود اندیشۂ قومے خراب تا سرہ گردد بدستش سیم ناب

میبرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم در نگاہِ او کج آید مستقیم
برکراں از حربِ ضربِ کائنات چشمِ او اندر سکوں بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند گوہرِ او چوں خزف نا ارجمند
پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

یعنی جب کسی قوم کی ذہنیت خراب ہو جاتی ہے یا بالفاظِ دگر جب کوئی قوم ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو

(الف) کھری چاندی اس کے ہاتھ میں پہنچ کر کھوٹی ہو جاتی ہے۔

(ب) اس کے سینہ میں دل مردہ ہو جاتا ہے۔

(ج) سیدھی چیز اس کو ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔

(د) وہ کشمکش حیات سے گھبراتی ہے اور سکون کو زندگی سمجھتی ہے (حالانکہ سکون موت کا دوسرا نام ہے)

(ہ) اس کے دریا میں کہیں موج نہیں اٹھتی اور اس کے موتی بازار میں کوڑیوں کے مول بکتے ہیں۔

"در نگاہ او کج آید مستقیم" کی مثال آپ کو ہندی مسلمانوں کی زندگی میں بخوبی نظر آسکتی ہے۔

ہر وہ بات جو ان کے حق میں مضر ہے ان کو مفید معلوم ہوتی ہے۔ کافر کی پیروی مسلمان پر حرام ہے لیکن آج مسلمانوں کا "امام الہند" اور "امیر الملک" جو قرآن مجید کا مفسر بھی ہے اس بات پر پھولا نہیں سماتا کہ "میری صدارت در اصل مہاتما گاندھی کی پالیسی کی فتح ہے" اور مسلمانوں کو ایک کافر پر اعتماد کرنے اور اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دینے کی تلقین کرتا ہے۔

انگریزی تعلیم مسلمانوں کے لئے سخت مضرت رساں ہے لیکن آج ہماری تمام تر کوشش یہ ہے

کہ ہماری لڑکیاں بی۔اے۔بی۔ٹی کرکے مدرسوں میں نوکر ہوجائیں۔ بلکہ ہماری ذہنیت اس قدر خراب ہوچکی ہے۔ کہ جب ہم لڑکوں یا لڑکیوں کے لئے کوئی "مدرسہ" قائم کرتے ہیں تو اسے قومی ترقی کا معیار قرار دیتے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اندریں حالات حکیم امتؒ نے یہ مشورہ دیا ہے کہ سب سے پہلے اس قوم کو اپنی فکر THOUGHT کی اصلاح کرنی چاہئے۔ اور اس کے بعد صحیح ذکر پر گامزن ہوجائے۔

آزادیٔ فکر کی اہمیّت

ایک مختصر سی تمہید کے بعد علامہؒ نے مہر عالمتاب سے خطاب کے پردہ میں اس مثنوی کا مدعا بیان کیا ہے چنانچہ پہلے سات اشعار میں اس کے صفات وخو کا ذکر کرکے اس طرح فرماتے ہیں:۔

" تو فروغ صبح، من پایان روز در ضمیر من چراغِ بر فروز

اے آفتاب! تو نوری ہے اور میں خاکی ہوں پس میرے ضمیر کے اندر بھی ایک چراغ روشن کر دے یعنی میرے ضمیر کو منور کر دے۔

تیرہ خاکم را سراپا نور کن در تجلی ہائے خود مستور کن

میرے جسم خاکی کو (جو تاریک ہے) سراپا نور کر دے اور مجھے اپنے تجلیات کے دامن میں پوشیدہ کر لے (تاکہ)

تا بر وز آرم شب افکار شرق بر فروزم سینۂ احرار شرق

تاکہ میں مشرقی اقوام کے افکار وخیالات کی تاریکی کو دور کرسکوں اور حریت پسندوں کے سینوں کو منور کر دوں۔

جس طرح اسرارِ خودی لکھنے سے علامہؒ کا مقصد شعر گوئی نہ تھا اسی طرح اس مثنوی کا مقصد بھی شعر و شاعری نہیں ہے۔

خود علامہؒ کی حیثیت بھی واضح ہو گئی یعنی اقبال کا منصب اور مقصد (MISSION) یہ ہے کہ وہ مشرقی اقوام کے تخیلات کی اصلاح کرنے والے ہیں۔ وہ ایک مصلح اور ریفارمر ہیں اور شاعری کو انہوں نے اپنے مشن میں کامیابی کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ شعر و شاعری مقصود بالغرض ہے نہ کہ بالذات۔

مَیں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہمیشہ اس حقیقت کو بار بار پیش کیا ہے کیونکہ عموماً، لوگ اقبالؒ کو بھی ایک شاعر ہی سمجھتے ہیں، اور جب اس کا کلام پڑھتے ہیں تو مقصد کی طرف اس قدر متوجہ نہیں ہوتے جس قدر نکات و رموز کی شاعری کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے کلام سے کماحقہٗ مستفید نہیں ہو سکتے۔

کچھ دن ہوئے، مَیں نے کسی مضمون میں پڑھا تھا کہ شاعری کے اعتبار سے ضربِ کلیم ایک روکھی پھیکی کتاب ہے۔ یہ تنقید میرے خیال کی تائید کر رہی ہے۔ اگر پڑھنے والا اقبال کے مقصد سے آگاہ ہوتا تو اسے اس تبصرہ کی قیمت خود ہی معلوم ہو جاتی اور وہ اس کے اظہار سے اجتناب کرتا۔ اس امر سے قطع نظر کیجئے کہ ضربِ کلیم ایسی کتاب ہے، جسے اکثر نقادِ اقبالؒ کا شاہکار کہتے ہیں۔

اقبالؒ کے ایک مخالف نے اسے "الہامی" قرار دیا اور لکھا کہ اس کتاب کے بعد اقبالؒ کو زندہ رہنے کی ضرورت نہیں تھی، غور طلب بات یہ ہے کہ جب اقبالؒ ایک پیغامبر، ایک مصلح، اور ایک مفکّر ہے تو ضربِ کلیم کو اس نگاہ سے دیکھیے کہ اقبالؒ نے کیا کہا ہے؟ ظاہر ہے کہ ضربِ کلیم میں، موجودہ دَور کو چیلنج دیا گیا ہے اور عصرِ حاضر کی تمام تحریکات کا

جائزہ لیا گیا ہے۔ تو پھر اس میں جامی اور حافظ یا سعدی اور خسرو کا رنگ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ آپ اس کتاب کا موازنہ نشاط روح، شعلۂ طور، اور باقیات فونی سے نہ کریں۔ بلکہ کانٹ، ہیگل، سپنسر، برگسان، نیٹشے، کارل مارکس، ٹالسٹائے اور افلاطون کے افکار سے کریں۔ پھر آپ کو اس کی اضافی حیثیت اور حقیقی منزلت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

باز آمدم بہ سر مطلب

تا بروز آرم شب افکار شرق بہ فروزم سینۂ احرار شرق

از نوائے پختہ سازم خام را گردش دیگر دہم ایام را

فکر شرق آزاد گردد از فرنگ

از سرود من بگیرد آب و رنگ

علامہ کا مقصد اس مثنوی سے یہ ہے کہ وہ اقوام مشرق کی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں:

(۱) مشرقی اقوام کے خیالات کی تاریکی کو دور کرنا۔

(۲) حریت پسندوں کے سینوں میں روشنی پیدا کرنا۔

(۳) اپنے پیغام سے خام طبع افراد کو پختہ کار بنانا۔

(۴) دنیا میں ایک انقلاب پیدا کرنا۔

(۵) مشرقی اقوام کو مغربی افکار کی غلامی سے رہائی دلانا یعنی انہیں ذہنی غلامی سے آزادی عطا کرنا۔

(۶) اور اپنے رنگ میں رنگین کرنا۔

یہ ہیں مقاصد ستہ، اس مثنوی کے اور آپ اس کا مطالعہ کرتے وقت انہی مقاصد عالیہ کو پیش نظر رکھیں۔

اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے وہ پیغام دیا ہے، جو مشرقی اقوام کو تباہ کن مغربی خیالات کی گرفت سے رہائی دے سکتا ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو بیسویں صدی کی سب سے بڑی ضرورت یہی تھی کہ مشرقی اقوام اور علی الخصوص مسلمانوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو کسی طرح وہ مغربی خیالات اور مغربی اقوام کی گرفت سے نکل سکیں لیکن سیاسی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک پہلے ذہنی آزادی حاصل نہ ہو جائے اسی لئے فرمایا:-

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ — از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اس کے بعد، ایک ایسی حقیقت کا اعلان فرمایا، جو فلسفیانہ عمق کے اعتبار سے اس ساری مثنوی کی جان ہے۔

زندگی از گرمئ ذکر است و بس — حریت از عفتِ فکر است و بس

مَیں چاہتا ہوں کہ شیدائیانِ اقبال اس شعر کو ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھیں۔ فرماتے ہیں کہ زندگی، آمد و شدِ نفس کا نام نہیں بلکہ تسلسل عمل کا نام ہے۔ ذکر کے معنی زبان سے کسی لفظ یا جملہ کو ادا کرتے رہنے کے نہیں ہیں (جیسا کہ آج کل غلطی سے سمجھا جا رہا ہے) بلکہ دستورِ الٰہی کے مطابق سرگرمِ عمل رہنا۔ یہ جو مسلمان ہر جمعہ کو خطبہ میں سُنتے ہیں کہ اُذکُرُوا اللہَ یَذکُرکُم۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ تم ہر وقت فرمانِ الٰہی کو پیشِ نظر رکھو اور اس فرمان (دستور یا CODE) کے مطابق زندگی بسر کرو۔ تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور اعمالِ صالح بجالانے کی توفیق ارزانی فرمائے گا لیکن جب ہماری ذہنیت خراب ہو گئی

تو جس طرح دیگر حقائق کی مٹی پلید ہو گئی، ذکر بھی دانوں سے وابستہ ہو گیا حالانکہ اس کا تعلق قلب سے ہے نہ کہ دانوں سے۔

ہاں تو، زندگی جہد پیہم کا نام ہے اور حریت دراصل "پرانشل آٹانومی" یا "دو حرفاً با دیات" یا "مجلس قانون ساز" یا "سرکز میں اکثریت" کا نام نہیں بلکہ افکار و خیالات کی صحت اور پاکیزگی کا نام ہے۔ آزاد، وہ نہیں جسے قانون بنانے کی آزادی حاصل ہو، آزاد، دراصل وہ ہے جس کا ذہن اور ضمیر، اغیار کی غلامی، سے آزاد ہو مثلاً "مسلمان خواہ اُسے مرکز میں اکثریت ہی کیوں نہ حاصل ہو جائے، آزاد نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل و دماغ، غیر اسلامی افکار اور غیر قرآنی خیالات سے پاک نہ ہو۔ اگر اس کے دل و دماغ پر "اہنسا" کا فلسفہ مسلط ہے، اگر وہ "گاندھی" یا کسی دوسرے مشرک یا غیر مسلم کسی کی رہنمائی کو تسلیم کرتا ہے تو وہ ہرگز ہرگز آزاد نہیں۔ خواہ وہ دلّی کے تخت پر ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔ پھر پڑھئے اس معرکۃ الآرا شعر کو

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس حریت از عفت فکر است و بس

اسی لئے اقبال کی خواہش یہ ہے کہ "فکر شرق آزاد گردد از فرنگ"

اس ضمن میں جاوید نامہ کا ایک شعر بھی سن لیجئے تاکہ یہ مے ناب' دو آتشہ ہو جائے۔

جز بقرآں ضیغمی روباہی است فقر قرآں اصل شہنشاہی است

فقر قرآں؟ اختلاط ذکر و فکر

فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

کاش کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ذکر اور فکر کا ہم آہنگ امتزاج از سر نو پیدا ہو سکے!

ذہنیت کی خرابی سے، قوم میں جو مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا نقشہ علامہ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

چوں شود اندیشۂ قومے خراب ناسرہ گردد بدستش سیم ناب
میرد اندر سینہ اش قلب سلیم در نگاہ او کج آید مستقیم
بر کراں از حرب و ضرب کائنات چشم او اندر سکوں بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند گوہر او چوں خزف نا ارجمند
پس نخستیں بایدش تطہیر فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

یعنی جب کسی قوم کی ذہنیت بگڑ جاتی ہے تو مفید اشیاء بھی اس کے تصرف میں آ کر، مضر بن جاتی ہیں۔ اس کا دل مُردہ ہو جاتا ہے اور وہ، چیزوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتی، جو باتیں اُس کے حق میں نقصان دہ ہیں اُن کو مفید سمجھنے لگتی ہے اور مفید باتوں کو مُضر سمجھ کر، ترک کر دیتی ہے۔ کش مکش حیات میں حصہ لینے سے جان چُراتی ہے۔ اس کے افراد زیادہ تر اپنا وقت "ڈرائنگ روم" میں ریڈیو، سگار، اور باتوں میں صرف کرتے ہیں۔ اور بقول حافظ، صراحی، غزل اور گوشۂ عافیت، کو حقیقی زندگی یقین کرتے ہیں۔ اس کے افراد کے دل میں بلند خیالات اور ارادے پیدا نہیں ہوتے اور دنیا میں اس کو کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اُس میں جو دو چار خوبیاں ہوتی ہیں ان پر بھی پانی پھر جاتا ہے۔

اندریں حالات، اس قوم کی ترقی کی صورت یہ نہیں کہ وہ قوم جلسے، جلوس، نعرے، جھنڈے، ریزولیوشن اور دوسرے تماشوں میں اپنا وقت صرف کرے بلکہ سب سے پہلے

اُسے اپنی فکر کو پاک کرنا چاہیے ۔ اور تطہیرِ فکر کے بعد تعمیرِ فکر کا کام قدرتی اور منطقی طور پر آسان ہو جائے گا

مسلمان ان اشعار کو پڑھیں اور سوچیں کہ کہیں یہ انہی کی حالت زار کا نقشہ تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر حکیم الامتؒ کے ارشاد پر عمل کرنا اُن کا فرضِ اولین ہے ۔ ان کی ترقی کی صورت یہ نہیں کہ سکول اور کالج قائم کریں ۔ ریزولیوشن پاس کریں اور جلوس نکالیں بلکہ انہیں چاہیے کہ اپنے فکر (ذہنیت) کو اسلامی بنائیں جب تک ذہنیت اسلامی نہ ہوگی وہ ہرگز ہرگز مسلمان نہیں بن سکتے اور جب تک مسلمان نہ بنیں گے ترقی نہیں کر سکتے ۔

ہاں غیر مسلم بن کر بھی ترقی ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے انہیں اس تبدیلی کا اعلان ہوگا پھر طاغوتی طاقتیں انہیں بخوشی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیں گی لیکن

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

حکمتِ کلیمی

اب کتاب شروع ہوتی ہے اور سب سے پہلی بات جو حضرت علامہؒ نے فرمائی ہے وہ مذہب و مقامِ نبوّت کی تصریح و توضیح ہے ۔

اگر آپ اس کتاب کے صفحہ ۳ پر نظر کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ نے ذیل حقائق کی تشریح فرمائی ہے ۔ (۱) حکمتِ کلیمی (۲) حکمتِ فرعونی (۳) لا الٰہ الا (۴) فقر (۵) مردِ حُر (۶) اسرارِ شریعت (۷) اشکے چند بر افتراق ہندیاں (۸)

حاضرہ۔ (۹) حرفے چند با امت عربیہ۔ (۱۰) پس چہ باید کرد۔ (۱۱) درحضور رسالت مآب تا آخر۔

یہ اس لئے کہ آپ گزشتہ باب میں پڑھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے "تطہیر فکر" ہونی چاہیے لہٰذا علامہ بھی سب سے پہلے مسلمانوں کو مقام نبوت۔ توحید۔ فقر۔ ایمان حریت وغیرہ کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں "تاکہ مسلمان ان حقائق کے متعلق صحیح علم حاصل کر کے صحیح شاہراہ پر گامزن ہو سکیں۔

ہمارے زمانہ میں نبوت۔ توحید۔ فقر۔ ایمان وغیرہ کا حقیقی مفہوم، جہالت کی تاریکی میں گم ہو چکا ہے۔ (اسی لئے پنجاب میں بعض لوگوں کو دعوئے نبوت کی جرأت بھی ہو سکی) اس ضروری ہے کہ پہلے ہم ان حقائق کے معنی او مفہوم سے آگاہ ہو جائیں۔

حکمت کلیمی یعنی نبوت و رسالت کی جو خصوصیات علامہ نے اجمالاً بیان فرمائی ہیں ان میں انہیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

(۱) ص

تا نبوت حکم حق جاری کند پشت پا بر حکم سلطاں می زند

نبی کا منصب اور مقصد (MISSION) یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام اور فرامین دنیا میں رائج کرے۔ اس لئے وہ لامحالہ دنیاوی حکومتوں سے متصادم ہوتا ہے اور سلاطین کے فرامین اور قوانین کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور بادشاہوں سے صاف

اسلام اور مسیحیت میں نبوت و رسالت کے تصور میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اسلام کسی بادشاہ کو تسلیم نہیں کرتا "لا ملوکیت فی الاسلام" لیکن مسیحیت خدا کے علاوہ قیصر کے وجود کو بھی تسلیم کرتی ہے جیسا کہ متی کی انجیل سے ظاہر ہوتا ہے۔ میری رائے میں انجیل کے غیر الہامی ہونے پر یہی ایک دلیل کافی ہے کہ یہ کتاب خدا کے علاوہ دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیتی ہے۔

لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ میں خدا کے دستور العمل کے سامنے تمہارے دستور العمل کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دے سکتا۔ اس کائنات کا حاکم خدا ہے نہ کہ یزید و بکر یا قیصر و کسریٰ اور یہ اس وجہ سے کہ :-

(ا) خدا خالقِ کائنات ہے۔

(ب) اور چونکہ وہ خالق ہے اس لئے عقلی طور پر خالق اپنی مخلوقات کا مالک ہے کیونکہ اُس نے اُن کو معدوم سے وجود کیا۔

(ج) اور چونکہ وہ مالک ہے اس لئے عقلی طور پر اپنی ملک پر حکمران ہے۔

سلاطین چونکہ خالق نہیں اس لئے مالک نہیں اور چونکہ مالک نہیں اس لئے انہیں بنی آدم پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ تمام سلاطین خدا کے باغی ہیں کیونکہ وہ انسان کو اپنی مرضی کے تابع بنانا چاہتے ہیں۔

چونکہ نبی یا رسول، خدا کے علاوہ اور کسی کو حکمران تسلیم نہیں کرتا اس لئے [1]

درنگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر عبرتِ او بزنت بد حکمِ غیر

اس کی نگاہ میں سلطان ایک بت ہے۔ اس لئے لامحالہ، اس کا محل ایک بت خانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ یعنی مردِ مومن (اور نبی تو مومن PAR EXCELLENCE ہوتا ہے) سلاطین

---

[1] علامہؒ نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ انقلاب برپا کرنے سے پہلے سیرت (CHARACT) کو پختہ کرنا ازبس لازمی ہے ورنہ وہی حشر ہوگا جو ۱۹۲۱ء میں تحریکِ عصیانِ مدنی کا ہوا تھا۔ انقلاب برپا کرنے کے لئے پختگی سیرت اسی قدر لازمی شرطِ اوّلین (PREREQUISITE) ہے جس قدر پانی کے لئے آکسیجن اور ہائیڈروجن

[2] بانشہ درویشی درساز و دمادم زن چوں پختہ شوی خود را برسلطنتِ جم زن (زبورِ عجم)

پس اگر مسلمان واقعی دوبارہ سربلندی کے آرزومند ہیں تو ریزولیوشن پاس کرنے کے بجائے، انفرادی و اجتماعی سیرت کی پختگی کی طرف متوجہ ہوں۔" ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم۔"

ع کاش اس نکتہ سے واقف ہوں مسلماں ان دنوں ✦

کے محلات سے اسی قدر دور رہتا ہے جس قدر بت خانوں سے۔

خصوصیتِ ثانی ؎

پختہ سازد صحبتش ہر خام را　　تازہ غوغائے دہد ایام را

نبی کی صحبت خام (ناقص) کو پختہ (کامل) بنا دیتی ہے اور جب اس کے پیرو پختہ ہو جاتے ہیں تو قدرتی طور پہ دنیا میں ایک انقلاب رونما کر دیتے ہیں۔

تیسری خصوصیت ؎

درسِ او اللہ بس باقی ہوس　　تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس

نبی کی تعلیم و تلقین کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ "اللہ بس باقی ہوس" یعنی مسلمان کے لئے صرف اکیلا خدا کافی ہے (اور خود خدا بھی تو یہی کہتا ہے "الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ؟") اور اس تعلیم کا فلسفہ یہ ہے کہ مردِ مومن، کسی غیر کا مطیع نہ بن جائے۔

انسان خدا کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف جھکتا ہی اس وقت ہے جب وہ خدا کو ناکافی سمجھ کر، دوسروں کو اپنا قاضی الحاجات اور حل المشکلات قرار دیتا ہے پس نبی، بنی آدم کی اس اصولی کمزوری کا علاج کرتا ہے اور اُسے بتاتا ہے کہ صرف اللہ تیرے لئے کافی ہے لہٰذا "از درِ او بہ درِ دیگر مرو"۔

چوتھی خصوصیت ؎

معنیٔ جبریل و قرآن است او　　فطرۃ اللہ را نگہبان است او

؎ اسی لئے قرآن فرماتا ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" "اے لوگو اللہ کے رسول کی زندگی میں تمہارے لئے نہایت اچھا نمونہ موجود ہے" یہیں سے سنتِ نبوی کی اہمیت ثابت ہوتی ہے اور اسی لئے آپ نے فرمایا "ترکت فیکم امرین کتاب اللہ وسنتی" "اے لوگو میں تمہارے لئے دو امر چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب دوسرا اپنی سنت پس کتاب و سنت کی پیروی ہر مسلمان پہ فرض ہے اور یہی مدارِ نجات ہے۔

اس کا طرزِ عمل، اس کی زندگی، اور اس کی گفتار و کردار، خدا کے منشاء کا آئینہ ہوتی ہے یعنی حیرت کی اور قرآن کا کیا پیغام ہے۔ یہ بنی آدم کو اس کے کردار سے معلوم ہو سکتا ہے یعنی اس کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر ہوتی ہے۔ اور وہ اللہ کی پیدا کردہ فطرت کا نگہبان ہوتا ہے یعنی انسان کو فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنی سکھاتا ہے۔ اور اُسے خلافِ فطرت طریقوں سے باز رکھتا ہے مثلاً رہبانیت کہ یہ طرزِ حیات سراسر خلافِ فطرت ہے۔ اسی لئے آپؐ نے فرمایا "لا رہبانیۃ فی الاسلام"۔

پانچویں خصوصیت ؎

حکمتش برتر ز عقلِ ذوفنون   از ضمیرش اُمتے آید بروں

اس کی تعلیم انسانی عقل سے بالاتر اور برتر ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ عقل کی پیروی نہیں کرتا بلکہ قلب سلیم کی پیروی کرتا ہے اور اس کا قلب وحی الٰہی کے نور سے منور ہوتا ہے۔ عقل جس چیز میں شکوک پیدا کرتی ہے وہ اس کو اپنی تعلیم کا بنیادی نقطہ قرار دیتا ہے (مثلاً وجود باری کہ عقل اس میں شکوک پیدا کرتی ہے) اسی لئے فرمایا کہ حکمتش برتر ز عقل ذوفنوں۔ اور وہ اپنی تعلیم کی بدولت دنیا میں ایک امت پیدا کرتا ہے۔

چھٹی خصوصیت ؎

حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج   بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

وہ بادشاہ تو ہوتا ہے لیکن تخت و تاج سے اور سپاہ و خراج سے بے نیاز ہوتا ہے۔

ساتویں خصوصیت ؎

بحر و بر از زور طوفانش خراب   در نگاہ او پیام انقلاب

وہ خشکی اور تری دونوں کو اپنے وجود سے متاثر کرتا ہے اور اس کی تعلیم سے دنیا میں ایک

انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

آٹھویں خصوصیت ؎

درسِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ می دہد تا دلے در سینۂ آدم نہد

وہ یہ سبق پڑھاتا ہے کہ کسی سے مت ڈرو" اور یہ اس لئے کہ بنی آدم کے اندر حریت اور شجاعت پیدا ہو۔

نویں خصوصیت ؎

من نمیدانم چہ افسوں می کند روح را در تن دگرگوں می کند

صحبتِ او خزف را زر کند حکمتِ او ہر تہی را پر کند

اُس نبی کی شخصیت اس قدر مقناطیسی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور اس کی صحبت سے ادنےٰ، اعلےٰ اور مفلس تونگر ہو جاتے ہیں۔

اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ صحابہؓ کی زندگیوں میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا مثال کے طور پر حضرات عمرؓ اور بلالؓ کا نام کافی ہے۔

؎ تاریخ شاہد ہے کہ آنحضرت صلعم نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج اُسی نبیؐ کی امت، انقلاب کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتی ہے ۔ اسی لئے مسٹر ایم ۔ این ۔ رائے نے اپنی کتاب (HISTORICAL ROLE OF ISLAM) میں اس امر پہ حیرت ظاہر کی ہے کہ جس مذہب نے دنیا میں اس قدر عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا جس مذہب کی کتاب انقلاب در بغل ہے آج اُس مذہب کے پیرو اس قدر جامد اور قدامت پرست ہیں کہ ان میں حرکت تک مفقود ہے ۔

؎ یہ اقبال کے محبوب مباحث میں سے ہے ۔ انہوں نے بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک (۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۳۸ء تک) مسلسل اور بہ پیہم مختلف طریقوں سے یہ نکتہ مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ مسلمان زمانہ (دہر) کا غلام نہیں ہوتا ۔ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ گھومتا نہیں بلکہ زمانہ کو اپنے ساتھ گھماتا ہے ؎

قُم مہر و انجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر (ضرب کلیم)

دسویں خصوصیت ؎

بندۂ درماندہ را گو بد کہ خیز ہر کہن معبود را کن ریزہ ریز

وہ معمولی انسانوں سے کہتا ہے کہ اٹھو اور ہر جو نقشۂ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو" تم معبودان باطلہ کو خواہ وہ انسان ہوں یا بُت، پاش پاش کر دو۔

الغرض علامہ نے نبی کی یہ دس خصوصیات بیان کی ہیں اور ان کی وضاحت کے بعد اب وہ مسلمان سے بیجا طور پر یوں خطاب کرتے ہیں :-

(ا) مرد حق! افسون این دیر کہن از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن

اے مسلمان، اگر تو واقعی رسالت محمدیہ پر ایمان رکھتا ہے تو اس دنیا کے طلسم کو "ربی الاعلیٰ" (میرا رب سب سے بلند ہے) کہہ کر توڑ دے یعنی دنیا میں کسی بادشاہ، سلطان یا حکمران کے سامنے سر مت جھکا۔ خدا کے علاوہ کسی دوسری طاقت کے سامنے سر جھکانا، شرک فی الذات ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ"۔

(ب) فقر خواہی، از تہی دستی منال عافیت در حال و نے در جاہ و مال

اے مسلمان! اگر تو فقر محمدی کا آرزو مند ہے، تو افلاس کی پرواہ مت کر کیونکہ عافیت قلبی طمانیت کا نام ہے نہ کہ مال و دولت کا ؎

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نان شعیر پہ ہے مدار قوت حیدری

(ج) بگذر از کاؤس و کئے اے زندہ مرد طوف خود کن گرد ایوانے مگرد

اے مسلمان! بادشاہوں سے بے نیاز ہو جا، ان کے محلات کا طواف مت کر جس طرح آج کل بہت سے مسلمان اُن کی کوٹھیوں کا طواف کرتے ہیں جہاں ارباب حکومت قیام پذیر ہیں بلکہ

خود اپنا طواف کر یعنی تو اپنی خودی اور اس کی مخفی صلاحیتوں پر غور کر۔

(د) تا کجا طوف چراغ محفلے؟ ز آتش خود سوز اگر داری دلے

دیگر ایں نہ آسمان تعمیر کن بر مراد خود جہاں تعمیر کن

اے مسلمان! نئی دنیا پیدا کر، ایسی دنیا جو تیری آرزوؤں کے مطابق ہو۔ اگر تو دیکھتا ہے کہ موجودہ نظام تیرے معتقدات کے خلاف ہے تو، اس نظام کو درہم برہم کر دے اور ایسا نظام قائم کر، جو قرآن کا دمساز ہو تاکہ تو اسلامی زندگی بسر کر سکے۔

(ہ) اس جگہ یہ شبہ دل میں گذر سکتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان، نئی دنیا (زمین و آسمان) کس طرح پیدا کر سکتا ہے؟ تو علامہ نے دفع دخل مقدر کے طور پر فرمایا ہے ؎

چوں فنا اندر رضائے حق شود بندۂ مومن قضائے حق شود

چار سوئے با فضائے نیل گوں از ضمیر پاک او، آید بروں

یعنی اے مسلمان! تو میری بات سن کر متعجب نہ ہو بے شک تو نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر سکتا ہے، اب سوال ہوگا کس طرح؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اے مسلمان، خدا کی مرضی میں، اپنی مرضی کو فنا کر دے شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرلے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو "قضائے حق" بن جائیگا تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہو جائے گا وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ ؎

مرضی او، مرضی حق مے شود

ماہ از انگشت او شق مے شود (جاوید نامہ)

پھر اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

در رضائے حق فنا شو چوں سلف گوہر خود را بروں آر از صدف

اے مسلمان! اپنے اسلاف کی طرح اپنی مرضی کو، خدا کی مرضی میں فنا کر دے اور اس

طرح اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا۔

بات یہ ہے کہ جب مومن، اپنی مرضی، اللہ کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے تو اللہ اس کا ثمرہ عطا کرتا ہے کہ ؎

درر ضائش مرضیٔ حق گم شود　　　این سخن کے باور مردم شود

(۵) تا نہ گیری از جلالِ حق نصیب

ہم نیابی از جمالِ حق نصیب

اے مسلمان! جب تک تجھے اللہ کے جلال سے حصہ نہ ملے۔ اس وقت تک تجھ کو اس کے جمال سے بھی کوئی حصہ نہیں مل سکتا یعنی جب تک تجھ میں قوت اور شوکت پیدا نہ ہو اس وقت تک تو کسی پر کرم بھی نہیں کر سکتا پس تجھے سب سے پہلے اپنے اندر حکومت اور سروری کی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے۔

(۶) ابتدائے عشق و مستی قاہری است　　　انتہائے عشق و مستی دلبری است

مردِ مومن از کمالاتِ وجود　　　او وجود و غیرِ او ہر شے نمود

گر بگیرد سوز و تاب از لا الٰہ

جز بکام او نہ گردد مہر و مہ

یہ آخری تین شعر بہت غور سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "عشق و مستی کی ابتدا یہ ہے کہ عاشق میں قوت اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن عشق کی انتہا یہ ہے کہ عاشق ہر

؎ اقبال کے یہاں بھی "فنا" کی تعلیم ملتی ہے مگر اپنشد (شنکر اچاریہ) اور اقبال میں یہ فرق ہے کہ شنکر انفرادی خودی کو خدا میں فنا کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور اقبال انفرادی "مرضی" کو خدا کی مرضی میں فنا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ والفرق بینھما ظاھر۔

شانِ محبوبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کائنات پہ رؤف الرحیم ہو جاتا ہے، وہ لوگوں کے دلوں پہ حکمرانی کرتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس شخص میں قاہری اور دلبری دونوں صفات پیدا ہو جاتی ہیں وہ شخص نبی یا مثیلِ نبی بن جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ خود فرماتے ہیں ؎

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است (جاوید نامہ)

پھر فرماتے ہیں کہ وجود کے کمالات دراصل مردِ مومن ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دراصل وجود کا اطلاق اُسی پہ درست ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ سے فیض حاصل کرے یعنی توحید پہ عامل ہو جائے تو پھر وہ عناصرِ کائنات پر حکمران ہو جاتا ہے ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے لوکروڑ مسلمان توحید کے قائل تو ہیں مگر اس پہ عامل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی زبردست تعداد کے باوجود غلام ہیں جنگِ موتہ میں ۳ ہزار مسلمانوں نے اپنے سے چالیس گنی فوج کو شکست دی تھی۔ آج یہ حالت ہے کہ جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے وہاں بھی ہم دوسروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں فاعتبروا یا اولوالابصار۔

حکمتِ فرعونی

علامہ اقبال سے اربابِ دین کی حکمت سُن چکے اربابِ کیں کی حکمت کے متعلق ان کے

ارشادات ملاحظہ ہوں:-

(۱) حکمت ارباب کیں مکر است و فن مکر و فن؟ تخریب جان تعمیر تن

ارباب کیں کی حکمت یعنی وہ دانائی یا علم جو ارباب کیں (دشمنانِ اسلام) لوگوں کو سکھاتے ہیں خالص مکر و فن سے عبارت ہے۔ سوال ہوگا کہ مکر و فن سے کیا مراد ہے۔ اس لئے علامہؒ جواب دیتے ہیں کہ مکر و فن سے میری مراد وہ ضابطۂ فکر و اخلاق ہے جس پر عمل کرنے سے روحانیت فنا ہو جائے اور انسان خالص مادہ پرست (ملحد اور منکر آخرت) بن جائے یعنی

حکمتے از بند دیں آزادہٗ از مقام شوق دور افتادہٗ

دشمنان دین نبیؐ، جو عقل و خرد عطا کرتے ہیں وہ، شریعت اسلامیہ کی حدود و قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ یعنی اس کی بنیاد لادینی پر ہوتی ہے۔ اس حکمت سے دماغ تو منوّر ہو جاتا ہے بلکہ دل مُردہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں قومیّت، وطنیت، اشتراکیت اور مرزائیت کے نظریے آہستہ آہستہ مسلمان نوجوانوں کو متاثر کر رہے ہیں یعنی اُن کو غیر محسوس طور پر لادینی اور الحاد کی طرف مائل کر رہے ہیں۔

(۲) حکمتِ فرعونی کا دوسرا عنصرِ فعال (WORKING PRINCIPLE) وہ درسی نظام ہے جو مکتبوں، مدرسوں، سکولوں اور کالجوں کی شکل میں ہمیں نظر آرہا ہے اور سطح بین نگاہوں کو، عمارتوں، سبزہ زاروں (LAWNS) معملوں (LABORATORIES) دارالاقاموں (HOSTELS) ڈگریوں طلیلسانوں (GOWNS) اور تنخواہوں سے خیرہ کر رکھا ہے۔

(ل) مکتب از تدبیر او، گیرد نظام تا بکام خواجہ اندیشد غلام

ان سکولوں اور کالجوں کے قیام اور امداد (GRANT) کا مقصد یہ ہے کہ غلاموں کی

جو فوج ہزیمت مورج، ان میں تعلیم حاصل کرے وہ

(۱) اپنی ہستی سے غافل ہو جائے اور اپنے سود و بہبود سے بے خبر۔

(۲) اس کے دماغ میں صرف وہی خیالات پیدا ہو سکیں جو آقاؤں کے مفید مطلب ہوں۔

علامہ کے پیرو، لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے صاف طور سے کالج کو "مذبح" (SLAUGHTER HOUSE) سے تشبیہ دی ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک شعر اور بھی سن لیجئے، شاید پسند آجائے۔

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے، فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے، فقط سرکاری ہے　(اکبر)

جو لوگ محاوراتِ زبان سے آشنا ہیں وہ "بازاری تعلیم" کی ترکیب سے بخوبی لطف اندوز ہو سکتے ہیں (الکنایۃ ابلغ من التصریح)

(۳) ارباب کیں کا تیسرا اصول یہ ہے کہ وہ شیوخِ ملت کو یا ان میں سے کسی ایک موزوں آدمی کو، اس کام پر مامور کر دیتے ہیں کہ وہ دلچسپ طریقہ سے، اُن کے مطلب کے موافق، اسلام کی تجدید کر دے۔

شیخ ملت با حدیث دلنشیں　　بر مراد او کند تجدید دیں

چنانچہ ہمارے زمانہ میں، ایک اہلمد کلکٹری، آنکھوں دیکھتے دیکھتے "ظلِ نبی" بن گیا۔ اور اس نے بیک جنبشِ قلم، جہاد کو منسوخ کر دیا تاکہ اس کے مخدوم اور مطاع ہندوستان کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی پوری توجہ سرحدی پٹھانوں کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنانے پر مبذول کر سکیں۔

از دم او وحدت قومے دو نیم　　کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم

علامہ فرماتے ہیں کہ "شیخ ملت" کی تجدید کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وحدتِ ملی فنا ہو جاتی ہے۔

بلکہ وہ شیخ خود ایک نئی ملت کا موجد ہوتا ہے جو اس کے خود کاشتہ پودے کا ثمر ہوتی ہے اور اس مقابلہ مناظروں اور مباحثوں سے نہیں بلکہ صرف چوب کلیم سے ہو سکتا ہے ۔

اے قومے کشتۂ تدبیر غیر کار او تخریب خود تعمیر غیر

اب علامہ اس قوم کے حال زار پر آنسو بہاتے ہیں جو ارباب کیں کی غلامی میں گرفتار ہو۔ اس قوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ

(الف) اس قوم کے افراد، دن رات اپنی تخریب اور بربادی کا سامان کرتے رہتے ہیں اور اغیار (ارباب کیں) کے مفاد کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس مصرعہ میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں:-

(۱) تخریب خود ۔ (۲) تعمیر غیر ۔

تخریب ذاتی کے شواہد:- (۱) تبرا اور مدح صحابہ ۔ (۲) بریلوی، دیوبندی، نزاع ۔

تعمیر غیر کے شواہد:- (۱) از پشاور تا ڈھاکہ ۔ (۲) از لنڈی کوتل تا راس کماری ۔

یہی منظر تو اکبر نے دیکھ پایا تھا جو یہ شعر لکھا تھا

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی

انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

(ب) اس قوم کے افراد علم و فن میں تو بہت ماہر ہو جاتے ہیں یعنی لندن کیمبرج آکسفورڈ پیرس اور برلن سے ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں ۔ آسمان کے ستاروں کی تعداد بتا سکتے ہیں ۔ بلکہ اس کے ساتوں طبقوں کا حال سنا سکتے ہیں، مریخ سے نامہ و پیام کر سکتے ہیں، روحوں کا فوٹو کھینچ سکتے ہیں۔ کرۂ ارض کا وزن بتا سکتے ہیں مختصر یہ کہ زمین اور آسمان دونوں کے قلابے ملا سکتے ہیں لیکن اپنے وجود سے بیگانہ رہتے ہیں ۔

می شود در علم و فن صاحب نظر از وجود خود نگردد با خبر

(ج) نقش حق را از نگیں خود ستزد در ضمیرش آرزو ہا زاد و مُرد

اس قوم کے افراد، اپنے دل سے خدا کے خیال کو مٹا دیتے ہیں اور جو آرزو اُن کے دل میں ہوتی ہے وہ فوراً فنا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُن میں اُس آرزو کو زندہ رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے پس اُن کے دل میں اگر کوئی آرزو ہوتی ہے تو یہ کہ "صاحب" سے ہاتھ ملا سکیں۔

مجمع میں ذرا ہاتھ ملا لیجئے مجھ سے

صاحب میرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

(د) بے نصیب آمد ز اولادِ غیور جاں بہ تن چوں مردہ در خاکِ گور

یہ قوم یعنی غلام قوم، اولادِ غیور سے محروم ہو جاتی ہے یعنی اس قوم کے افراد میں غیرت کا مادہ باقی نہیں رہتا اور بے غیرتی کی بنا پر اُن کی روح، بالکل قبر کے مُردہ کی طرح بے حس ہو جاتی ہے چنانچہ اسی بے غیرتی اور بے حسی کا نتیجہ ہے کہ اس قوم کے افراد:

(۱) اپنے بھائیوں کی جاسوسی اور مخبری کا مقدس فرض انجام دیتے ہیں۔

(۲) اپنے ہاتھ سے اپنے بھائیوں کا گلا بلا تامل کاٹ دیتے ہیں۔

(۳) اپنی سنگینوں کی نوکیں اپنے بھائیوں کے سینوں میں پیوست کر دیتے ہیں۔ اور اس کے صلہ میں اپنے سینوں کو تمغوں سے مزین کرتے ہیں۔

(۴) غیر مسلم قوم کے مجوزہ دستور پر اپنے ہاتھوں سے دستخط کرتے ہیں اور اسلام کش تعلیمی سکیمیں خود اپنے قلم سے مرتب کرتے ہیں۔

(۵) اپنی مساجد کو مسلمانوں پر بند کرتے ہیں اور جب پولیس ان کو مقفل کر دیتی ہے تو اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اس کارنامہ پر خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے "وہابیوں" کو اپنی مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دی۔

(ہ) از حیا بیگانہ پیران کہن نوجواناں چوں زناں مشغول تن

اس قوم کے سفید ریش افراد، حیا سے بیگانہ ہوتے ہیں ۔اور اس قوم کے نوجوان افراد، عورتوں کی طرح جسمانی آرائش میں مشغول رہتے ہیں ۔یقین نہ آئے تو ہوسٹلوں میں جا کر دیکھ لیجئے۔کمرہ میں نہ تلوار ہوگی نہ بندوق ۔ہاں میز پر کریم (CREAM) کی شیشیاں، اور پوڈر (POWDER) کے ڈبے رکھے ہوئے ہوں گے ۔لونڈر اور سینٹ کی افراط ہوگی لیکن قرآن اور مصلّی کا نشان نہ ہوگا ۔

(و) در دل شاں آرزوہا بے ثبات مردہ زاید از بطون امہات

اس قوم کے نوجوانوں کے سینے آرزو سے خالی ہوتے ہیں ۔اور اس کا سبب بالکل عیاں ہے، آرزو تو زندہ قوم کے افراد میں پیدا ہوتی ہے ۔اور اس قوم کے افراد تو ماں کے پیٹ سے ہی مُردہ پیدا ہوتے ہیں ۔

آرزو، اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں

ہو اگر پیدا، تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام (ارمغان حجاز)

(ز) دختران او بزلف خود اسیر شوخ چشم و خود نما، و خوردہ گیر

ساختہ، پرداختہ، دلباختہ ابرواں مثل دو تیغ آختہ

ساعد سیمینِ شاں، عیش نظر

سینہ ماہی بموج اندر نگر

اور اس قوم کی لڑکیاں (معاذ اللہ) خود اپنی ہی زلفوں میں اسیر ہوتی ہیں جسمانی آرائش اُن کا مقصدِ حیات ہوتا ہے ، بے باک ، بے حیا ، خود نما ، اور خفیف الحرکات ، دن رات بناؤ سنگار سے کام ، ویدے کا پانی ڈھلا ہُوا ۔زرق برق لباس ، کنگھی چوٹی سے درست ، دلوں میں ناپاک خیالات کا ہجوم ، اَبرو (بھویں) جیسے کھینچی ہوئی دو تلواریں ، بانہہ بالکل عریاں یا

سینہ باز، ملبوس اس قدر باریک کہ تمام جسم، اس میں سے اس طرح نظر آجائے جیسے پانی میں تیرتی ہوئی مچھلی نظر آتی ہے!!

(ح) جلتے خاکستر او بے شرر صبح او از شام او تاریک تر

الغرض اس قوم کے افراد کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اُن کی خاکستر میں راکھ ہی راکھ ہوتی ہے، چنگاری کا نام و نشان کبھی نہیں ہوتا۔ اور ان کی عقلوں پہ حکمتِ فرعونی، ایسا پردہ ڈال دیتی ہے کہ وہ بُرائی کو اچھائی سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اسی حماقت شعاری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہر آبرو باختہ ایکٹریس اُن کی نظر میں مقصودِ حیات بن جاتی ہے اور جب خوش قسمتی سے وہ اُن کے شہر میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرنے آتی ہے، تو وہ اُس کے استقبال کے لئے، دیوانہ وار پلیٹ فارم پہ جمع ہو جاتے ہیں، اور اس دیوانگی کے عالم میں جنکشن سے بادامی باغ تک بھاگے چلے جاتے ہیں!

(ط) ہر زماں اندر تلاش ساز و برگ کار او فکرِ معاش و ترسِ مرگ

اس قوم کے افراد ہر وقت سامانِ زیست کی تلاش میں منہمک رہتے ہیں اور اُن کی تمام زندگی کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

فکرِ معاش او ترسِ مرگ

(ی) منعمان او بخیل و عیش دوست غافل از مغز اند و اندر بند پوست

اور اس قوم کے دولت مند عموماً کنجوس اور عیاش ہوتے ہیں؛ زندگی کی حقیقت سے بیگانہ، محض سطحی باتوں، اور عارضی لذتوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

(ک) قوتِ فرمانروا معبودِ او در زیانِ دین و ایمان سودِ او

اس قوم کا معبود اللہ نہیں ہوتا بلکہ قوتِ فرمانروا، اور یہ قوم دین و ایمان کو ارزاں قیمت فروخت کرنا ہی اپنے حق میں مفید سمجھتی ہے چنانچہ اس طبقہ کے افراد (الا ماشاء اللہ) آٹھویں

دن جمعہ کی نماز میں کبھی شریک نہیں ہوتے لیکن "سٹی مجسٹریٹ" کے بنگلہ پہ حاضری قضا نہیں ہو
قرآن، بھولے سے بھی نہیں پڑھتے لیکن "سی ایم جی" کی تلاوت بلاناغہ کرتے ہیں، اور اس قوم (طبقہ
امراء) میں جو افراد، صاحب فکر ہوتے ہیں، وہ اکثر اپنے اجداد کی اس غلطی پر دست تاسف ملتے
کہ انہوں نے مسجد بنانے کے عوض "بلڈنگ" کیوں نہ بنائی۔ جو اس وقت ہزار روپیہ ماہوار
"جائداد" ہوتی! مسجد پہ تو اُلٹا خرچ کرنا پڑتا ہے!

(ل) از نیاگاں دفترے اندر بغل — الاماں از گفتہ ہائے بے عمل

اس قوم کے افراد کے پاس، اسلاف کی تصانیف کا بڑا ذخیرہ ہوتا ہے اور یہ قوم دن
باتیں بنانے میں مصروف رہتی ہے عمل سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

(م) از خدا امروز خود بیروں نجست — روزگارش نقش یک فردا نبست

اس قوم کے افراد صرف آج کی فکر کرتے ہیں، کل کیا ہوگا؟ اس سے انہیں کوئی واسطہ نہ
(ع) عاقبت کی خبر خدا جانے۔

(ن) دین او، عہد وفا بستن بغیر — یعنی از خشت حرم تعمیر دیر

اسلام تو اس قوم کا مذہب ہوتا نہیں، پھر سوال یہ ہے کہ آخر اس قوم کا دین کیا ہوتا
علامہ جواب دیتے ہیں کہ اس قوم کا دین یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے عہد وفا باندھتی ہے یعنی حرم
سے دیر کی تعمیر میں مصروف رہتی ہے۔

چنانچہ اس قوم کے افراد آئے دن، اغیار سے اپنی غیر متزلزل وفاداری کے ریزولیوشن پاس
ہیں اور محفلوں میں اُن کی صحت کا جام شیریں نوش کرتے ہیں!

آخر میں علامہؒ اس قوم کی ذہنی اور اخلاقی موت کا ان الفاظ میں ماتم کرتے ہیں۔

آہ قومے دل ز حق پرداختہ — مُرد و مرگِ خویش را نشناختہ

افسوس ہے ایسی قوم پر، جو اپنے سینہ کو سچائی سے خالی کر چکی ہو۔ موت کی شاہراہ پر گامزن ہو اور اس کی حماقت کا یہ عالم ہو کہ وہ موت کو حیات یقین کرتی ہو!

توحید

توحید کے عنوان کے ماتحت علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مفہوم بیان فرمایا ہے۔ جو لوگ علامہ کے انداز بیان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ فلسفہ نزاری کے وقت وہ ایک بلند مقام سے گفتگو کرتے ہیں اس لئے ان کی طرز نگارش ہندی فلسفہ کے "ستروں" کی طرح بہت مجمل اور بلیغ (CONDENSED) ہو جاتی ہے۔ تاکہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی سما سکیں یہ طرز اُن کے مشہور "خطبات مدراس" کے ہر فقرہ سے نمایاں ہے اور اس موقع پر یعنی لا الہ الا اللہ کی تفسیر میں بھی انہوں نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے مثنوی پس چہ باید کرد کے چار صفحوں میں اس موضوع پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کی تشریح کے لئے پچاس صفحے بھی کافی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے میں بھی "پیغام حق" کے محدود صفحات کو مدّ نظر رکھ کر، دل پر جبر کروں گا اور نہایت اختصار سے کام لوں گا۔ فرماتے ہیں :-

نکتۂ می گویم از مردانِ حال   امتاں را لا جلال، اِلّا جمال

کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ دو اجزا سے مرکب ہے لا الہ یعنی کوئی ہستی اس لائق نہیں کہ انسان اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور الا اللہ یعنی سوائے ایک ہستی کے جس کا نام اللہ ہے، شعر کا ترجمہ تو آسان ہے، ہر کوئی دان کر سکتا ہے لیکن مفہوم قدرے غور طلب ہے۔ اس کی تفہیم کے لئے تین لفظوں کو پہلے سمجھ لینا چاہئے "مردانِ حال" علامہ فرماتے ہیں کہ جو نکتہ میں بیان کروں گا وہ میں نے مردانِ قال سے نہیں بلکہ مردانِ حال سے سیکھا ہے۔ پس پہلی بات ذہن نشین کرنے کے لائق یہ ہے کہ اس نکتہ سے وہی شخص کما حقہٗ

لطف اندوز ہو سکتا ہے جو صاحب حال ہو" مردانِ حال" سے مراد وہ لوگ ہیں جو قال (فلسفہ) سے بے نیاز ہو کر، وجدان کی بدولت، معرفت تامہ حاصل کرتے ہیں۔

یعنی توحید کی اصلیت اور حقیقت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک انسان "قال" کی منزل ادنیٰ سے گزر کر "حال" کی منزل ارفع میں داخل نہ ہو۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا توحید ارباب قال کے لئے نہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ضرور ہے اور اس کا ظاہری مفہوم کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، اُن کے لئے کافی ہے لیکن اگر وہ اس حقیقت سے آشنا ہونا چاہتے ہیں تو انہیں، وہ طریقہ اختیار کرنا لازمی ہے جو اس کے لئے درکار ہے۔ مثلاً برق سے ہم سب آشنا ہیں لیکن اس کی ماہیت کا علم منحصر اس پر ہے کہ طالب علم، دفتر پارو کان سے بے نیاز ہو کر کسی عالم طبیعات کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرے۔ پانی کا آلہ پیمائش انچ یا فٹ نہیں، نغمہ کا آلہ ناک یا آنکھ نہیں، آموں کو کاٹنے میں وزن نہیں کرتے۔ اسی طرح توحید کے مفہوم حقیقی سے آگاہ ہونے کا ذریعہ قال نہیں، حال ہے اب پھر اشکال کیا ہے؟

القصہ جو لوگ نہ سے آشنا ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ع امتاں را لاجلال الاجمال

دوسرا لفظ غور طلب، جلال ہے اور تیسرا غور طلب لفظ جمال ہے۔ جلال سے مراد ہے قاہری اور جمال سے مراد ہے دلبری۔ قاہری، دل میں خوف پیدا کرتی ہے اور دلبری دل میں محبت پیدا کرتی ہے۔ اور یہ دونوں، حیات انفرادی اور حیات اجتماعی کے لئے ضروری ہیں یعنی زندگی کی دو شاخیں (ASPECTS) ہیں جن کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی۔

قاہری اور دلبری دونوں ایک ذات میں جمع ہو جائیں تو انسان میں پیغمبری کی شان پیدا ہوتی ہے اور صرف دلبری جادوگری ہے اور صرف قاہری ابلیسیت ہے جیسا کہ علامہ خود فرماتے ہیں۔

دلبری با قاہری پیغمبری است دلبری بے قاہری جادوگری است

خلاصۂ کلام یہ کہ امتوں کے لئے اس کلمہ کے دونوں اجزاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لاالہ سے اُن کے اندر شانِ قاہری پیدا ہوتی ہے اور الا اللہ سے شانِ دلبری پیدا ہوتی ہے اس کلمہ کے دونوں اجزاء پر ایمان لانے سے امتوں کے اندر جلال اور جمال یہ دونوں رنگ پیدا ہو جاتے ہیں اور زندگی کی تکمیل و تہذیب کے لئے یہ دونوں رنگ ضروری ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ لاالہ اور جلال میں اور الا اللہ اور جمال میں کیا منطقی ربط پایا جاتا ہے؟

جب کوئی قوم لاالہ کا نعرہ بلند کرتی ہے یعنی جب اس کے اقوال و افعال سے "دیگرے نیست" کا رنگ عیاں ہوتا ہے تو وہ دوسرے لفظوں میں اپنی خودی کی قوتوں کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنی شخصیت کے امکاناتِ مضمرہ (HIDDEN POSSIBRLTTES) کو خارجی وجود عطا کرتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ "لاالہ" یعنی کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے میں سرِ تسلیم خم کر سکتا ہوں یا جو مجھ پر حکمرانی کر سکتی ہے فرد اور قوم دونوں کے اندر بے پناہ طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ طاقت کا دوسرا نام "جلال" ہے۔

جب وہ قوم حکومت یا قاہری یا جلال کے ساتھ ساتھ، اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتی ہے کہ الا اللہ یعنی "سوائے اللہ کے" تو اس کے اندر تقویٰ طہارت، شرافت، انسانیت، رحمل، فیاضی یعنی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جس قوم میں روحانیت پیدا ہو جائے وہ حسین و جمیل بن جاتی ہے یعنی دنیا اس کے زیر سایہ آنا چاہتی ہے۔ الغرض روحانیت کا دوسرا نام "جمال" ہے۔

جس قوم میں جلال اور جمال دونوں صفتیں ممزوج ہو جائیں وہ مسجودِ ملائکہ بن جاتی ہے

جلال مع جمال = حیدر کرار رضؓ

جلال بغیر جمال = مہدی سوڈانی کی استخوانِ سوختہ سے پوچھیے۔

(بجنسہٖ)

جمال بغیر جلال = مولانا محمد علی مرحوم

اس جگہ ایک شبہ دل میں پیدا ہوگا کہ اگر واقعی ان معنوں کے اندر لا الہ سے جلال اور الا اللہ سے جمال پیدا ہوسکتا ہے تو یہ کلمہ نو کروڑ ہندوستان کے "فرزندانِ توحید" کی زبان پر ہے پھر وہ کیوں محکوم ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ زبان ہی پر تو ہے۔ اس سے فائدہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ اگر ایک مریض رات دن زبان سے یہ کہتا ہے کہ ڈاکٹر عبد القوی بڑے حاذق ہیں لیکن اُن کی طرف رجوع نہیں کرتا، تو اُسے ڈاکٹر صاحب کے حاذق ہونے کا کیا فائدہ؟

اگر ایک مریض چشم دن رات زبان سے کہتا رہے کہ (PROTARGOL) دافع آشوبِ چشم ہے، تو کیا محض زبان سے کہتے رہنے کی بنا پہ اُسے صحت ہوجائے گی۔ کیا یہ کہتے رہنے سے کہ پانی پیاس بجھاتا ہے، کسی کی پیاس بجھ سکتی ہے؟ اگر نہیں تو محض زبان سے لا الہ الا اللہ کہتے رہنے سے قاہری اور دلبری کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟

ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان بلاشبہ، لا الہ الا اللہ کا ورد رکھتے ہیں بلکہ بعض تو اس کلمہ کو دن بھر رٹتے رہتے ہیں۔ اور سبحہ شماری ہی کو مقصودِ حیات سمجھتے ہیں لیکن ضرورت سمجھ کر کہنے کی ہے

لا الہ گوئی؟ بگو از روئے جاں   تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں

ایں دو حرف لا الہ گفتار نیست   لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست

زیستن با سوز او قہاری است

لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

صرف ۳۱۳ مسلمانوں نے اس کلمہ کے معنی، ذہن نشین کر لئے تھے تو دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کردیا تھا۔ اور صرف ایک مسلمان نے اس کا مفہوم سمجھ لیا تھا تو خیبر کا دروازہ اکھیڑ لیا

تھا لیکن ہندوستان میں پورے نو کروڑ مسلمان یہ کلمہ پڑھتے ہیں اور پھر بھی غلام ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ انہیں مطلق علم نہیں کہ اس کلمہ کے لوازمات کیا ہیں؟

اور سچ تو یہ ہے کہ اس ملک میں غلاموں کو اس کلمہ کے پڑھنے کی اجازت بھی تو اسی لئے ملی ہوئی ہے کہ نو کروڑ فرزندانِ توحید مطلق نہیں سمجھتے کہ "لاالہ الا اللہ" کا اقتضاء کیا ہے؟ یا یہ کلمہ اپنے معتقدین سے کس بات کا مطالبہ کرتا ہے؟ یا اس اعلان کا نتیجہ کیا ہے؟ یا مسلمان کسے کہتے ہیں؟ یہ جو آپ اپنی مساجد کے میناروں سے روزانہ پانچ دفعہ "لاالہ الا اللہ" کی آواز بلند کر سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ اس کلمہ کا ادا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور نہ سننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کیا سُن رہے ہیں۔ ع

یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

جب کوئی قوم لاالہ کہتی ہے تو وہ کائنات کی ہر شئے کو اپنا محکوم سمجھ کر، اس کا مطالعہ کرتی ہے کہ اُس سے فائدہ حاصل کرے۔ اس طرزِ تحقیق اور اس رجحان کا نام حکمت (سائنس) ہے! اور ایسی ہی قوم اکائنات پر حکمران ہوتی ہے۔ یہی شانِ قاہری ہے یعنی رنگِ جلال۔

پھر جب وہ قوم الا اللہ کہتی ہے تو وہ اس ضابطہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتی ہے جو کتاب (قرآن) میں مذکور ہے اور اس لئے اس کے اندر تقویٰ اور خداترسی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی شانِ دلبری ہے یعنی رنگِ جمالی۔

اسی لئے اللہ نے اپنے رسولؐ کو کتاب اور حکمت دونوں چیزیں دے کر دُنیا کے لئے رحمت بنایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

" ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم ایاتہ ویعلمھم

الکتاب والحکمۃ" یعنی اللہ وہ ہے جس نے امیوں میں ایک رسول مبعوث کیا جو اُن کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ اور ان میں رنگ جلال اور شانِ جمال پیدا کرنے کے لئے، ان کو کتاب اور حکمت دونوں کی تعلیم دیتا ہے۔ (سورۂ جمعہ ۲ ا)

کیا خوب فرمایا ہے حکیم الامتؒ نے

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است این دو قوت اعتبار ملت است
آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعام خدائے لایزال
مومناں را آں جمال است ایں جلال

حضرت علیؓ نے میدانِ جنگ میں ایک کافر کو پچھاڑا اور سینہ پر چڑھ بیٹھے یہ رنگ جلال تھا۔ لیکن جب اُس نے روئے اقدس پر تھوکا، تو فوراً تلوار نیام میں کر لی اور پلٹ آئے۔ یہ شانِ جمال تھی۔ لاالہ نے انہیں "خسروی شمشیر" عطا کی؛ الا اللہ نے انہیں "درویشی نگہ" عنایت کی۔ انہوں نے ایک ہی واقعہ میں جلال اور جمال دونوں شانوں کا مظاہرہ کیا، کیونکر؟ اس لئے کہ لاالہ الا اللہ نے انہیں یہ دونوں شانیں عنایت کر دی تھیں۔ لاالہ نے اُن کے بازو میں زور پیدا کر دیا۔ اس لئے انہوں نے کافر کو مغلوب کر لیا۔ الا اللہ نے ان کے دل میں تقویٰ پیدا کر دیا۔ اس لئے انہوں نے اس کو (اپنے دشمن کو) معاف کر دیا (تاکہ انتقامی جذبہ انکی للہیت کو ملوث نہ کر دے)

خسروی شمشیر و درویشی نگہ ہر دو گوہر از محیط لاالہ

الغرض شمشیر اور نگاہ، قاہری اور دلبری، حکومت اور روحانیت یعنی جلال اور جمال لاالہ اور الا اللہ کا ثمر ہیں۔

اب سمجھ پڑھیے اُس شعر کو

نکتہ می گویم از مردانِ حال　　امتاں را لا جلال الا جمال

غالباً آپ اس شعر کا مطلب کسی قدر واضح ہو گیا ہوگا۔ اور لا الہ اور جلال، اور الا اللہ اور جمال میں جو ربط مضمر ہے وہ بھی ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ آخر میں اس قدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی زندگی میں جو نہ شانِ جلال ہے نہ رنگِ جمال اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کے مفہوم سے بیگانہ ہیں۔

اب اس قضیئے کا عکس کر لیجیے تو صورت یہ ہوگی کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے اندر جلالی اور جمالی شان پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ اشتراکیت اور گاندھویت (اہنسا اور چرخا) دونوں سے قطع نظر کر کے، لا الہ اور الا اللہ کا مفہوم سمجھ لیں۔

چوں علیؓ در ساز با نانِ شعیر　　پنجۂ مرحب شکن، خیبر بگیر

اگر دل چاہے تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے انہیں نصف صدی کے اندر اندر ربع مسکوں کا مالک بنا دیا تھا؟ کس طاقت سے انہوں نے قیصر اور کسریٰ کے تخت الٹ دیئے تھے؟ جنگ موتہ میں پے در پے نو تلواریں خالدؓ کے ہاتھ میں کس طرح ٹوٹ گئی تھیں؟ باختر سے لے کر بحرِ ظلمات تک اُن کے نام کا سکہ کیسے رواں ہو گیا تھا؟ امیر المومنین حضرت علیؑ کیونکر اپنے ماتحت قاضی کی عدالت میں حاضر ہوئے؟ خالدؓ نے اپنی معزولی کو کس لئے بطیبِ خاطر گوارا کر لیا؟ ملک شاہ سلجوقی نے کس وجہ سے گھوڑے سے اُتر کر ضعیفہ کی داد رسی کی؟ سلطان محمود بیگڑہ نے کیوں اپنے گھوڑے کی سواری ترک کر دی؟ عالمگیر نے تیروں کی بارش میں کس طرح نماز عصر ادا کی؟

یعنی ان لوگوں میں جلال اور جمال کا یہ رنگ کس طرح پیدا ہو سکا ؟
اس کا جواب صرف یہی ہے کہ یہ لوگ کلمہ لا الہ الا اللہ کے مفہوم سے آگاہ تھے ۔ کیا خوب فرمایا ہے اقبالؒ نے ؎

تا دو تیغ لا و الّا داشتیم ماسوا اللہ را نشاں نگذاشتیم

لا الٰہ کا مفہوم

تا نہ رمز لا الہ آید بدست بند غیر اللہ را نتواں شکست

جب تک لا الہ کا مفہوم سمجھ میں نہ آجائے ، انسان اپنے آپ کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد نہیں کر سکتا ۔

جو قومیں اس وقت غیر اللہ کی غلامی میں گرفتار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لا الہ کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا ہیں لا الہ کا مطلب یہ نہیں کہ " کوئی دوسرا خدا نہیں " بلکہ " کوئی طاقت نہیں جو مجھ پہ حکمران ہو سکے " اور جب کوئی قوم اس حقیقت کو سمجھ لیتی ہے کہ کائنات میں کوئی طا[قت] (انسان، حیوان، کوہ و دریا، شمس و قمر، آسمان و زمین، شجر و حجر) مجھ سے بالاتر نہیں ہے تو عقیدہ اس میں اس قدر قوت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے ۔

عنوان زیر بحث (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ) کے تحت علامہؒ نے اس مثنوی میں آئندہ جس [قدر] اشعار لکھے ہیں وہ سب شعر مذکورہ بالا کی تعریف میں یعنی انھوں نے خود ، رمز لا الہ کی و[ضاحت] فرمائی ہے ؎

در جہاں آغاز کار از حرف لا است ایں نخستیں منزل مرد خدا است

دُنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز حرف لا سے ہوتا ہے یعنی یہ عقیدہ کہ کوئی معبود نہیں

ایک موحد کی زندگی کی پہلی منزل ہے۔ (صرف ایک خدا ہے جو معبود ہے' یہ دوسری منزل ہے) یعنی اس کی زندگی کی تمام فعالیت (ACTIVITY) اس بنیادی حقیقت پر مبنی ہے کہ کائنات میں نہ کوئی طاقت مجھ پر حکمراں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ ہو اس لئے نہیں سکتی کہ اس کائنات میں قوت کا مظہر اتم، انسان ہے اور سب انسان۔ میری طرح مخلوق اور محتاج الی الغیر ہیں۔ پس کسی انسان کو مجھ پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے ؎

ملتے کز سوز او یک دم تپید		از گلِ خود خویش را باز آفرید

جو قوم اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتی ہے وہ از سر نو زندگی اور توانائی حاصل کر لیتی ہے۔ یعنی عقیدۂ لا الہ، سربلندی کا ضامن ہے۔

پیشِ غیر اللہ لا گفتن، حیات		تازہ از ہنگامۂ او، کائنات

اگر کوئی قوم زندگی کی طالب ہو تو اُسے غیر اللہ کے سامنے لا الہ کا نعرہ بلند کرنا چاہئے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کسی قوم کے زندہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے سامنے 'لا الہ' کہہ سکے۔ اگر نہیں کہہ سکتی تو اُسے سمجھ لینا چاہئے کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ زندگی یا زندہ ہونے کی صورت یہی ہے کہ وہ غیر اللہ کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اس اعلان سے ہنگامہ پیدا ہونا یقینی ہے' لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات از سر نو جوان ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کائنات کی تمام رونق اور تازگی اسی نعرہ کے دم سے وابستہ ہے ؎

جذبۂ او در دل یک زندہ مرد		می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

اگر یہ جذبہ (کہ میں غیر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کروں گا) کسی ایک زندہ مرد کے دل میں پیدا ہو جائے تو وہ ہزاروں انسانوں کو بیدار کر سکتا ہے یعنی حرف لا الہ میں اس قدر طاقت پوشیدہ ہے کہ صرف ایک انسان سارے ملک میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے بشرطیکہ لا الہ

کا سوز دل میں جاگزیں ہو جائے۔

۱۹۱۹ء میں، حلقہ بازان فرنگ نے ترکوں کو غلامی کی موت سے ہم آغوش کر دیا۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے غیر اللہ کے سامنے لا الٰہ کا نعرہ بلند کیا۔ چونکہ وہ لا الٰہ کی قوت سے آشنا تھا اس لئے اس نے چشم زدن میں لاکھوں رہ نشینوں کو رہ نورد بنا دیا اور ۱۹۲۲ء میں اس کی قوم نے از سر نو زندگی حاصل کر لی۔

بیشک ہزاروں بلکہ لاکھوں ترکوں نے جام فنا نوش کیا لیکن ان افراد نے اپنی جان دے کر قوم کو زندہ کر دیا۔ آئین فطرت یہی ہے ؎

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز تخم لا در مشت خاکے او بریز

اگر تم غلاموں کو آقاؤں کے مقابلہ میں صف آرا کرنا چاہتے ہو تو ان کو لا الٰہ کا مفہوم سمجھا دو۔ یقیناً وہ غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔

(ہ) ہندی مسلمانوں کی حالت کیا ہے؟ ؎

از غلامی فطرتِ او، دوں شدہ نغمہ ہا اندر نَے او، خوں شدہ

(ج) یہ حالتِ زار کیوں ہے؟ ؎

از سہ قرن ایں امت خوار و زبوں زندہ بے سوز و سرور اندروں

یعنی اس لئے کہ وہ لا الٰہ کے مفہوم سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

(د) بیگانہ کیوں ہیں؟

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سود خوار و والی و ملا و پیر

یعنی، اس لئے کہ ارباب اقتدار ہر وقت اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کے دل میں، توحید کا حقیقی مفہوم جاگزیں نہ ہو پائے۔ کیونکہ پھر ان ارباب اقتدار کا ٹھکانا یا بحر عرب ہوگا یا خلیج بنگالہ۔

دیکھ، توحید سے مسلمانوں کو بیگانہ رکھنے کے لئے کیا تدبیر کی گئی؟ ملاؤں اور پیروں نے انہیں فقہ اور علم کلام کی بحثوں میں الجھا دیا۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام

ہندوستان کی دیگر اقوام آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں لیکن نو کروڑ رسمی مسلمان، مدح صحابہؓ و تبرّا، آمین بالجہر اور خفی، فاتحہ خلف الامام، تعداد رکعات تراویح، زانو الکعبین، تقبیل الابہامین، احضار صورت محمدیؐ فی القبر، امکان نظیر خاتم النبیینؐ، امکان کذب باری تعالیٰ، بشریت رسولؐ، حلت و حرمت قبہ جات، قیام در محافل میلاد، ندائے یا رسولؐ اللہ، صلوٰۃ قبل المنبر، جواز استمداد من القبور، سماع موتیٰ، جواز دلدل و ذوالجناح، وجوب تقلید شخصی، فوائد چلہ کشی، حصول فیض از ارواح رفتگاں، جواز عرس و رسوم متعلقہ، حلت و حرمت سماع، ضرورت شیخ، تصور شیخ، جواز سجدۂ تعظیمی، جواز چہلم، جواز ختم، جواز شیئاً للہ وغیرہ، صدہا مسائل لاطائل میں منہمک ہیں۔ تکفیر و تفسیق کا بازار گرم ہے، اور آئینہ ضمیر تاریک ہو چکا ہے

باقی نہ رہی تجھ میں وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

"کفار" جہد للبقاء میں مصروف ہیں، ملا اور پیر اسلام کی رسوائی کے درپے ہیں

دین حق از کافری رسواتر است ذانکہ ملا، مومن کافرگر است

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

۔۔ن وقت مسلمانوں کے دماغوں میں مختلف اقسام کے بُت جاگزیں ہیں، قرآن مجید
۔۔ف صرف اس قدر ہے کہ ع

از یقین ابر و آساں بمیرند

۔۔اصل شخصیت پرستی کا بازار گرم ہے ۔عقلِ سلیم معطل ہو چکی ہے غور و فکر کا مادہ فنا ہو چکا
۔۔نی پت اور کرنال دونوں شہروں میں حاملِ توحید شیخ بو علی شاہ قلندر کا مزار بنا ہوا
۔۔کوئی مسلمان اتنا نہیں سوچتا بلکہ سوچ نہیں سکتا کہ ایک شخص دو مزاروں میں کس طرح
۔۔ہو سکتا ہے ۔ سُنا کرتے تھے کہ نصاریٰ نے ابن مریم کو خدا بنا دیا میں نے بچشم خود دیکھا
پنجاب کے مسلمانوں نے ایک انسان کو خدائی صفات سے متصف کر دیا۔ وہ پانی پت
۔۔ہے اور کرنال میں بھی ۔

سمجھ میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہئے (اقبال)

در مقامِ لا نیا ساید حیات سوئے الّا می خرامد کائنات

۔۔فی سے دل کو تسلی نہیں ہو سکتی ۔ طمانیت قلب کے لئے اثبات ضروری ہے۔
غور کیجئے ایک شخص صرف لا الٰہ کہتا ہے اور اسی مقام پر رک جاتا ہے تو اس کے معنی
۔۔ہے کہ اس نے اللہ کی ہستی کا انکار کر دیا۔ بہت خوب۔ لیکن قلب سے قطع نظر کرکے
۔۔بھی تو اس حالت سے مطمئن نہیں ہو سکتی ۔ وہ سوال کرتی ہے کہ ۔

(۱) منکر خود موجود ہے یا نہیں ۔
(۲) کائنات موجود ہے یا نہیں ۔

منکر اپنے وجود کا انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سوال ہوگا کہ یہ انکار کون کر رہا ہے
ثابت ہوا کہ میں موجود ہوں۔

اگر میں موجود ہوں تو زمان و مکان کی قید میں موجود ہوں لہٰذا کائنات کا وجود
ثابت ہوگیا۔

اگر میں موجود ہوں تو اب عقل دوسرا سوال کرتی ہے کہ
تم خالق ہو یا مخلوق ؟
اگر مخلوق ہو تو خالق کون ہے ؟

اگر خالق ہو تو منطقی اعتراضات سے قطع نظر کرکے، تمہارا دعوئے باطل ہوگیا کیونکہ
تم نے لا الہ کا اثبات کر دیا یعنی تم خود اللہ ہو۔

اسی طرح عقل سوال کرتی ہے کہ یہ کائنات، خالق ہے یا مخلوق ؟ اگر مخلوق ہے تو
اُس کا خالق کون ہے ؟

اگر خالق ہے تو الا اللہ کا اثبات ہوگیا یعنی وہ خود اللہ ہے۔
اب تیسرا سوال ہوگا کہ تم کائنات میں داخل ہو یا نہیں ؟
اگر داخل ہو تو تمہارا پہلا دعوئے کہ تم خود خالق ہو باطل ہوگیا۔
اگر داخل نہیں ہو تو تم زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو، اور یہ بات بالبداہت
باطل ہے۔

ابھی بہت سے قضایا مرتب ہوسکتے ہیں لیکن میرے مقصود کے اظہار کے لئے اسی
قدر استدلال کافی ہے

اب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں معلول (EFFECT) نظر آتی ہے۔ دنیا

ہیں کسی فلسفی نے اس کائنات (دنیا) کو ملت یا قدیم تسلیم نہیں کیا۔ جبین دھرم میں جیو آتما اور پدگل (مادہ) کو انادی تسلیم کیا گیا ہے۔ کائنات کو وہ بھی حادث کہتا ہے۔

جب ہم اس کے مختلف شعبوں پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور اس کا چلانے والا کوئی نہ کوئی ضرور ہے ؎

نظامِ عالم بتا رہا ہے کہ ہے اک اس کا بنانے والا
ظہورِ آدم دکھا رہا ہے کہ ہے کوئی دل میں آنے والا

یعنی یہ کائنات مصنوع اور مخلوق ہے اور زبانِ حال سے صانع اور خالق کی طرف ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔

اور یہی مطلب ہے۔ ع "سوئے الا می خرامد کائنات" کا۔

الغرض جو قومیں لا کے بعد الا نہیں کہتیں، وہ بتدریج صفحہ ہستی سے معدوم ہو جاتی ہیں۔ کیوں؟ دوسری توجیہہ سنیئے۔

جو قومیں خدا کی منکر ہو جاتی ہیں وہ اپنی طاقت، انسانوں کو تباہ کرنے میں صرف کرنے لگتی ہیں اور حد سے گزرنے کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔ طاغی افراد اگر برائے چندے بچ جائیں تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ قومیں کبھی نہیں بچ سکتیں ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف (اقبال)

نفی کے بعد اثبات کرنے سے ہی، زندگی کے مختلف شعبوں اعتدال اور توازن پیدا ہو سکتا ہے اور یہ اعتدال بنی آدم کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ کارل مارکس، لینن اور ٹراٹسکی وغیرہ نے ان کو ادھورا سبق

پڑھایا۔ لا الٰہ بجائے خود صحیح تو ہے مگر زندگی کی پہلی منزل ہے۔ لا الٰہ صحیح تو ہے مگر مکمل دستور العمل نہیں ہے۔ غواص کو مقصود سمندر نہیں بلکہ موتی ہے۔ اور موتی حاصل کرنے کے لئے سمندر میں غوطہ لگانا بھی ضروری ہے لیکن جو غواص غوطہ ہی کو مقصود سمجھ لے وہ کبھی گوہر مراد حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے حق میں سمندر، ورطہ بن جائے گا جس میں وہ ساری عمر سرگرداں رہے گا۔

اسی طرح معبودانِ باطلہ یا غیر اللہ کی حکومت کی نفی کرنا یعنی لا الٰہ کہنا دلِ آگاہ کی پہلی اور ضروری منزل ہے لیکن مقصود حیات "الا اللہ" ہے اور الا اللہ تک پہنچنے کے لئے لا الٰہ کی منزل میں سے گزرنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف لا الٰہ پر رک جائے وہ منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتا ؎

نفیٔ ہستی اِک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

معبودانِ باطلہ کا طلسم پاش پاش کرنا لازمی ہے لیکن یہ پہلی منزل ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل کی طرف بڑھنا چاہئے۔ اگر پہلی منزل کو مقصود حیات سمجھ لیا، تو گویا ورطہ میں پھنس گئے اور مقصود حیات حاصل نہیں ہو سکے گا۔ مردِ مومن وہ ہے جو لا کی منزل سے الا اللہ کی منزل تک پہنچے ؎

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام ہر کہ در ورطۂ لا ماند بہ الا نرسید

اقبال کو تہذیب حاضر سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اس کی مجلس میں صرف شرابِ لا کا دور چل رہا ہے معبودان باطلہ کا انکار تو ہے لیکن معبود حقیقی کا اقرار نہیں اِلا اللہ کی بوتل کا کہیں پتہ نہیں ؎

لبا لب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ الّا

شراب لا سے ہستی کی نفی ہوتی ہے یعنی غیر اللہ کی ہستی کی نفی ہوتی ہے لیکن ا
کے بعد الا اللہ کا جام پینا چاہیے تاکہ معبود حقیقی یعنی اللہ کی ہستی کا اثبات بھی ہو
لا نقشِ باطل کو مٹاتا ہے لیکن اس کے بعد نقشِ حق بھی تو ثبت کرنا چاہیے ورنہ مق
حیات فوت ہو جائے گا۔

اسی لیے علامہؒ فرماتے ہیں ؎

در مقام لا نیا ساید حیات   سوئے الا می خرامد کائنات

میری رائے میں یہ شعر اقبال کی عمر گرانمایہ کا حاصل ہے۔ اس سے بڑی کوئی صدا
(TRUTH) شاید اس کتاب میں کہیں نظر نہیں آسکتی۔ اگر وہ ساری عمر میں صر
ایک شعر کہہ دیتے تو بھی ان کا نام زندۂ جاوید ہو سکتا تھا۔ جس بات کو حکمائے د
ضخیم کتابوں میں بیان کیا ہے۔ اقبالؒ نے دو مصرعوں میں پیش کر دی ہے۔ یہ شع
قابل ہے کہ اسے موتیوں میں تولا جائے، بلکہ لوحِ دل پر ثبت کر لیا جائے۔ انسانی ع
اس سے فزوں تر یا بالاتر کسی صداقت کا اعلان نہیں کر سکتی۔ یہ صداقت ا نس
عرفان کی آخری منزل ہے جس کے اوپر کوئی منزل نہیں۔

حیاتِ انسانی کی تخلیق اس نہج پر ہوتی ہے کہ وہ مقامِ لا میں تسلی حاصل ہی نہ
سکتی۔ بعض مجبوریوں یا موانع کی بنا پر وہ کچھ عرصہ کے لیے اس منزل میں رہ سکتی
اور رہی ہے لیکن جب حالات سازگار ہوتے ہیں تو وہ اس منزل سے نکل کر الا
میں سکون پذیر ہوتی ہے۔ اس دعویٰ کا ثبوت آپ کو مشرقی اور مغربی فلسفہ کی تار

مطالعہ کرنے سے مل سکتا ہے۔

مقام لا کی توضیح کے بعد، اب علامہ فرماتے ہیں ؎

لا و الا سازو برگ امتاں نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں

قوموں کی حیات صرف لا پر موقوف نہیں، بلکہ لا و الا دونوں پر ہے۔ اور جو قومیں صرف نفیٔ بے اثبات پر اکتفا کرتی ہیں۔ وہ لا کے بعد الا نہیں کہتیں، وہ صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ؎

ہر کہ را ایں سوز باشد در جگر ہولش از ہولِ قیامت بیشتر

لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے ایں شورِ رعد است نے آواز نے

ضرب او، ہر بود را سازد نبود

تا بروں آئی ز گردابِ وجود

یعنی جس شخص کے سینہ میں لا الٰہ کا سوز جلوہ گر ہو، اس کا خوف لوگوں کے دلوں میں، قیامت کے خوف سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جس شخص کے سینہ میں لا الٰہ کا راز موجود ہوتا ہے وہ باطل کے سر پر پیہم ضربیں لگاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نابود ہو جاتا ہے پھر غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو جاتا ہے۔

اب علامہ خود اپنے دعوے کو عربوں کی مثال سے واضح کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ذیل اشعار ؎

با تو می گویم ز ایامِ عرب تا بدانی پختہ و خامِ عرب

ریزہ ریزہ از ضربِ او، لات و منات در جہات، آزاد از بندِ جہات

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد

عالمے در آتشِ او، مثلِ خس

ایں ہمہ ہنگامۂ لا بود و بس

جس وقت عربوں کے دل میں لا الٰہ کا سوز پیدا ہوگیا، تو انہوں نے لات ومنات اور تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کردیا بظاہر وہ زمان ومکان کی قید میں تھے لیکن دراصل زمان ومکان دونوں پر حکمران تھے۔ انہوں نے قیصر اور کسریٰ نے دونوں کا خاتمہ کردیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ "لَا مُلُوکِیَّتَ فِی الْاِسْلَام" بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے۔ اور خشکی میں جہاز چلا دیئے انہوں نے تمام دنیا کو زیر و زبر کردیا۔ وادیٔ گنگ سے لے کر وادیٔ الکبیر تک ایک ہنگامہ بپا کردیا۔ صرف لا الٰہ کے بل بوتے پر۔ پھر کیا ہوا ؎

اندریں دیرِ کہن پیہم تپید تا جہانے تازہ آمد پدید

بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست ہر چہ ہست از گرمِ ریزیہائے اوست

اینکہ شمع لا الٰہ روشن کردہ اند از کنارِ جوئے او، آوردہ اند

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست

از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست

سوزِ لا الٰہ کی بدولت عربوں نے ایک نیا جہان پیدا کیا، اور اپنی صبح خیزی کی بدولت دنیا میں صداقت کا بول بالا کیا۔ انہیں جو کچھ سربلندی اور شان وشوکت حاصل ہوئی۔ وہ سب صرف لا الٰہ کا کرشمہ تھا۔ جب انہوں نے، اپنے دل کو نقشِ غیر اللہ سے پاک کرلیا تو تاریخِ عالم شاہد ہے کہ اس عالم میں ایک ہنگامہ بپا کردیا۔

یہ تو عہدِ ماضی کی مثال تھی۔ اب عصرِ حاضر کی مثال ملاحظہ کیجئے ؎

ہمچناں بینی کہ در دور فرنگ بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردید خوں از ضمیرش حرف لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ برہم زدہ ست تیز نیشے بر رگِ عالم زدہ ست
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطین لا کلیسا، لا الٰہ

صدیوں سے روس کے باشندے مطلق العنان ملوکیت کی لعنت میں گرفتار تھے۔ آخر کار اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور ۱۹۱۷ء میں، بندگی اور خواجگی میں ایک فیصلہ کن جنگ واقع ہوئی۔ روس کے باشندے غلام تھے لیکن جب انہوں نے لا الٰہ کا نعرہ بلند کیا، تو زارِ روس کا تخت و تاج چشم زدن میں، فنا ہو گیا اور اُن کو زار، زارینہ اور راسپوٹین اور دوسرے ظالموں سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ فی الحال ان کا مسلک یہ ہے کہ لا سلاطین، لا کلیسا اور لا الٰہ۔ یعنی ملوکیت۔ مذہب اور خدا تینوں سے بیزار ہیں مگر وہ خدا کے منکر کیوں ہیں؟ اس لئے کہ

فکر او در تُند بادِ لا بماند مرکب خود را سوئے الّا نراند

اس قوم نے لا الٰہ ہی کی منزل کو، آخری منزل سمجھ لیا۔ حالانکہ ؏

ایں نخستیں منزل مرد خدا ست

لا الٰہ سے طاقت ضرور آتی ہے لیکن اگر الّا نہ ہو تو پھر یہ طاقت بنی آدم کے حق میں عذاب بن جاتی ہے۔ اور یہی فرق ہے حضرت عمرؓ اور ہٹلر کی حکومت میں۔ دونوں طاقت کے مظہر ہیں لیکن حضرت عمرؓ کی زندگی لا اور الّا دونوں کی جامع تھی۔ اس لئے بنی آدم کے حق میں ابر رحمت ثابت ہوئی۔ ہٹلر کی زندگی میں صرف لا الٰہ کا جلوہ ہے اس لئے اس کا وجود انسانیت

کے حق میں لعنت بنا ہوا ہے۔ اور اسی پر آپ ان تمام اقوام کو قیاس کر سکتے ہیں جو سیاستِ لادین کے علمبردار ہیں خواہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں ؎

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں
کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر (اقبالؒ)

اس کا جواب حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے مل سکتا ہے ؎

در محبت پختہ کے گردد خلیل — تا نگردد لا سوئے الّا دلیل

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ایک تمثیل بیان کی گئی ہے کہ پہلے انھوں نے ستارہ کو دیکھا پھر سورج کو لیکن جب وہ دونوں غروب ہو گئے تو انھوں نے کہا "اِنِّی لَا اُحِبُّ الْآفِلِیْنَ" یعنی پہلے لا کی منزل سے گزرے پھر انھوں نے الا کا پتہ لگایا یعنی لا اُن کے لئے الا کی دلیل بن گیا۔ انھوں نے تمام معبودانِ باطلہ کا انکار کیا لیکن اس انکار کے بعد انھوں نے سچے خدا کا اقرار بھی کیا۔

اور پھر نمرود کے سامنے جا کر اس کی خدائی کا ابطال کیا۔ اس کے منہ پر صاف کہہ دیا کہ تو خدا نہیں ہے اور آج دُنیا میں اُن کی جس قدر عظمت ہے وہ اسی لئے کہ وہ دُنیا میں توحید کے پہلے عظیم الشان علمبردار ہیں اور انھوں نے جابر بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیم دونوں کو آشکار کیا۔ اسی لئے علامہؒ آج کل کے وارثانِ مسندِ نبویؐ سے خطاب کرتے ہیں ؎

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن

اے وہ لوگو کہ تم حجروں میں بیٹھے ایک غیر مسلم کی اتباع کا جواز ڈھونڈ رہے ہو باہر نکلو اور اس زمانہ کے نمرود کے سامنے نعرۂ لا الٰہ بلند کرو ؎

اینکہ می بینی نیرزد باد و جو از جلال لا الہ آگاہ شو

جو کچھ ظاہری طمطراق نظر آتا ہے مومن کی نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ پس مسلمانوں کو لا الہ کے جلال سے آگاہ ہونا چاہئے تاکہ وہ دنیا میں انقلاب پیدا کر سکیں۔

ہر کہ اندر دست او شمشیر لا ست جملہ موجودات را فرمانرواست

مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ ہونا لازمی ہے کہ جس شخص کے دل میں لا الہ ایک دفعہ پوری طاقت کے ساتھ جاگزیں ہو جاتا ہے وہ کائنات میں حکمران بن جاتا ہے پس مسلمان نوجوانوں کو اقبال کا غیر فانی پیغام یہی ہے کہ ؎

این کہ می بینی نیرزد باد و جو از جلال لا الہ آگاہ شو

فلسفۂ فقر

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل؟ یک نگاہِ راہ بیں، یک زندہ دل

علامہؒ کے کلام میں، فقر کی اصطلاح بہت مستعمل ہے اور چونکہ مسلمان اس کے معانی سے بیگانہ ہو چکے ہیں اس لئے انہوں نے اس زرین اصول کی، جسے (روحِ قرآن) کہنا زیادہ مناسب ہوگا خود تشریح فرما دی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جاوید نامہ ضربِ کلیم اور بالِ جبریل میں بھی خاص فقر کے مضامین پائے جاتے ہیں، لیکن اس مثنوی میں علامہؒ نے خاص اسی اصطلاح کی تشریح کے لئے ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے تاکہ مسلمان حقیقتِ حال سے بآسانی واقف ہو جائیں۔

فرماتے ہیں "اے لوگو! جانتے ہو، فقر کیا ہے؟ (فقر گداگری نہیں ہے) فقر کہتے ہیں نگاہِ راہ بیں، اور دلِ زندہ کو یعنی فقیر وہ ہے جس کی نگاہ اور دل دونوں مسلمان ہوں۔ نگاہِ راہ بیں سے مادی آنکھ مراد نہیں ہے بلکہ دماغ یا فکر، یا ذہنیت۔

فقیر وہ ہے جس کو یہ قوت حاصل ہو کہ وہ ہدایت اور ضلالت میں امتیاز کر سکے اور وہ بادۂ عشقِ محمدؐ سے سرشار ہو

علامہؒ کی رائے میں، دل اور نگاہ، مسلمان کی بنائے زندگی ہیں اگر یہ مسلمان نہ ہوں تو ایک شخص (مسلمان) اثبات واجب الوجود پر ایک ضخیم کتاب لکھ دے یا ہستیٔ باری پر منطقی دلائل قائم کر دے یا کسی دلیلِ عقلی کی بنا پر مسلمان ہو جائے تو بھی کچھ فائدہ نہیں ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ، تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص نے مسجد میں جا کر کلمہ پڑھ لیا تو مسلمان ہو گیا، بے شک ہو گیا لیکن یہ مقام راہ ہے منزل نہیں ہے۔ ابھی اس کو ایک مرحلہ اور بھی طے کرنا ہے وہ کیا؟ دل و نگاہ کو مسلمان بنانا اور جب کسی مسلمان کا دل، اور اس کی نگاہ بھی مسلمان ہو جاتی ہے تو وہ مقامِ فقر پر فائز ہو جاتا ہے۔

نگاہ، راہ بین کیونکر ہو سکتی ہے؟ مطالعۂ قرآن سے
دل، زندہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ عشقِ رسولؐ سے

مطالعۂ قرآن کا تعلق فکرِ انسانی سے ہے اور عشقِ رسولؐ کا تعلق ذکرِ انسانی سے ہے۔ اور فقر، ذکر و فکر کے امتزاج ہی کا دوسرا نام ہے۔

دل تو ہر مسلمان کے سینہ میں موجود ہوتا ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ زندہ ہے یا مُردہ؟ اگر وہ مُردہ ہے تو دل ہی نہیں ہے محض پارۂ گوشت ہے جس کی قیمت چھ پیسے سے زیادہ نہیں مل سکتی۔

دلِ مُردہ، دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اور اگر وہ زندہ ہے تو پھر واقعی دل ہے اور اس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، یہ کُل کائنات بھی اُس کا بدل نہیں ہو سکتی۔

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری
مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس صوبہ کے ایک کروڑ مسلمانوں کی موجودگی میں، دس لاکھ نفوس، نواب شرف النساء بیگم کے مزار سے "قرآن اور تلوار" کیونکر لے جا سکے؟

محض اس لئے کہ دس زندہ انسان ایک ہزار مردہ انسانوں پر غالب آ سکتے ہیں مسلمانوں کا دل مُردہ ہو چکا تھا اور ابھی تک زندہ نہیں ہو سکا ہے یقین نہ ہو تو مسجد شہید گنج سے پوچھ لو اور وہاں تک جانے کی بھی ضرورت نہیں، خود اپنے دل سے پوچھ لو۔

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟

فقر، کارِ خویش را سنجیدن است
ہر دو حرفِ لا الہ، پیچیدن است

فقر کیا ہے؟ محاسبۂ نفس کرنا اور اپنے آپ کو توحید کی ترازو میں تولنا یا اس اصول کی اتباع کرنا، یعنی فقیر وہ ہے جو موحد ہو۔ خدا کے علاوہ اور کسی سے نہ ڈرتا ہو۔

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراک او، سلطان و میر

فقر کیا ہے؟ جَو کی روٹی کھا کر، خیبر کا دروازہ اکھاڑ پھینکنے کی طاقت حاصل کرنی۔ اور اسی طاقت کی بدولت بڑے بڑے بادشاہ اور سردار، مردِ فقیر کے آگے دست بستہ حاضر رہتے ہیں۔

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست ما امینیم ایں متاع مصطفےٰ است

فقر کیا ہے؟ عشق و مستی اور تسلیم و رضا کا مجموعہ ہے یعنی فقیر وہ ہے جو خدا کا عاشق ہے اور ہر حال میں اس کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو جو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہو جو رضا جوئی کو اپنی زندگی کا مقصود سمجھتا ہو جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو کونین کی بادشاہی سے بہتر سمجھتا ہو۔

فقر کیا ہے؟ متاع مصطفویؐ ہے۔ یہ وہ امانت ہے جو آنحضرتؐ نے ہمارے سپرد فرمائی ہے یعنی فقر وہ جوہر ہے جس پر خود آنحضرت صلعم کو ناز تھا چنانچہ آپ فرماتے ہیں "الفقر فخری" یعنی میں اپنی فقیری پر فخر کرتا ہوں۔

متاع مصطفےٰ کہنے سے علامہؒ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل میں، فقر کی عظمت کا نقش جاگزیں ہو سکے یعنی جس چیز پر سرورِ کونینؐ فخر کریں وہ بلا شبہ نہایت قیمتی بلکہ بے بہا ہوگی۔

فقر بر کروبیاں شبخوں زند بر نوامیس جہاں شبخوں زند

فقر کیا ہے؟ وہ صفت ہے جس کی بدولت، انسان فرشتوں کو مسخر کر سکتا ہے بلکہ کائنات کی تمام طاقتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ دولت لازوال، کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ ایک قدرتی سوال ہے جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوگا۔

برگ و ساز او ز قرآنِ عظیم مرد درویشے نگنجد در گلیم

فقر کی دولت قرآنِ مجید سے حاصل ہوتی ہے یعنی فقیر وہ ہے جو متمسک بالقرآن ہو۔ دنیاوی بادشاہ لشکر و سپاہ اور زر و جواہر پر ناز کرتے ہیں لیکن فقیر کا سرمایہ صرف قرآنِ عظیم ہوتا ہے۔ بظاہر مرد درویش (فقیر) ایک کمبل اوڑھے ہوتا ہے لیکن دراصل وہ ساری کائنات کو اپنے اندر لئے ہوتا ہے۔ اب مرد فقیر کی شان ملاحظہ ہو۔

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن — یک دم او، گرمیٔ صد انجمن

بے پراں رازوق پروازے دہد — پشہ را تمکین شہبازے دہد

با سلاطین درفتد مرد فقیر — از شکوہ بوریا لرزد سریر

قلب او را قوت از جذب و سلوک

پیشِ سلطاں نعرۂ او، لاملوک

مرد فقیر زیادہ گفتگو نہیں کرتا۔ اور نہ چار چار پانچ پانچ گھنٹے مسلسل تقریریں کرتا ہے اس ے باوجود اس کے ایک سانس سے صدہا انجمنوں میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان سے لا ہوا ایک لفظ صدہا انسانوں کو عمل کا خوگر بنا دیتا ہے۔

دوسرا کمال مردِ فقیر میں یہ ہوتا ہے کہ وہ سلاطین وقت سے مطلق مرعوب نہیں ہوتا بلکہ علانیہ کا مقابلہ کرتا ہے۔ انہیں چیلنج دیتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ فقیر کے بوریے کی ہیبت سے طان کا تخت ہمیشہ لرزہ براندام رہا ہے۔

امام حسینؓ، امام ابن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ ب فقیر تھے اور تاریخ شاہد ہے کہ ان سب نے اپنے اپنے زمانہ کے سلاطین کا مقابلہ کیا اور اُن پر ب آئے۔ اور تو اور علامہ سید جمال الدین افغانی میں چونکہ ایک حد تک شانِ فقر پائی جاتی ۔ اس لئے سلاطین عالم اُن تک سے، لرزہ براندام رہتے تھے حالانکہ اُن کے پاس نہ ہتی نہ پریس، نہ فوج نہ سپاہ، نہ تخت نہ تاج، نہ ریاست نہ مملکت بس ایک چیز ضرور اُن ں تھی یعنی دلِ بیدار + نگاہِ راہ بین = فقر

فقیر کے دل میں، جو سلاطین وقت کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے یہ فوج و سپاہ یا ولت کی وجہ سے نہیں بلکہ جذب و سلوک یا عشقِ رسولؐ اور اتباعِ رسولؐ کی بدولت پیدا ہوتی

ہے اور مرد فقیر اسی طاقت کے بل پر سلاطین کے منہ پر کہہ دیتا ہے۔ کہ میں تمہیں اپنا حاکم تسلیم
نہیں کرتا۔

جب امام ربانی مجدد الف ثانیؒ جہانگیر مے خوار کے دربار میں تشریف فرما ہوئے تو آپ نے
آواز بلند فرمایا:

"السلام علیکم!" کاسہ لیسانِ ازلی نے احتجاجاً کہا کہ "حضور خداوند عالم کو سجدہ کرو"
آپ نے نہایت سختی کے لہجہ میں فرمایا: "سجدہ خدا کے علاوہ اور کسی کو سزاوار نہیں ہے اور میں خدا کے
علاوہ اور کسی کو خداوند عالم یا اپنا خدا تسلیم نہیں کرتا!"

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

اس اعلان حق کے دو سال بعد، اسی ہندوستان جنت نشان نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ
جہانگیر بایں ہمہ کر و فر حضرت اقدسؒ کے قدموں میں گر کر، معافی کا طلبگار ہوا۔ لیکن اس وقت
امر زیر بحث یہ ہے کہ ایک گدائے گوشہ نشین کے اندر یہ جرأت کہاں سے پیدا ہو گئی جو آج کل نہ
کسی "آنریبل خان بہادر" میں نظر آتی ہے نہ "کے بی ای" میں۔ یہ قوت، جذب و سلوک یعنی عشق رسولؐ
کی بدولت پیدا ہوتی ہے "پیری" یا "سرداری" سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو برگ حشیش ہے جس
کو آج کل کے کوتاہ بین، شاخ نبات سمجھتے ہیں۔

سوالِ مے نہ کروں ساقیٔ فرنگ سے میں
کہ یہ طریقۂ رندانِ پاک باز نہیں

پہلا مرد فقیر جس نے پیش سلطان، نعرۂ 'لاملوک' بلند کیا حسینؓ ابن علیؓ ہے یعنی انہوں نے
اس حقیقت کا اعلان کیا کہ لَا مُلُوکِیَّتَ فِی الْاِسْلَامِ "THERE IS NO KINGSHIP IN ISLAM"

سلاطین تو در کنار، اسلام تو سلطنت ہی سے متمکن ہے۔

سروری زیبا صرف اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

بر نیفتد ملتے اندر نبرد — تا درو باقیست یک درویش مرد
آبروئے ما ز استغنائے اوست — سوز ما از شوق بے پروائے اوست
خویشتن را اندریں آئینہ بیں — تا ترا بخشند سلطانِ مبیں

حکمت دیں، دل نوازی ہائے فقر
قوت دیں بے نیازی ہائے فقر

علامہؒ فرماتے ہیں کہ جب تک قوم میں ایک مردِ درویش بھی باقی رہے وہ قوم ذلیل نہیں ہو سکتی۔ اس کے دم سے ساری قوم دُنیا کی نگاہوں میں معزز رہتی ہے اور وہ اپنی سیرت کی روحانی طاقت سے افراد کے دلوں کو گرماتا رہتا ہے پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کسی مردِ فقیر کا دامن تھام لیں اور اس کی صحبت سے اپنے دل کو زندہ کریں تاکہ انہیں طاقت اور سروری حاصل ہو سکے۔

حکمتِ دیں اور قوتِ دیں، دونوں فقر کی بدولت حاصل ہو سکتی ہیں۔ جب مردِ فقیر اپنی شانِ دل نوازی دکھاتا ہے تو، حقائق و معارفِ قرآنی کا دریا بہا دیتا ہے اور افرادِ قوم اس دریا سے سیراب ہو جاتے ہیں۔ اور جب مردِ فقیر اپنی ادائے بے نیازی کا اظہار کرتا ہے تو بڑے بڑے سرکشوں کا سر نیچا کر دیتا ہے جس کی بنا پر دین کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

الغرض، دین کو ساری عزت اور طاقت، شہرت و ناموری فقر کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔

مومناں را گفت آں سلطان دیں مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں

الاماں از گردشِ نُہ آسماں مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش

تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ آنحضرت صلعم کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے یعنی آپ نے ارشاد فرمایا کہ "تمام روئے زمین میری مسجد ہے۔"

اس حدیث سے دو مطلب نکلتے ہیں ایک تو ظاہری مطلب کہ دین اسلام رسوم وقیود ظاہری کا پابند نہیں ہے۔ نماز ادا کرنے کے لئے کسی خاص مقام کی قید نہیں ہے، مسلمان ہر جگہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر سکتا ہے۔ ہر جگہ، اپنے معبود کے سامنے سر جھکا سکتا ہے۔ دوسرا باطنی مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ خلافتِ ارضی کے حصول کے لئے کوشاں ہو تاکہ تمام روئے زمین، حقیقی معنی میں مسجد بن جائے۔ ہر جگہ اللہ کا بول بالا ہو سکے، اور دنیا کے سامنے "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کا نقشہ کھینچ سکے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث

مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے (اقبال)

لیکن افسوس، صفتِ فقر سے محروم ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان، جسے اس کے آقا نے تمام روئے زمین کو، مسجد کی شکل میں تبدیل کرنے کا حکم دیا تھا آج اس قدر بے کس اور محکوم ہو چکا ہے کہ جن مقامات کو اس کے اسلاف نے مسجد بنایا تھا، جہاں انہوں نے برسوں نہیں بلکہ صدیوں نماز پڑھی تھی۔ وہ ان کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔

"مسجد مومن بدست دیگراں" ایسا مصرعہ ہے کہ اگر قوم زندہ ہوتی تو اسے پڑھ کر تڑپنے لگتی

نہیں میں نے غلط کہا۔ قوم زندہ ہوتی تو اقبالؒ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

خالصہ شمشیر و قرآں را بہ بُرد اندراں کشور مسلمانی بمُرد

یہ شعر اقبالؒ نے ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں شمشیر و قرآن یعنی فقر سے محرومی کا یہ نکلا کہ فی الحقیقت مسجد مومن بدست دیگراں رفت اور آج اُس مسجد کے دروازہ پر جس کے میناروں سے ڈیڑھ سو برس تک اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی رہی یہ کتبہ جلی حروف میں آویزاں ہے:

"اس میں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے"

قومی تذلیل کی اس سے بڑھ کر عبرت ناک تصویر شاید اور کہیں نظر نہ آسکے لیکن یہ فاطر ہستی کے ازلی دستور کے مطابق ہے۔ "گردشِ آسمان" کا ذکر حقیقت پر مبنی نہیں ہے محض شاعرانہ انداز بیان ہے۔

خوار از مہجوری قرآں شدی شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

لیکن مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے مسلمان اپنے اندر شان فقر پیدا کریں مسجد واپس مل جائے گی۔

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی، مگو ترکِ ایں دیر کہن تسخیر او

راکبش بودن از و وارستن است از مقام آب و گل برجستن است

صید مومن ایں جہان آب و گل

باز را گوئی کہ صید خود بہل؟

مسلمانوں میں تصوف کا غلط مفہوم رائج ہو جانے سے خصوصاً غیر اسلامی اقوام کے فلسفہ اور خیالات مثلاً ویدانت۔ سنیاس۔ رہبانیت اور وحدۃ الوجود سے متاثر ہو جانے کی بنا پر گزشتہ تین چار صدیوں سے ترکِ دُنیا (RENUNCIATION) اور تیاگ کا گمراہ کن عقیدہ راہ

پا گیا ہے، اور وہ عام طور سے ان غیر اسلامی اصولوں کو جو سراسر قرآنی تعلیمات کی ضد ہیں مستحسن خیال کرنے لگے ہیں۔ ان اصولوں کو اختیار کرنے سے تن آسانی پیدا ہوئی۔ اور تن آسانی، انسان کو مشکلات زندگی کا مقابلہ کرنے کے بجائے، ان سے گریز کرنا سکھاتی ہے۔ چنانچہ ہندی مسلمانوں کی اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول کی تاریخ حقایق حیات اور مشکلات زندگی دونوں سے یکسر گریز کی ایک مسلسل اور عبرت ناک داستان ہے۔ اگر ہندی مسلمان، تن آسانی کے دلدادہ نہ ہوتے تو نہ لارڈ ولزلی اپنا محبوب "امدادی نظام" (SUBSIDIARY SYSTEM) ہندوستان میں رائج کر سکتا تھا۔ اور نہ نظام علی خان نظام حیدر آباد، اس طوق سعادت کو زیب گلو کرنا پسند کرتا اور نہ سلطان شہیدؒ کی امداد سے پہلو تہی کرتا۔

زندگی کی کشمکش سے گریز بظاہر بہت دلپذیر اور خوش آیند معلوم ہوتی ہے لیکن در اصل ابدی موت کا پیغام ہے جس طرح بخار کے مریض کو برف کا پانی بظاہر بہت خوشگوار معلوم ہوتا ہے لیکن در اصل سرسام کا باعث ہو کر اسے موت کی آغوش میں سلا دیتا ہے۔

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

تن آسانی اختیار کر کے انسان بظاہر زندہ بھی رہتا ہے اور بظاہر اس کا تخت و تاج بھی برقرار رہتا ہے اور اس کے ہمجنس اسے "یور ہائینس" اور "یور میجسٹی" سے خطاب بھی کرتے ہیں لیکن

ہر زماں میر و غلام از بیم مرگ
زندگی او را حرام از بیم مرگ (جاوید نامہ)
کور ذوقی نیش را دانستہ نوش
مردۂ بے مرگ و نعش خود بدوش (جاوید نامہ)

یہ زندگی یہ ساز و سامان اور یہ خطابات سب مہمل اور بے معنی اشیاء ہیں کسی زندہ فرد یا قوم کی نگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے یقین نہ آئے تو سلطان ٹیپو شہید کی تربت سے دریافت کریجئے جس کے سنگین اور فولادی لبوں سے آج بھی یہ صدا آرہی ہے۔

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟
یک دم شیری بہ از صد سال میش
(جاوید نامہ)

پس مسلمانوں کو ترکِ دنیا کا عقیدہ ترک کر دینا چاہیے۔ ترکِ دنیا کا غیر اسلامی یا جاہلی مفہوم یہ ہے کہ جدوجہد اور کشمکش سعیٔ پیہم اور کوشش یعنی عمل سے کنارہ کش ہوکر کسی خانقاہ میں گوشہ گیر ہو جانا چاہیئے۔
لیکن قرآن اس نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ممکن نہیں تعمیر خودی خانقاہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

ترکِ دنیا کا اسلامی مفہوم یہ ہے کہ دنیا کو مسخر کیا جائے غائتِ تخلیق آدم ہی تسخیرِ عالم ہے تاکہ کائنات پر حکمران ہو سکے قرآن تو اسے "خلیفۃ اللہ علی الارض" کہتا ہے پس اگر وہ "ترکِ عالم" اختیار کرلے تو تسخیرِ عالم کون کریگا؟

اسی لئے علامہؒ فرماتے ہیں کہ ع ترک ایں دیر کہن تسخیر او

اگر "دنیا کے پھندے" سے نکلنا مقصود ہے تو اس کو ترک مت کرو بلکہ اسے اپنا خادم یا محکوم بنالو۔ ترکِ عالم راہ فرار اختیار کرنے کا نام نہیں یہ تو بزدلی اور دوں ہمتی ہے یہ تو کوتاہ بینوں اور کمزور انسانوں کا کام ہے اور ناقص العقل انسانوں کا وظیفہ ہے۔

اگر حقیقی معنی میں اس دنیا پر لات مارنا چاہتے ہو تو خواہشاتِ نفس (مقامِ آب و گل) کو اپنے اختیار میں لے آؤ (CONTROL) اس پر غالب آجاؤ یعنی مادیات سے بالاتر ہو جاؤ اپنا زاویۂ نگاہ روحانی

بنالو۔ پھر یہ ہوگا ہفت اقلیم زیر نگیں ہوگی لیکن صرف ایک بوریے اور ایک جَو کی روٹی پر قناعت کرسکوگے۔

مطلب اس میں نہیں کہ انسان نعمائے عالم سے یکسر محروم ہوجائے اور گدایانہ زندگی بسر کرے جملہ نعماء کو اپنی قوت بازو سے اور سعی مردانہ سے حاصل کرے، پھر اُن کو حقیر اور ادنٰے سمجھ کر ٹھکرا دے اور ہمیشہ قائم رہنے والی نعمت یعنی عشق الٰہی کو دل میں جگہ دے۔

مثال کے طور پر حضرت عالمگیرؒ کی پاکیزہ زندگی پر غور کیجئے۔ قندہار سے لیکر آسام تک اور کشمیر سے لیکر میسور تک اُنکے نام کا سکہ رواں تھا خزانہ میں کروڑوں روپیہ جمع تھا لیکن اس مردِ مومن نے ہمیشہ ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید لکھ کر شکم پُری اور تن پوشی کا سامان مہیا کیا یہ ہے اسلامی انداز ترک دُنیا کا۔

مذہبی تعصبات اور قومی میلانات سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو ترکِ دُنیا کا اسلامی اصول غیر اسلامی اصول سے بدرجہا بالا تر ہے۔ ایک پیدائشی نامرد اگر کسی شخص سے یہ کہے کہ میں نے ساری عمر زنا نہیں کیا تو کوئی شخص اس کو لائق تحسین سمجھ سکتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس میں تو اس فعل کی قابلیت ہی نہیں! ندریں حالات اگر اجتناب کیا تو کمال کیا ہے؟ لائق تحسین تو وہ شخص ہے جو باوجود قدرت اپنے نفس پر اسقدر قابو رکھتا ہو کہ اللہ کی خوشنودی کیلئے اس فعل قبیح سے احتراز کرے۔

اسی طرح ایک گدائے گوشہ نشین یہ دعویٰ کرے کہ میں نے کبھی تکبّر یا اسراف نہں کیا کسی پر ظلم و ستم نہیں کیا سادہ لباس اور سادہ غذا پہ اکتفا کیا ہر شخص سے نرمی اور محبت کا برتاؤ کیا تو یہ کوئی لائق تحسین بات نہیں، سب جانتے ہیں کہ اس میں تکبّر اور اسراف کی قدرت ہی نہیں، کسی کو ستانے کی طاقت ہی نہیں زربفت اور کمخواب زیب تن کرنے اور مفرح یاقوتی یا نوشدارو کھانے کی صلاحیت ہی نہیں

سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب لکھا ہے ؎

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

ترک دنیا حقیقی معنی میں حضرت عمر فاروقؓ ۔ عمر بن عبد العزیزؒ، سلطان ناصر الدین محمودؒ اور حضرت عالمگیرؒ نے کر کے دکھائی کہ تخت شاہی کے باوجود بوریہ نشینی اختیار کی ۔

الغرض اس وقت مسلمانوں کو ترک عالم کے اسلامی مفہوم سے آگاہ ہونے کی ضرورت ہے جو یہ ہے کہ اس کائنات کو مسخر کر کے اسکی ساری نعمتوں پر اقتدار حاصل کر کے پھر انکو اللہ کی رضا جوئی کیلئے ترک کیا جائے مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ کائنات بنائی ہی اس لئے گئی ہے کہ وہ اسے مسخر کریں چنانچہ یۂ قرآنی وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اس پر شاہد ہے یعنی یہ جہاں آب و گل مومن کا شکار ہے اور جو شخص واہ شنکراچاریہ ہو یا ابن عربیؒ مسلمانوں کو ویراگ تیاگ یا رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے ۔ وہ انکو گویا ایسی بات کی قین کرتا ہے جو انکی فطرت کے خلاف ہے اور اس لئے لازمی طور سے مضر اور غیر اسلامی ہے پس اس کی ال ایسی ہے جیسے کوئی شخص باز یا شاہین کو یہ "اپدیش" دے کہ اپنی چونچ اور ناخن کٹوا ڈالو ۔ اور "ساگ پات" ارہ کرو ظاہر ہے کہ یہ مشورہ فاختہ اور قمری کیلئے تو قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن شاہین اور باز کیلئے تو سراسر ام موت ہے ۔

حل نشد ایں معنیٔ مشکل مرا — شاہیں از افلاک بگریزد چرا ؟
وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد — مرغکے از چنگ او ناید بدرد
در کنارے ماند زار و سرنگوں — پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں

اب علامہ مسلمانان ہند کی موجودہ طرز زندگی پر اظہار حیرانی فرماتے ہیں کہ باوجود تفکر و تامل بسیار میں آج تک ہ نہ سمجھ سکا کہ مسلمان جو اپنے نام، نہاد طبع، طریق حیات اور روایات ملی غرضیکہ ہر پہلو سے "شاہین" ہے وہ نی سے کیوں کنارہ کش ہو گیا ؟ آہنسا، رہبانیت، ترک عالم، تیاگ، ویراگ، مادہ اور عورت کو ناپاک سمجھنا قابلہ نہ کرنا بلکہ بدروں کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا قرآن ان ساری باتوں کی مذمت کرتا ہے ۔ پھر یہ گوسفندی یہ ویدانتی طریقہ یہ گدایانہ روش، یہ غیر اسلامی ذہنیت انہیں کہاں سے پیدا ہو گئی ؟ شاہین تو پیدا ہی

اسلئے نہاں ہے کہ وہ ساری عمر فضائے کائنات میں طیران کرتا رہے اور مرغ و ماہی کو شکار کرتا رہے پرواز اور شکار یہ دونوں باتیں اسکی طبیعت ثانیہ نہیں بلکہ فطرت اصلیہ ہیں۔ پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مسلمان نہ پرواز کی طرف مائل ہے نہ شکار کی طرف بلکہ حالت یہ ہے کہ امراء اور عوام، دونوں نے رقص عریاں مقصود حیات بنا لیا ہے۔ دولتمند افراد تو اپنے نفس کی عارضی تسکین کیلئے دختران حوا کو بذریعہ طیارہ لندن اور پیرس سے کرایہ پہ منگواتے ہیں اور پرائیویٹ مخلوق میں ان ''زندہ پریوں'' کا ناچ دیکھ کر اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرتے ہیں اور مفلس افراد انہی ماہ وشوں کی متحرک تصاویر ''پردۂ سیمیں'' پر دیکھ کر اپنے قلوب بے نور کی مسرت کا سامان بہم پہنچا لیتے ہیں۔

منتہائے فکر دونوں کا ایک ہی ہے یعنی عورت۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری قوم کے افراد دانشمند ضرور ہیں اس رنگین گناہ کا کفارہ ادا کرنے کیلئے وہی دولتمند عشرۂ محرم میں اپنے یہاں مجالس حسینیؑ برپا کرا لیتے ہیں اور عوام کالانعام ان مجالس میں سینہ کوبی کر کے اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔

مسلمانوں نے جنت کو بھی کس قدر ارزاں تصور کر رکھا ہے نہ نماز نہ روزہ نہ ایثار و نیت نہ کردار نہ جہاد نہ تقویٰ بس سال پیچھے ایک ذوالجناح کا جلوس اور ایک معراج النبی کا جلوس مرتب کر لیا اور جنت کے حقدار بن گئے حالانکہ قرآن میں اس جنس عالیہ کی قیمت اس کی دولت ہی نہیں بلکہ دولت اور جان دونوں چیزیں ہیں اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (التوبہ)

ترجمہ از حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ہر آئینہ خدا خریدہ است از مسلماناں جان ایشاں و مال ایشاں را بعوض آنکہ ایشاں را باشد بہشت۔ جنگ می کنند در راہ خدا پس می کشند و کشتہ می شوند وعدہ کہ لازم است بر خدا بتحقیق در تورات و انجیل و قرآن۔ و کیست وفا کنندہ تر بعہد خویش از خدا پس شادماں باشید بایں خرید و فروخت خود کہ معاملہ کردید بآں و ایں است فیروزی بزرگ۔

Registered No. L. 4584

منظور کردہ صوبہ سندھ و ریاست بہاول پور و ریاست بھوپال برائے گورنمنٹ

اکتوبر ۱۹۴۲ء — جلد ۷
نومبر ۱۹۴۲ء — جلد ۷
دسمبر ۱۹۴۲ء — جلد ۷

ماہنامہ

پیغامِ حق

اصلاحی اور اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا ذخیرہ

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم اے

دفتر اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

رسالہ پیغام حق لاہور

مدیر معاون: عبدالقدیر شعیب آفندی

جلد (۷) ‖ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۴۲ء ‖ عدد ۴، ۵، ۶

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر و پبلشر نے [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

ملت اسلامیہ ہندیہ کا احیاءِ ثانیہ سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں اسلام کا زوال ایک المناک تاریخی حقیقت بن گیا۔ یورپ کا آفتاب اقتدار اس وقت اپنے نصف النہار کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ایک اُٹھتے ہوئے سیلاب کے بہاؤ کو معمولی بند باندھنے سے نہیں روک سکتے سیلاب کے ساتھ چلنے سے بھی ہم اپنی شخصیت کی علیحدگی کو قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ یورپ کی تہذیب یورپ کے کارخانوں میں ڈھلے ہوئے عقائد اختیار کرکے بھی ہم اپنے قومی تشخص کو قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ملت اسلامیہ کے غلبہ اور اقتدار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور اس کو مسلمان اب ٹھوکریں کھانے کے بعد اختیار کررہے ہیں۔ یہ راستہ اعتماد نفس کا راستہ ہے۔ ہمارے لئے اپنی حرمت کے دفاع کی خاطر لابدی ہے کہ ہم اغیار کے چند روزہ دنیاوی غلبہ کو دیکھ کر ان کی تقلید کو اپنے لئے واجب نہ ٹھہرالیں۔ ہمارے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ ہم ہدایت اور سعادت کے مصطفوی چراغ سے اکتساب نور کریں۔

بیسویں صدی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر طرف مسلمان بیدار ہوگیا ہے مسلمانوں کا دن بدن یہ یقین پختہ ہو رہا ہے کہ ان کی حفاظت کا بہترین سامان ان کے اپنے اداروں کے قیام اور استحکام میں ہے انیسویں صدی میں مسلمان مفکروں کا ایک کثیر طبقہ اس رائے پر سختی سے قائم ہوگیا تھا کہ فرانس اور امریکہ کا جمہوری طرز حکومت ہی صحیح اسلامی حکومت کا چربہ ہے، مگر اب اس رائے کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی نظر آرہی ہیں۔ بیسویں صدی کے اسلامی مفکرین اب اس رائے کی طرف آرہے ہیں، کہ حقیقی اسلامی حکومت کی بنیاد "سیرت" پہ ہے۔ آمد ایک پارٹی کی حکومت میں ہے۔ توحید کا اسلامی عقیدہ اخلاق، اور

بعد الطبیعیات کے بنیادی مسئلوں کو چھوتا ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت کی بنیاد بھی حکومت الٰہیہ کے
ریہ پر رکھی جا سکتی ہے۔

اس وقت عالم اسلام کی تمام تحریکوں کی بنیاد دفاع ملیت (DEFENSIVE NATIONALISM) پر رہی ہے۔ ترکی، ایران، مصر، عراق، شام، الجیریا، ٹیونس
و، افغانستان اور ہندوستان میں مسلمان مغربی حکمرانوں سے دفاعی وطنیت کے اصول پر جنگ آزما
ہیں۔ مگر اب یورپ کے سامنے اس کی سماجی اور معاشی تنظیم کا مسئلہ درپیش ہے۔ یورپ کی سیاست کا
بڑا اب سلطنت کا عقیدہ نہیں رہا، بلکہ مختلف عمرانی مذاہب نے مختلف قوموں کے سیاسی اسٹیج کو اپنے
رہ اثر میں لے لیا ہے۔ اس حیرت انگیز تبدیلی کا اثر یہ ہوا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اصول زندگی پر سوچ
بار کرنے کی مہلت مل گئی ہے۔ علامہ اقبال سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغربی فکر اور اسلام کے
سادم کے نازک مسئلہ پر قلم اٹھایا۔ گو اس موضوع پر آپ کے خیالات، آخری نہیں، بلکہ وہ تو ایک نئے
کلام کی بنیادیں ہیں، مگر وہ ایک نئے عمرانی مذہب کی بنیاد اسلام، اور ملت اسلامیہ کی روایات میں ہوگی۔

ملت اسلامیہ کے انقلاب کی سمت اور وسعت حدود کا تعین کرتے ہوئے ہم اپنے موضوع کی حدود
سے بہت دور نکل گئے۔ اب ہم اس موضوع کے دور دراز گوشوں کو سمیٹتے ہیں۔ ملت اسلامیہ ہند نے
ں اس نئے انقلاب کو محسوس کیا۔ اس انقلاب نے اب ایک دھماکے کی صورت اختیار کر لی ہے۔
س سے قبل یہ انقلاب چند جھٹکوں تک محدود تھا جو ایک بہت قلیل دنفے کے لئے برادران ہنود
میں ارتعاش پیدا کر دیتا تھا مگر اب پاکستان کے نعرہ نے ایک ہمہ گیر تحریک آزادی کی
صورت اختیار کر لی ہے۔

سرسید احمد خان ملت اسلامیہ ہندیہ کے بانی ہیں۔ آپ نے گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی زبوں
حالی کو دور کرنے کے لئے تعلیم کا نعرہ بلند کیا۔ تعلیم اور تجارت، سیاست کی بنیادیں ہیں۔ اس وقت دنیا کی

ہی قومیں مسند حکومت پر متمکن ہیں جو کہ پاس تعلیم اور تجارت ہے سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف
غب کیا۔ کیونکہ شناخت کے بغیر دولت اور اقتدار کا دروازہ انسان پر نہیں کھل سکتا۔ جہاں ہم سر سید احمد خاں
خدمات کو موجب احترام تصور کرتے ہیں وہاں ان کے نقائص کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آپ نے
ب سے بڑی غلطی یہ کی کہ مذہب کو عقلیت کے نیچے لانے کی سعی کی۔ یہ ایک ضمناً اشارہ تھا، اس وقت
م اس مسئلہ کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے۔ اس کو ہم کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔

سر سید احمد خاں کی حکمت عملی کا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت موجودہ زندگی
ے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہوگئی۔ گو ایک کثیر طبقہ مذہب سے بے پرواہ ہوگیا۔

سر سید احمد خاں کا زمانہ گزر گیا۔ اب ایک اور زمانہ آیا۔ یہ زمانہ زبردست خانہ جنگی کا زمانہ تھا۔ اس
قت مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ آزادی وطن میں سرفروشانہ حصہ لینا بہتر ہے، یا حکومت
قت سے تعاون کر کے مسلمانوں کے لئے ملازمتوں اور کاروبار میں مراعات حاصل کرنا۔ ۱۹۰۶ء سے
۱۹۳۵ء تک مسلمان اس کشمکش میں رہے۔ سرکار سے تعاون کرنے والے حضرات میں سر شفیع۔ میاں
سر فضل حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ کانگرس سے تعاون کرنے والے حضرات میں ڈاکٹر انصاری اور مولانا
آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبالؒ۔ مولانا محمد علی اور مسٹر جناح کی پوزیشن کا تعین مشکل ہے۔ یہ انگریزوں
کے سامنے کانگرس کے مطالبہ آزادی کی حمایت کرتے مگر برادران وطن کے سامنے اسلامی حقوق کی حمایت
کا دم بھرتے۔

آئین حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد اسلامی راہنماؤں کو پختہ یقین ہوگیا کہ کانگرس ان کے
حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ قوم کی حیثیت اختیار کر کے سیاسی
جدوجہد کرنا ضروری ٹھہرا۔ چنانچہ قائد اعظم محمد علی جناح نے دو قوموں کا نظریہ ملک کے سامنے پیش کیا۔ ہندو
کے لئے یہ نظریہ پیغام اجل تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی برپا کر دیا۔ کانگرس

نے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے رابطۂ عوام کی تحریک شروع کی، شعبہ اسلامیات قائم کیا، مولانا آ
کو کانگریس کی صدارت دی گئی۔ مگر کانگریس کی اس حکمت عملی سے لیگ کی قوت زیادہ ہوگئی، لیگ نے ۱۹۴۰ء
میں پاکستان کو اپنا نصب العین ٹھہرالیا۔ اس روز سے ملت اسلامیہ ہندیہ ایک زندہ قوم بن گئی۔ اس نے
اپنی ملت کی بنیاد اسلام پر رکھی۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمان وحدت نسل کی بنا پر اپنے لئے کوئی علیحدہ قومی حق طلب
نہیں کرسکتے۔ وہ ایک مذہبی قوم ہیں اور ان کے اس وجود سے انکار کرنا واقعیت کو جھٹلانے کے مترادف ہے

ملت اسلامیہ ہندیہ کی بنیاد

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مطالبہ استقلال کی بنیاد کیا ہے
مسلمان نسل کے اعتبار سے ایک قوم نہیں ہے۔ بلکہ مختلف نسلوں سے مل کر ایک جماعت بنے ہیں مسلمان ایک
نصب العین کی وحدت کی وجہ سے ایک ملت ہیں۔ ایک عمرانی فلسفہ کی بنا پر ایک مختلف امت ہیں۔ ایک
مذہبی قومیت ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی قومیتوں کا زمانہ اب ختم ہوچکا ہے۔ یہ ازمنہ وسطیٰ کی سیاست
ہے۔ مگر ایک قوم کی علیحدگی کا تصور اور عقیدہ علیحدہ قومی شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے
کہ مسلمان علیحدہ ملی شعور رکھتے ہیں۔ کیوں؟

اس لئے کہ اسلام ایک عمرانی فلسفہ ہے۔ اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں جن معنوں میں ہندو
دھرم یا جین دھرم مذہب ہے۔ اسلام ایک ایسا عمرانی مذہب ہے، جس کی بنیاد توحید، نبوت، اور آخرت
کے عقائد پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اب تک جماعتوں اور قوموں کی زندگی میں ایک فعال عنصر کی حیثیت
رکھتا ہے۔

اجتماعی فلسفہ یا عمرانی فلسفہ کو ہم ذرا وضاحت سے پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود
کے مسئلہ کو سمجھنے میں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس بنیادی حقیقت کو سمجھ کر ہم اسلام کی ماہیت کو بھی
آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

عمرانی فلسفہ، عمران کی ماہیت سے بحث کرتا ہے۔ اس کا نصب العین اجتماعی تنظیمات کی اقدار

اور مقاصد کی چھان بین کرتا ہے۔ موخر الذکر جز و میں عمرانی تنظیم کے تمام حصے داخل ہیں۔ خاندانی زندگی، نجی شرکت، شہری طبقہ یا بلدیت، ملت اور بین الملی تنظیمات اس کے دائرے میں داخل ہیں۔ معاشی ادارے اور کاروباری تشریعی ادارے اور کاروبار، تعلیمی ادارے اور کاروبار سب کے سب اس میں داخل ہیں۔ فلسفہ ان اداروں پر انسانی قدر اور خیر کے زاویہ نظر سے بحث کرتا ہے۔ فلاسفی عمرانی تنظیمات کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات پیدا کرتی ہے (ر) مختلف ادارے، جماعت کے افراد کی سعادت کے حصول میں کہاں تک اعانت کرتے ہیں؛ کہاں تک مختلف ادارے انسانی اقدار کو ترقی دیتے ہیں؟ (ب) جہاں تک ان اداروں کی چھان بین مذکورہ بالا اغراض کی تحصیل میں ناکامی واضح کرتی ہے، فلسفی کی تحقیق کا رخ اس حد تک یہ ہوتا ہے؟ کہ ان اداروں کی چھان بین مذکورہ بالا اغراض کی تحصیل میں ناکامی واضح کرتی ہے، فلسفی کی تحقیق کا رخ اس حد تک یہ ہوتا ہے کہ ان اداروں کو ہم کس صورت پر ایک نئے سانچے میں ڈھالیں، یا ان میں کیا ترامیم پیدا کریں، کہ ان سے انسانی اقدار کے حصول میں امداد حاصل ہو سکے؟ سوالات کا ثانوی مجموعہ عملی عمرانی فلسفہ کی طرف، فکر کو منتقل کر دیتا ہے۔

یہاں یہ امر واضح ہے، کہ اس چھان بین کے لئے اولین ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک سعادت مند زندگی کی تعریف کو پہلے متعین کر لیا جائے۔ بالفاظ دیگر ہمارے سامنے انسانی اقدار کے مبسوط اور مرتب نظریے کی تشکیل کا سوال کھڑا ہے۔ اس بڑے سوال میں یہ ضمنی مسئلہ بھی داخل ہے کہ حکمت اور صنعت کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس نصب العین کے حصول کے لئے کونسے وسائل اختیار کر سکتے ہیں۔ گویا انسانی اقدار کا نظریہ اخلاقیات کا ایک مرتب نظریہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عمل کی بنیاد نیت کو قرار دے کر اپنے عمرانی فلسفہ میں اخلاقیات کو سنگ بنیاد قرار دیا ہے۔ اخلاقیات کے بارے میں ہماری یہ رائے ہے کہ یہ انسانی اقدار کا ایک مبسوط نظریہ ہے قدر اور سعادت کا کوئی حصہ جو انسانوں کو کسی دائرہ کار میں متاثر کرتا ہو، اس کے احاطے سے خارج

نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق، اخلاقی فلسفہ، انسانی اقدار کا کوئی مخصوص شعبہ نہیں ہے۔ علم اخلاق زندگی کا داخلی اور بنیادی فلسفہ ہے۔ یہ اقدار انسانی کا شیرازہ بند ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ کا ایک شعبہ ہے جو اتنی اہمیت کا حامل ہے، اس کا نام مابعد الطبیعیات ہے۔ اخلاقیات اور مابعد الطبیعیات مرتب فلسفہ کے دو زبردست شعبے ہیں۔ اس وقت ہم مابعد الطبیعیات کی بحثوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ نہ اخلاقیات مابعد الطبیعیات کے ان مسائل کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ فلسفہ کے یہ دونوں شعبے سیرت (PERSONLITY) کے نظریہ میں ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ سیرت فلسفہ اختیار، اور انسانی اقدار یا سیرت کے کائنات میں مقام سے بحث کرتا ہے۔

اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق کا تعلق فرد واحد سے بحیثیت اخلاقی اقدار کے حامل اور مبدار کے ہے، اس لئے اخلاق اور عمرانی فلاسفی کو ایک دوسرے سے مخلوط کرنا قرین مصلحت نہیں مگر اسلام کا جواب یہ ہے کہ فرد بحیثیت اخلاقی اقدار کا مبدار اور حامل ہونے کے، ایک جماعت کا ہر حال رکن ہے۔ فرد جماعت سے علیحدہ رہ کر ایک تجرید لایعقل ہے یہی حال جماعت کا فرد کے بغیر ہے اسلام میں جماعت اور فرد کے اس پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے۔

عمرانی فلسفہ کے مسائل اور حدود مطالعہ کی طرف ہم اوراق بالا میں اشارہ کر چکے ہیں۔ اسلام ایک عمرانی فلسفہ ہے اس کی حیثیت اشتراکیت، فسطائیت یا جمہوریت کی سی ہے۔ اسلام ایک داستان پارینہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ اسلام نے بحیثیت ایک عمرانی مذہب ہونے کے مندرجہ ذیل بنیادی مسائل سے بحث کی ہے۔

ا۔ کائنات اور انسان کا باہمی ربط کیا ہے۔

ب۔ سعادت (GOOD) اور قدر (VALUE) کیا ہے اور اس کا تعین کیسے ہو۔

اس نصب العین کے حصول کے لئے اسلام نے ایک جماعت پیدا کی پھر اس نے فرد اور جماعت

اور سیرت کے روابط کا تعین کیا۔ پھر اس نے ان مسائل کا تعین کیا جو سعادت اور فوز کے اسلامی نصب العین کے حصول کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

ملت اسلامیہ ہندیہ کی یہ بنیاد ہے۔ اس بنیاد نے دس کروڑ نفوس کو ایک علیحدہ شعور بخشا ہے۔ ہم مسلمان تہذیب کے نسلی عقیدہ میں یقین نہیں رکھتے۔ ہماری ثقافت کا عقیدہ وحدت حیات کے مسلک پر مبنی ہے۔ ایک اُٹھتی ہوئی نئی دنیا میں ہم اپنا تعلیمی لائحہ عمل صرف اسی بنیاد پر مرتب کریں گے۔

مسلمانوں کا تعلیمی لائحہ عمل

اندریں حالات سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی حکمت عملی کیا ہو؟ تعلیم اجتماعی زندگی کی دو اہم ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ تعلیم کی ایک اہم غرض یہ ہے، کہ اپنے قومی عقیدہ کو نئی پود میں برقرار اور محفوظ رکھے۔ عملی علوم اور فنون میں معمولی مسائل سے لے کر پیچیدہ کاموں میں تدریجاً مہارت کے مواقع پیدا کئے جائیں۔ روٹی کا مسئلہ حل کرنے کیساتھ جب ہم دارالعلوم کی چار دیواری سے نکلیں تو ایک ناقدانہ نظر کے مالک بن کر نکلیں۔ قدیم روایات کی سخت پابندی کیساتھ عمران کی ترقی کے لئے تطابق زمانی کی صلاحیت کا مالک ہونا نظام کا ایک اہم جزو ہے۔

مسئلہ تعلیم میں قدیم روایات اور ثقافت کے اس حصہ کا انتخاب لازمی ہے۔ جو موجودہ وقت کی مانگ کا صحیح جواب ہو۔ اس کے ساتھ بیان اور اظہار کے وسائل کا انتخاب بھی اولین شے ہے۔

اسلامی ثقافت میں بیان اور اظہار کا وسیلہ عربی زبان ہے۔ عربی زبان میں کلام الٰہی نازل ہوا۔ اسی زبان کو فصاحت اور بلاغت کا منبع تسلیم کیا گیا ہے۔ عبرانی زبانوں میں اس زبان کی صلاحیتیں سب سے فائق ہیں۔ عربی زبان کے پاس ادب اور اسلوب کا بہترین ذخیرہ ہے۔ جدید زبانوں کے الفاظ اور مصطلحات کو اپنے دامن میں جگہ دینے کی اس میں بہترین صلاحیتیں ہیں۔ تاریخ، طب، ہیئت، فلسفہ، ریاضی، اخلاق تمام علوم کے بارے میں الفاظ و تراکیب کا وافر ذخیرہ عربی زبان میں موجود ہے۔ اسلام اور اسلامی

ثقافت کے تعلیمی مسئلہ کو زیر بحث لاتے وقت ہم عربی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ امم اسلامیہ کے درمیان روابط قائم کرنے کے لئے یہی حقیقی اور اصلی ذریعہ ہے۔ اس رشتہ کو ترک کر کے اخوت اسلامیہ، اتحاد اسلام کے نعرے بیکار ہیں۔ ترکوں، افغانوں، ایرانیوں، اور ہندی مسلمانوں کو اپنی علیحدہ زبان کی ترویج میں عربی کو عروۃ الوثقیٰ قرار دینا چاہئے۔

پاکستان میں ایک اسلامی ثقافت کے مرکز کی ضرورت ہندی مسلمانوں کو اپنے ملی تحفظ کے لئے عربی کی ترویج کی بہت ضرورت ہے۔ اردو اس وقت عالم وجود میں آئی جب اسلامی تہذیب اپنے انحطاطی قوئے کو بہت حد تک ختم کر چکی تھی۔ اس وقت ہندی اور اسلامی مزاج میں اتصال کی حالت پیدا ہو چکی تھی۔ اس اختلاط نے اسلامی ثقافت کو ہندوستان میں سخت ضعف پہنچایا۔ یہ حالت اختلال کی حالت تھی۔ اسلام بنیادی عقائد کے باب میں مصالحت کو سخت ناروا قرار دیتا ہے۔ اردو، نانک، کبیر اور تلسی داس کے عقائد کی تبلیغ کا ایک ذریعہ بن گئی بھگتی تحریک کے راہنما مصالحت کر کے اسلام کے جذب و استیلا کے زور کو کم کرنا چاہتے تھے۔ کانگرس اب اسلامی تہذیب کے کمزور بچہ کو بالکل تباہ کر دینے کے درپے ہے۔ اس لئے کہ اردو کے رسم الخط میں عربی اور فارسی کے حروف تہجی داخل ہیں۔ ہم اس کمزور جزو کو قائم رکھتے ہوئے اس سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ ہم یہاں عربی ادب کی ترویج کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

الکلیۃ اللغۃ العربیہ کا قیام ایک جدید عربی کالج کے قیام کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اس اہم ضرورت کو ہمارے دوست سید محمد شاہ صاحب نے پورا کر دیا ہے۔ ان کی انتظامی ذہانت کی داد دیئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے پنجاب کے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے پروفیسر اعظمی بہترین شخص ہیں جو اس کا بیڑا اٹھانے کی پوری پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ اس وقت جنگ کے باعث حالات گو نازک ہیں مگر ہم بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہیں کہ وہ اپنی تائید غیبی سے ہمیں اس امتحان کی تلخیوں سے عہدہ برا

ہونے کی پوری توفیق دے۔

اس کالج کی بنیاد کا سہرا ابھی مٹھی بھر اشخاص کے سر پر ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کالج کے حامیوں کی تعداد دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گی۔ ایک قلیل مدت میں ہم اس کالج کو ایک اسلامی یونیورسٹی کی صورت میں دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ اس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم عربی ہوگا۔ اس میں فنون اور عملی علوم کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہوگا۔ تاکہ تعلیم ایک تحصیل حاصل کی صورت نہ بن کر رہ جائے۔ اس میں اسلامی روایات کا صرف وہ حصہ پڑھایا جائے جو ضروریات وقت کو پورا کرنے میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرتا ہو۔ غیر ضروری حشو و زوائد کاٹ کر الگ کر دیئے جائیں گے۔ اس میں خالص علوم کی درس و تدریس کا پورا انتظام ہوگا تاکہ ہم اسلام کے محاسن کو ناقدانہ نظر سے دیکھ سکیں۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ اس تعلیمی تحریک سے ہمارے ماہرین تعلیم کو پورا پورا اتفاق ہے

اس تحریک کا ایک خوش آئند پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمان لڑکیاں بھی اس تحریک میں کافی جوش اور اخلاص سے شریک کار ہیں۔ عورتوں کو اس تحریک میں لانے کی ذمہ داری فاطمہ بیگم صاحبہ کے سر پر ہے چنانچہ آپ کے زیر سرکردگی الکلیۃ اللغۃ العربیہ للبنات کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس تحریک میں حصہ لینے کے لئے جو طالبات باہر سے آئیں ان کے مصارف کم کر دیئے جائیں گے۔ جناح کالج کی طالبات نے ایک ایسوسی ایشن اس سلسلہ میں قائم کی ہے اس جماعت کی سرپرستی کے لئے قرعہ انتخاب آبرو بیگم ہمشیرہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے نکلا ہے، جو بھوپال پردہ کلب کی سیکرٹری بھی ہیں۔ آپ کو اس جماعت کی صدارت کے فرائض تفویض کئے گئے ہیں۔ فاطمہ بیگم صاحبہ پرنسپل جناح کالج کو اس جماعت کا نائب صدر بنایا گیا ہے۔ بیگم سر شفیع اس کی دوسری نائب صدر ہیں۔ جنرل سیکرٹری آنسہ مسعود بی۔ اے ہے۔ خازنہ آنسہ حمید بی۔ اے کو بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی طالبات اس کی مجلس عاملہ کی رکن ہیں۔ ان کی تعداد اکیس (۲۱) تک پہنچتی ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ حامیان عربی زبان کی کوششوں کو جلد بار آور کرے۔

میرا سفر حیدرآباد دکن

(سید محمد شاہ ایم اے سکرٹری اقبال اکیڈمی لاہور)

دسمبر ۱۹۶۲ء کے نصف آخر میں خاکسار کو دولت آصفیہ کے پایہ تخت حیدرآباد دکن کے دیکھنے کا موقع ملا۔ مدت سے آرزو تھی کہ اس بلدۂ شہیرہ کی زیارت کی جائے جسے علم و ادب کے چرچا، تمدن و معاشرت کے اعلیٰ نمونہ اور دولت و ثروت کی فراوانی کی وجہ سے آج کا بغداد کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا میں ۱۶ دسمبر کو وہاں پہنچا اور ۲۸ دسمبر تک وہاں رہا۔ ان دنوں وہاں بہار کا موسم تھا پنجاب کی سردیاں سے ٹھٹھرتا ہوا وہاں پہنچا تو نہایت ہی خوشگوار موسم کو پاکر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ نہ پنجاب کی سی سردی تھی اور نہ پنجاب کی سی گرمی۔ نہایت معتدل اور صحت افزا بہار تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی بہار کی تعطیلات کی وجہ سے بند تھی مگر اکثر پروفیسر حضرات وہیں تھے جن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

انہیں دنوں میں وہاں دو عظیم الشان اجتماع ہوئے۔ ایک اجتماع جلسہ تقسیم اسناد ادارہ ادبیات اردو کا تھا جس کی صدارت ہز ہائی نس جنرل والاشان ڈاکٹر شہزادہ اعظم جاہ بہادر ولی عہد دولت آصفیہ نے فرمائی۔ ہز ہائی نس موصوف ادارہ ادبیات اردو کے سرپرست اعلیٰ ہیں اور اپنی رعایا کی تعلیمی حالت سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اس ادارہ کے بانی اور روح رواں ہمارے دوست پروفیسر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی ہیں۔ آپ ایک مایۂ ناز ادیب اور محقق ہیں اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کی ہردلعزیزی کے لئے جو کام آپ اس وقت تک انجام دے رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ بڑی بڑی جماعتیں بھی وہ کام اس حسن و خوبی سے سرانجام

نہیں دے سکتیں۔

یہ اجتماع ۲۱ اور ۲۲ دسمبر کو دو روز تک ہوتا رہا۔ خاکسار کو اس موقع پر حیدرآباد کے اکثر و بیشتر اہل علم کے نیاز حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

دوسرا عظیم الشان اجتماع وہ تھا جو مملکتِ آصفیہ کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت اتحاد المسلمین کے انتظام و انصرام سے دارالسلام حیدرآباد میں ۲۱ دسمبر سے ۲۴ دسمبر تک ہوتا رہا۔ اتحاد المسلمین کا یہ اجتماع اس جماعت کے مقبول و ہر دلعزیز قائد نواب بہادر یار جنگ کی صدارت میں ہوا۔ اہل حیدرآباد کا کہنا ہے کہ انہوں نے آج تک اتنا عظیم الشان اور کامیاب اجتماع کہیں نہیں دیکھا۔ مسلمانوں کا ہر فرقہ اور ہر جماعت اس اجتماع میں شامل تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جناب نواب بہادر یار جنگ نے اپنے ایثار، قومی خدمات اور شیریں بیانی سے ریاست بھر میں وہ ہر دلعزیزی حاصل کی ہے کہ پورے ہندوستان میں اس کی کوئی مثال ہمیں نظر نہیں آتی۔

حیدرآباد میں ہر سال مصنوعات ملکی کی نمائش بھی باغ عامہ میں ہوا کرتی ہے خوش قسمتی سے اس نمائش میں جاکر نہایت آسانی سے یہ مطالعہ کرنے کا مجھے موقع ملا کہ اہل حیدرآباد صنعت و حرفت سے کہاں تک دلچسپی رکھتے ہیں اور اہل ریاست کے معاشی ذرائع پر کہاں تک توجہ صرف کر رہے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ برٹش انڈیا اس خصوص میں جو کچھ کر رہا ہے اہلِ حیدرآباد دکن اُس سے کہیں زیادہ شاندار نتائج پیدا کر رہے ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

جنوری کا پرچہ حیدرآباد نمبر بنانے کا ارادہ ہے اللہ نے چاہا تو اس سفر کے مکمل حالات اور اپنے تاثرات کو وہاں بالتفصیل بیان کرنے کا موقع ملے گا۔

اس سفر میں مجھے سب سے زیادہ خوشی اپنے محترم دوست ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی سے مل کر ہوئی۔ آپ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جن کو سالِ گزشتہ ریاضی کا نوبل پرائز ملا تھا۔ آپ کی

شخصیت حیدرآباد بھر میں مقبول اور محترم ہے۔ آپ کی عمر ابھی ۳۵ سال سے متجاوز نہ ہوگی مگر آپ نے اپنی محنت اور خداداد ذہانت سے علومِ ریاضی وسائنس میں جو امتیاز حاصل کیا ہے، اُس کی نظیر نہیں ملتی اگرچہ ریاضی اور سائنس آپ کے خصوصی مضامین ہیں مگر فلسفہ وادب سے بھی آپ کو ویسی ہی دلچسپی ہے آپ کا ایک مضمون "موت وحیات کا فلسفہ اقبال کے کلام میں" رسالہ اردو میں اور اُس کے بعد پیغامِ حق بابت اکتوبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ میری رائے میں یہ مضمون اُن تمام مضامین پر جو اس سلسلے میں لکھے گئے ہیں ادبی بلند پائیگی ندرتِ خیل اور حسنِ اسلوب کے لحاظ سے ایک شاندار فوقیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کے کلام اور اُن کے ادب وفلسفہ سے آپ کو گہرا شغف ہے اور آپ وقتاً فوقتاً اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ مجھے اقبال اکیڈمی کی سرپرستی کے لئے آپ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نظر نہیں آیا۔ میں آپ کے بہرۂ علم وفضل، آپ کی خداداد قابلیت اور سب سے زیادہ آپ کے مکارمِ اخلاق سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ مجھے انتہائی درجہ کی مسرت ہے اور اقبال اکیڈمی کی نہایت خوش قسمتی کہ آپ نے اقبال اکیڈمی کی سرپرستی میرے اصرار پر قبول فرمائی ہے اور مجھے توقع ہے کہ آپ کی توجہ اور عنایات سے اب یہ ادارہ صحیح معنوں میں علامہ اقبال کی یادگار رہ کر کچھ کام کر سکے گا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ اور ایڈیٹر رسالہ سیاست سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ حیدرآباد کی علمی مجلسوں میں آپ کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اتفاق سے حیدرآباد کی ایک مشہور علمی شخصیت جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ سے بھی ملاقات ہو گئی اور آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ڈاکٹر صاحب فرانسیسی، انگریزی اور عربی زبانوں کے ماہر ہیں اور ان زبانوں میں مستقل تصانیف کے مالک ہیں۔

یہ سفر میرے لئے بڑی روحانی خوشی کا موجب ہوا۔ اہل حیدرآباد کی مہمان نوازی، علم پروری اور اسلام دوستی کا یہ گہرا نقش انشاء اللہ دیر تک قائم رہے گا۔

اس سفر کے دوران میں جو کتابیں دیکھنے میں آئیں اُن کا مختصر سا ذکر کردینا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ تبصرہ
ید کے لئے اس نمبر میں گنجائش نہیں۔ اُس کے لئے کسی دوسری فرصت کا انتظار کریں گے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ نے عربی میں ایک ضخیم کتاب الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی
فتہ الراشدہ کے نام سے تصنیف کی ہے اور اُسے بہت اہتمام سے مصر میں طبع کرایا ہے۔ جیسا کہ اس
ب کے نام سے ظاہر ہے اس میں اُن معاہدات کو جمع کیا گیا ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدہ
نے اپنے اپنے زمانے میں دوسرے لوگوں سے کئے۔ کتاب بڑی محنت سے تیار کی گئی ہے اور بڑی قابلیت
، قرنِ اول کی سیاست کا نقشہ کھینچ کر دکھایا گیا ہے میرے علم میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ قیمت عہ

ابن الہانی خلفائے فاطمیہ کے دور کا ایک قادر الکلام شاعر گزرا ہے جسے مغرب کا متنبی کہتے ہیں۔
یاسی اختلافات کے باعث ادب فاطمی اب تک شہرت نہ پا سکا۔ نظام کالج حیدرآباد دکن کے پروفیسر عربی
اب ڈاکٹر زاہد علی ایم اے پی ایچ ڈی نے ابن الہانی کے دیوان کو تلاش کرکے اُس کا ناقدانہ مطالعہ
یا اور بڑی محنت، عرقریزی اور محبت سے اس فاطمی شاعر کے دیوان کی شرح لکھی ہے۔ اس دیوان کے
مطالعہ سے جہاں اُس زمانہ کے ادب پر روشنی پڑتی ہے وہاں خاندانِ فاطمیہ کے عقائد اور رجحانات دینی
سیاسی کا بھی پورا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تاریخ و ادب کے طالب علم کے لئے اس دیوان کا مطالعہ بہت
ضروری نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی ہزار روپیہ صرف کرکے اِس کتاب کو مصر میں طبع کرایا ہے ضخامت کوئی
ایک ہزار صفحہ کے قریب ہے اور قیمت صرف بارہ روپیہ ہے۔

بچوں کے لئے عربی کی پہلی دوسری کتابیں جس قدر ہندوستان بھر میں لکھی گئی ہیں میرے خیال میں اُن
سب سے بہتر وہ کتابیں ہیں جو عثمانیہ ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن کے استاذ عربی مولانا العسیری نے المفتاح
العربیہ للجزء الاول والجزء الثانی کے نام سے لکھی ہیں عثمانیہ ٹریننگ کالج کے قابل اور ماہر تعلیم پرنسپل سجاد مرزا
کے مشورہ اور نگرانی میں العسیری صاحب نے جو عربی النسل ہونے کے علاوہ ادیب بھی ہیں ان کتابوں کو مرتب کیا ہے۔

مرتبے اہل زبان ہونے کے علاوہ ہندوستانی بچوں کی ذہنیت اور استعداد کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور سجاد مرزا کے تعلیمی تجربہ اور ہدایات سے خوب فائدہ اٹھا کر اس کام کو شوق و محنت سے سرانجام دیا ہے۔ صوبہ سندھ کے عربی نواز ڈائرکٹر تعلیم ڈاکٹر داؤد پوتا نے ان کتابوں کو سندھ کے سکولوں کے لئے بطور انعام منظور کر لیا ہے۔ اور اسی طرح حیدر آباد کے محکمہ تعلیم نے بھی ابتدائی مدارس کے لئے اس کتاب کو منظور کر لیا ہے۔ یہ کتابیں باتصویر ہیں لہذا بچے بڑی آسانی اور شوق سے ان کو مطالعہ کرنے لگتے ہیں۔ قیمت الجزء الاول ۱۰ اور الجزء الثانی ۸

اردو کی کتابوں میں سے روح اقبال جو ڈاکٹر محمد یوسف حسین خاں ایڈیٹر سیاست کی تصنیف ہے اقبالیات پر ایک چوٹی کی تصنیف ہے ملک میں اب تک اقبال کے نظریہ کو واضح کرنے کے لئے جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کی صف اول میں اس کا شمار ہوگا۔ تبصرہ کا یہ موقع نہیں۔ آئندہ پرچہ میں انشاء اللہ العزیز اس کتاب کے محاسن اور امتیازات کو کھول کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ رسالہ اُردو دہلی اور رسالہ کتاب لاہور نے اس پر شاندار ریویو لکھے ہیں قیمت ہے ۱/۱۱ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے شاد اقبال کے نام سے علامہ ڈاکٹر اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی سابق وزیر اعظم ریاست حیدرآباد کی باہمی خط و کتابت کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ کے مرتب کرنے میں ڈاکٹر صاحب نے کافی محنت و عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ کتاب ابھی تک بازار میں نہیں آئی۔ مجھے اُس کی (ADVANCE COPY) دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اقبال کو سمجھنے میں یہ کتاب بنیادی طور پر بہت کچھ مدد دے گی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اس کے علاوہ اسلامی تہذیب کیا ہے، جنگ زدہ ممالک اور میسور میں اردو اور دیگر کتب دیکھنے میں آئیں جن پر بعد میں تبصرہ کیا جائے گا۔

عربی کی کتابیں مطبوعہ مصر و ہند

کلیہ اللغۃ العربیہ کے اجراء کے ساتھ اس بات کی اشد ضرورت سمجھی گئی ہے کہ ابتدائی عربی تعلیم کی کتابوں کا اسٹاک بھی رکھا جائے چونکہ جنگ کے دوران میں مصر سے کتابوں کا منگوانا بہت مشکل ہے لہذا یہاں جس کسی سے دستیاب ہوسکیں یہ کتابیں منگوا کر رکھ لی گئی ہیں انشاء اللہ العزیز عربی کتابوں کا ایک وافر ذخیرہ فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

القرأۃ الرشیدۃ مبادی اوّل	۸	القرأۃ الرشیدۃ الجزء الثانی	۱۲
〃 〃 〃 دوم	۸	〃 〃 الجزء الثالث	۱۴
〃 〃 الجزء الاول	۱۲	〃 〃 الجزء الرابع	۱۴

النحو الواضح مکمل ہر سہ حصص مدارس ابتدائیہ کے لیے — للعہ
النحو الواضح 〃 〃 مدارس ثانویہ کے لیے — ٹلے
مفتاح العربیہ للعسیری الحیدرآبادی الجزء الاول — ۱۰
〃 〃 〃 〃 الجزء الثانی — ۸
شرح دیوان ابن الہانی مصنفہ ڈاکٹر پروفیسر زاہد علی صاحب قیمت — عــ۵
الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی وخلافۃ الراشدۃ مصنفہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآبادی عــلـہ
اردو عربی ترجمہ حصہ اوّل مصنفہ پروفیسر محمد حسن الاعظمی — عہر
المدارس العربیہ حصہ اوّل مصنفہ پروفیسر محمد احسن الاعظمی — ۱۲

ملنے کا پتہ:- دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاجپورہ - لاہور

اسلام میں دولت کا تصور

(از جناب عبدالقدیر خان صاحب)

ہجرت سے قبل اسلام کی حیثیت ایک دعوت کی تھی۔ یہ دعوت و مخاطبت یہود، نصاریٰ، مشرکین عرب، کفار وغیرہ کے لئے ایک اچنبا اور تعجب کی بات تھی۔ لوگ اس توحید الوہیت کی پکار کو سنتے۔ یہ پکار چونکہ انسانیت کے وجدان کی آواز تھی یعنی یہی وہ حقیقت تھی جس کے لئے ضمیر انسانی نے ہمیشہ ان اوقات میں اپنی بیتابی کا اظہار کیا ہے جب دنیاوی زندگی کا شور وغل انسان کو اپنی طرف منعطف کرنے سے عاجز آجاتا ہے اور روح انسانی بیتاب ہو کر اس چشمہ حیوان کی طرف دوڑتی ہے ۔۔۔۔ طبیعت انسانی کو اکثر اوقات غفلت سے پیار ہو جاتا ہے دور غفلت میں انسان روح کی پیہم صداؤں کے باوجود ضمیر کی تنبیہ و انذار کے ہوتے ہوئے بھی شعور ذات کا گنجینہ لازوال کھو دیتا ہے اس غفلت اور تعطل عقل و خرد کی سب سے قبیح صورت وہ ہے جب انسان حق کی مخالفت میں سرگرم کار ہو جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کی دعوت نے آپ کی صداقت کے آثار لوگوں کو نظریہ کی دنیا سے بلند عمل کی دنیا میں لاکر ایک ایسی مقناطیسی قوت بخش دی جس سے ان لوگوں کا جذبہ عناد بھی بیدار ہو گیا جو غفلت اور تساہل کے علمبردار تھے۔ ان کو اذیت دہی کی راہ اختیار کرنے والوں نے اسلام کے ان پجاریوں پر جن کا جرم قبول حق و صداقت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کر دیئے۔ یہ دعوت کے لئے سختی اور شدت اس کی قوت و اقدام کی تربیت کا ایک بہترین حربہ ہے۔ مصائب کا وار مشکلات عمل اگر اس نوعیت کی ہوں کہ انسان ان کو اپنے عمل اور ثبات سے مغلوب کر لے تو انسان کی شخصیت کو قوت اور طاقت کے لازوال خزینے بخش دیتی ہیں۔ اسلام کے پرستاروں نے اس راہ کی ابتدائی مشکلات کو کمال ضبط اور خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحیثیت ایک کامیاب تحریک کے اسلام پر مہر توثیق ثبت ہو گئی۔ یہ دعوت اس طرح ایک کامیاب تحریک ثابت ہو جاوے تو وہ خود ایک سیاسی قوت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

مکہ اور طائف کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مظالم نے اسلام کو ایک زبردست تحریک (MOVMENT) بنا دیا تھا اور ہجرت کے بعد قیام مدینہ نے اسلام کو ایک ریاست (STATE) بنا دیا۔

اسلامی ریاست کی بنیاد شریعت کی سیادت (SOVEREIGNITY OF SHARIAT) کے تصور پر تھی۔ قرآن نے سورہ بقرہ، نساء، مائدہ اور انعام میں ایک معاشرت کے مناسب ادارات اور اسلوب کار کے متعلق اہم اصول وضع کر دیئے۔ اسلامی معاشرت کو ایک نصب العین قرار دیا گیا۔ ریاست اس نصب العین کے حصول کا محض ایک آلہ تھی۔ اسلام میں ریاست بحیثیت ایک نصب العین کے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ریاست محض ان اقدار شرعیہ (SHARIAT VALUES) کے حصول کا ایک ذریعہ ہے جن کو اسلام نے اپنی معاشرت کی تشکیل کے لئے اجزاء قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے قضاۃ (THE JUDICIARY) کو ہر اثر سے آزاد کر دیا۔ اسلام کے نزدیک عدل و انصاف کے نظام میں ترمیم کی گنجائش امیر ریاست (HEAD OF THE STATE) کے لئے بھی ممکن نہیں۔ امیر ریاست بذات خود کوئی نصب العین نہیں اس کی عزت کا واحد سبب

ہے کہ وہ ایک خاص نصب العین کے حصول کے لیے ساعی ہے۔ اس کی شخصیت محور اور مرکز نہیں۔ محور اور مرکز توحید الوہیت اور شریعت اسلامیہ کے قیام و بقا کا سوال ہے جب تک کوئی شخصیت ان ذمہ داریوں کو پورا کر سکتی ہے وہ محبت اور احترام کی مستحق ہے اگر ایک شخصیت عمل کی اس راہ سے بیگانہ ہو جاتی ہے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ قرآن نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ٥ (آل عمران)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت تو ایک رسول کی ہے اس سے قبل بھی رسول گزر چکے ہیں اگر وہ وفات پا جائے یا قتل ہو گئے تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور یاد رکھو کہ جو کوئی اُلٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ ان لوگوں کو ضرور اجر دے گا جو ہر حالت میں شاکر رہتے ہیں۔

ان تصریحات سے صاف ثابت ہو گیا کہ اسلام کے نزدیک ریاست کے تصور میں اشخاص کا معاملہ اہم نہیں بلکہ اصولوں کے نفاذ، شریعت اسلامیہ کے بقاء اور قیام کا معاملہ بہت اہم ہے نیز اسلام میں قضاۃ محکمہ انتظامیہ کی دست برد سے بالکل آزاد ہے۔

"شریعت کی سیادت کا تصور اسلام کی سیاسی زندگی کا مبدا اور منتہا ہے وہ اجتماعی زندگی جس کو اسلام پیش کرتا ہے اس کے ہر فرد کو ان تمام فرائض کی تکمیل واجب ہے جو اسلام کا نظام معاشرت (شریعت) اس پر خود عائد کرتا ہے نیز اس پر یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس

معاشرت کے دوسرے اراکین کی سرگرمیوں پر بھی نگاہ رکھے تاکہ وہ احکام شریعت کی بجا آوری میں تساہل اور تغافل کا رویہ اختیار کرنے سے مجتنب رہیں۔

اسلامی ریاست نے انسانیت کی ایک سب سے اہم خدمت یہ کی ہے کہ اس نے طبقات کی تفریق اور امتیاز (CLASS DISTINCTION) کو بالکل اڑا دیا ہے۔ قرآن نے رنگ، وطن اور نسل کو عظمت کا معیار ٹھہرانے کے بجائے تقویٰ کو شرف امتیاز بخشا ہے جو شخص اسلامی معاشرت کے قیام و بقا کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے وہی سب سے زیادہ عظمت کا مستحق ہے۔ خدمت نوع انسانی سے طبیعت علو اور بلندی کی فضا میں پرواز کر سکتی ہے۔ کوئی شخص کسی پیشہ کی بنا پر احترام یا نفرت کا مورد نہیں بن سکتا۔ اس طرح اسلام نے ایک ایسی ریاست کا تصور پیدا کیا جو کسی قبیلہ کی نہیں (NON TRIBAL) کسی نسل کی نہیں (NON - RACIAL) کسی استبداد پسند شخص کے چشم و ابرو کے اشاروں پر رقص کرنے کے لئے نہیں (NON - AUTOCRATIC) کسی مذہبی رئیس کی ہوائے نفس کا آلہ بے جان نہیں (NON - SACRDATAL) اس ریاست کی بنیاد تربیت یافتہ افراد کے عالمگیر شعور راسخ میں ہے۔ اس ریاست کا ہر رکن اپنی ذمہ داری کے احساس و شعور کو اپنا ہادی اور راہنما قرار دیئے ہوئے ہے۔

اسلام کا طرز حکومت موجودہ جمہوری مقتضیات کی روح کے عین مطابق ہے مگر اسلام کے تصور ریاست میں مغربی جمہوریت کے نقائص کا سدباب کر دیا گیا ہے اسلام کا تصور دو امور پر مشتمل ہے استقلال اور تغیر (CHANGE)

جہاں تک معاشرت کے اساسی اصولوں کا تعلق ہے وہ تو ناقابل تغیر ہیں۔ مقام تاسیس صرف جناب رسالت مآب کو حاصل تھا۔ اب کوئی طاقت نہیں جو اس مقام کی اہل ہو سکے۔ اس زاویہ نگاہ سے معاشرت اسلامیہ ایک لازوال، جاودانی، ازلی اور ابدی اجتماعی اکائی کی حیثیت

رکھتی ہے۔ دنیا کی کوئی قوت یہ حق نہیں رکھتی کہ اس اجتماعی زندگی کو مختل کر سکے۔ اس کا انہدام اس کی تخریب نہیں ہو سکتی ہے یہ ایک ایسے انقلاب کے قطعاً مخالف ہے جو اس کی اساسی زندگی کے اجزا کو منتشر کر دے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ ایک جامد نظام زندگی ہے اس میں ارتقاء کی کوئی گنجائش نہیں اگر کسی کی قوت فیصلہ اس خطا میں مبتلا ہو تو حیرت ہے اس کی عقل پر۔ اسلام نے قانون اور فقہ کے بارے میں ہمیشہ آزادانہ فکر کی اجازت دی ہے۔ اس کا اثبات اس اختلاف و نزاع سے ممکن ہے جو مختلف فقہا کے درمیان ہے لیکن باوجود اس اختلاف رائے کے ایک دوسرے سے رواداری کا برتاؤ ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت نیچے بیان کردہ تمثیل سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ انسان کا نفس باوجود جسدی تغیرات کے جو بچپن سے موت تک طاری ہوتے ہیں ایک ہی مستقل اصلیت پر رہتا ہے مگر ان جسدی تغیرات سے اس کی قوت تخلیق کا تنوع ظاہر ہوتا ہے۔ یہی حال اسلام کے مستقل اور تغیر پذیر پہلوؤں کا ہے جو معاشرت ان دونوں اصولوں کے انضمام پر مبنی نہیں وہ امن اور نجات کی راہ نہیں پا سکتی۔ اسلام نے تجدید اور تاسیس دونوں خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے مغرب کے پاس صرف تغیر پذیر عنصر ہی ہے مشرق کے پاس صرف مستقل عنصر۔ دونوں بعض میں ایک کا مرض آزادئ رائے کی لامحدودیت اور دوسرے کا مرض انجماد فکر ——— دونوں کی سیاسی اور معاشرتی امراض کا علاج اسلام ہے۔

اسلامی معاشرت کا یہ تصور جو استدلال اور ارتقاء کے اصولوں پر استوار ہے در اصل اسلام کے توحید الوہیت کے تصور ہی کی ایک نئی صورت ہے توحید الوہیت کا تصور اللہ کو ایک ایسی قوت حی و قیوم ذات کی حیثیت دیتا ہے جو ایک حیثیت سے نگاہوں کے سامنے ہے اور دوسری حیثیت سے نگاہوں سے اوجھل۔ قرآن نے ان دونوں دنیاؤں کو غیب

اور شہادت کی دنیا سے تعبیر کیا ہے یعنی عالم الغیب والشہادۃ قرار دیا ہے۔ ظاہر اور باطن۔ اوّل اور آخر کی تعبیر بھی یہی ہے۔ اس حیّ و قیوم قوت کے سوا اور کوئی طاقت اس دنیا میں کارفرما نہیں ہے۔ اس قوت کا ایک حصہ مستقل ہے دوسرا شہادت کا عالم ہے۔ یہ حصہ تغیر پذیر ہے۔ کوئی معاشرت اس وقت تک زندگی کے موانع کا مقابلہ کرنے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وہ ان دونوں اصولوں کا پیکر نہیں بن جاتی۔ اسلام نے اپنے نظام معاشرت میں یہ دونوں اصول جمع کر رکھے ہیں۔ اسلامی نظام معاشرت اسی لئے ذات باری کی خواہشات کی نیابت کرتا ہے کیونکہ اس کے تصور کی تشکیل میں وہی اصول کارفرما ہیں جن پر ایک حیّ و قیوم ذات کاربند ہے۔

ان اہم تصریحات کے بعد ہم ریاست اسلامیہ (ISLAMIC STATE) کے جزئیات پر بحث کرتے ہیں۔

اسلام نے (HEAD OF THE STATE) ریاست کے امیر کے لئے خلیفہ کی اصطلاح تجویز کی ہے خلیفہ اس لئے کہ یہ جناب رسالتؐ کی نیابت اور خلافت کا مقام ہے اس لئے اسلامی ریاست کا مقام اپنے منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے بہت اہم ہے مگر خلیفہ حکم نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک خلیفہ محض ایک فرد ہے۔ شریعت اسلامیہ کی اقدار کا نفاذ اس کا کام ہے اگر خلیفہ ان احکام اور اوامر کے نفاذ میں کوتاہی اور تساہل کا اظہار کرے تو اس کی حیثیت معرض خطر میں آجاتی ہے ملت کو جس طرح اس کے انتخاب کا حق تھا اسی طرح اس کے عزل کا بھی اس کو حق ہے۔

اسلام نے جہاں انتخاب خلیفہ کو عوام کی مرضی پر چھوڑ دیا وہاں اس نے خلیفہ کو شوریٰ اور اجماع کا پابند کر دیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اجماع اور شوریٰ کا مفہوم اس سے بہت

زیادہ وسیع ہے جہالاتِ زمانہ سے اکثر ناواقف عوام نے اس شرعی اصطلاح سے اخذ کر لیا ہے چونکہ ہر زمانہ کے مادی احوال دوسرے زمانہ سے مختلف ہوتے ہیں اس لئے ہر زمانہ کے مادی قوانین بدلتے رہتے ہیں۔ قوانین کی تشکیل و ترتیب کا معاملہ تمام تر ہر زمانہ اور دور کے نئے پیدا کردہ مقتضیات پر مبنی ہے اس لئے عہدِ صحابہؓ کے قوانین کے نقلی حصہ کو اس دور میں نافذ کرنا ایک سعی باطل ہے۔ اعتقادات کے بارے میں اجماعِ صحابہؓ ایک ناقابل انکار شے ہے مگر معاشی قوانین میں ہرگز نہیں۔ اس بارے میں شاہ ولی اللہؒ کی تصریحات غور کے قابل ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے نظریہ کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ "شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک تعلیم اور حکمت کا نبوی طریقہ یہ ہے کہ وہ شریعت جو ایک نبیؐ پر بذریعہ وحی نازل ہوتی ہے، ان لوگوں کے احوال، عادات اور خصائص کے جائزہ پر مبنی ہوتی ہے جن کی طرف یہ ارسال کی جاتی ہے۔ نبی جس کی غایت عالمگیر، جامع اور مانع قوانین کی تشکیل ہے نہ تو مختلف افراد کے لئے مختلف قوانین وضع کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کو اپنے قوانین وضع کرنے کے لئے آزاد چھوڑ سکتا ہے نبی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ افراد کی ایک خاص جماعت کو ان اصولوں کی بنا پر تربیت اور تزکیہ قلوب سے بہرہ ور کرتا ہے پھر ان کو ایک بین الاقوامی شریعت کی تشکیل کے لئے بطور ایک مبداء کے استعمال کرتا ہے اس نصب العین کے حصول کے لئے وہ ایسے اصول وضع کرتا ہے جو انسانیت کی معاشرت کے لئے اساس کا کام دیں لیکن ان کو اپنے ارد گرد کے مخصوص لوگوں پر ان کی عادات کا اندازہ کر کے نافذ کرتا ہے۔ احکام شرعیہ جو اس عمل سے پیدا ہوتے ہیں، صرف ان لوگوں کے ایک خاص گروہ تک ہی محدود ہوتے ہیں خصوصاً احکام قصاص اور دیت، اور چونکہ ان احکام کی تعمیل بذاتِ خود ایک نصب العین نہیں ہے اس لئے یہ آنے والی نسلوں میں نافذ نہیں ہو سکتے۔" یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ نے اسلام کی اس بین الاقوامی خصوصیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکثر

احادیث سے عملاً کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ حقیقت جو فقہی مسائل کے بارے میں حقیقی حالات کی آگاہی پر زور دیتا ہے اسلامی فقہ کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کے رویہ کو زیادہ واضح کرتی ہے۔ ان تصریحات سے جہاں فقہ حنفی کے اجتہادی خصائص نمایاں ہوتے ہیں وہاں یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ اجماع اور شوریٰ کا یہ مطلب نہیں کہ معاشی اور سیاسی مسائل میں ہم زمانہ کے تقاضاؤں سے آنکھیں بند کر کے قدیم اور پامال راہ اختیار کریں۔

اسلام کا قانون ہر ایک رکن ریاست اسلامیہ پر محیط ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ خلافت ہی کے منصب عالی پر متمکن کیوں نہ ہو اس بات کا اہل نہیں کہ اس کے لئے شریعت کے قانون کے نفاذ کو روک دیا جاوے۔ اسلام نے شخصی آزادی INDIWIDVAL FREEDOM کا اس وقت اعلان کیا جب اردگرد کی دنیا غفلت اور جہالت کی تاریکیوں میں سو رہی تھی۔ انفرادی مساوات کا عقیدہ اتنا شدید تھا کہ خود خلیفہ اعظم بھی بارگاہ شریعت میں ایک ادنیٰ مجرم کی حیثیت سے حاضر کیا جا سکتا تھا۔ خود جناب عمرؓ تک کو لوگ عین خطبہ کی حالت میں ٹوک سکتے تھے۔ دنیا اس وقت ارتقا اور ترقی کی ہزاروں منزلیں آگے نکل آئی ہے۔ حکمت جدیدہ نے برق اور بھاپ کی قوتوں کی امداد سے ربع مسکون کو اپنے دست تسخیر میں لے لیا ہے۔ زمین کا چپہ چپہ انسان نے چھان ڈالا ہے۔ اس کے نظر اور فکر کی دنیا بہت وسیع ہو گئی مگر اس کے دل کی دنیا زیادہ الجھن میں پھنس گئی۔ انسان اب تک آزادی رائے کی کوئی ایسی مثال قائم نہیں کر سکا۔ دنیا میں آزادی اور حریت، معاشی مساوات کے نعروں کو مختلف افراد کی حریصانہ عزائم کی تکمیل کے لئے آلہ کار بنایا گیا۔ پرانے سلطان گو مٹ گئے۔ اس لئے نہیں کہ اس سے انسانی برکت و سعادت کا آفتاب تازہ بطن گیتی سے طلوع ہو کر قلب کی دنیا کو مستنیر کرے بلکہ اس لئے

کرنے استبداد کے نفاذ و صدور کے لئے راہ صاف ہو۔ دنیا نے عقل کو پا لیا مگر دل کی کوری اس کی قیمت دینی پڑی۔ کائنات ارضی کے افراد نے ایسا سودا کیا کہ عقل اور قوت کے وصول کے لئے اس خرید و فروخت میں متاع دل غارت کر ڈالی۔ دنیا کی سیاست کی مثال اس وقت گوئٹے کے مشہور کردار فاؤسٹ (FAUST) کی ہے اس نے علم اور قوت کیلئے جنس ایمان ضائع کر دی ہے۔

"شریعت اسلامیہ کا ماخذ اور مبداء وحی اور الہام ہے۔ اسلام نے قانون کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ایک لازوال حقیقت اور جاودانی نمونہ اسوہ حسنہ کو قرار دیتا ہے۔ اس حقیقت میں ایسی بہت سی ہیئات ترکیبی شامل ہیں جو انسانی افراد کی مختلف ضروریات، مواقع، ذوقی مناسبتوں اور مزاج کو مدنظر رکھ کر بنائی گئی ہیں۔ ان معاشرت کے نظاموں کی تشکیل ان عقلمند افراد کے تعاون سے عمل میں آئی ہے جنہوں نے ان لوگوں کی رائے اور مشورہ کو کبھی ناقابل توجہ نہیں سمجھا جن کے لئے ان معاشرتوں کا وجود قوت سے فعل میں آیا ہے۔ اس معاشرت کی اساس وحی ہے جو اس کے مظاہر کی قوت اور طاقت کا باعث ہے۔ اساس وحی سے عالمگیر مذہب کا مقام تفویض کرتی ہے۔ یہی بنیاد اس کو لازوال اخلاقی اقدار سے منسلک کرتی ہے۔ اس بین الاقوامی مذہب کا نصب العین یہ ہے کہ انسانی ارادہ کو ذات باری کے ارادہ سے متصل کر دے۔ اطاعت ذات باری اسلام کے نصب العین کی تحصیل کے لئے ضروری ہے"۔

اس تصریح میں ہم نے شریعت اسلامیہ کی حقیقت اور اس سے ریاست اسلام کے ربط پر ایک روشن اور واضح بیان دے دیا ہے اب ہم اسلام کی ریاست کی دوسری سرگرمیوں کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں۔

اسلامی جہاد اور فتوحات کا مقصد جوع الارض نہیں بلکہ تذکیر ہے۔ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ٥ (الانفال) اسلام نے یورپ

کی راہ اختیار نہیں کی کہ مشرق کی وسیع و عریض سرزمینوں کو اس لیے تسخیر کیا کہ اس سے مختلف ممالک کو اپنی تجارتی لوٹ کھسوٹ کا مرجع بنائے اور اس سے استحصال (EXPLIOTATION) کی حکمت عملی کی تکمیل کرے۔ اسلام نے دوسرے ممالک کو محض اس لئے فتح کیا کہ دنیا کو ثقافت کے بلند ترین معیار سے روشناس کر دے۔ یورپ کی جدید فتوحات کا مقصد محض حیوانی جبلتوں کی تسکین ہے۔ یہ حیوانی جبلتیں یورپ کی صنعتی زندگی نے پیدا کی ہیں اور ان کی تکمیل کے لئے یورپ نے استعماری نظام (COLONIAL SPIRIT) وضع کیا ہے۔ یورپ کی تسخیر ممالک کا نصب العین ان حیوانی داعیات کی تسکین ہے۔ سرمایہ داروں کے لئے تجارتی منڈیوں کی فراہمی ہے۔ مزدوروں پر داخلی ظلم ہے اور خارجی طور پر محکوم ممالک کو ظلم و ستم کا تختہ مشق بنانا ہے مارکس نے یورپ کی معاشرت کے اس حیوانی محرک کو خوب واضح کیا ہے۔

یورپ کی استعماری تاریخ میں کوئی ایک معاہدہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس کا مقصد دنیا کو ظلم و استبداد، عصیان و طغیان سے نجات دلانا ہو۔ آپ اتحاد مقدس (THE HOLY ALLIANCE) اتحاد یورپ (THE EUROPEON CONCERT) یا (TRIPPLE ALLIANCE) اتحاد ثلاثہ کے مقاصد پر اگر ایک نظر بھی ڈالیں گے تو مغربی سیاست کا کھوکھلا پن، خود غرضی اور ہوائے نفس کا ایک ناقابل فراموش اور دردناک مرقع آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر جاوے گا۔

اسلام دنیا میں جس طرح کی عالمگیر حکومت کے قیام کا خواہاں ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

بین الاقوامی حکومت جیسا کہ اس تصور یعنی مجلس اقوام کے نظام میں ممکن ہے۔ ایک ایسی حکومت ہے جس کو وہ سب حکومتیں متفقہ طور پر تسلیم کرتی ہوں جو اس نظام میں

کی رکن ہوں یہ حکومت اراکین کی رضا پر ہے نہ کہ باہر سے نافذ کیا ہوا نظام کار۔

SCELLE THEORIE DU EFOUVE   INTERNATIONAL IN THE NEW COMMONWEALTH QUARTERLY APRIL-JUNE, 1935.

اسلام دنیا میں اس قسم کی بین الاقوامی حکومت کے قیام کا خواہش مند ہے یعنی یہ کہ انتظامی سہولتوں کے لئے مختلف ممالک کو داخلی آزادی ہوگی۔ پھر ان تمام آزاد ریاستوں کو ایک بین الاقوامی نظام میں منسلک کر دیا جاوے گا۔ اس نظام عمل میں داخلہ ہر وفاقی جز (FEDERAL UNIT) کی اپنی رضامندی پر ہوگا۔ تمام ریاستوں میں معاشرت کا اسلامی تصور رائج ہوگا

شریعت اسلامیہ کے قانون میں اتنی لچک ہے کہ اسے زمانہ کی ضروریات کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت کہ اسلامی فقہ میں لچک اور قوت توافق (POWER OF ADAPTIBILITY) اس حد تک موجود ہے کہ یہ مختلف زمانوں کے داعیات اور مختلف لوگوں کی ضروریات کی تکمیل کر سکتی ہے اسلامی نظام میں قانون سازی کے امکانات کو خوب واضح کرتی ہے گویا اسلامی نظام زندگی میں ارتقاء اور ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

اگر یہ ایک حقیقت ہے کہ شریعت اسلامیہ اور فقہ میں ارتقاء اور ترقی کی بہت گنجائش ہے تو پھر عالم اسلام کے موجودہ جمود فکر کے اسباب کیا ہیں۔ اس زاویہ نظر کی تخلیق کا کیا سبب ہے جس نے بہت عرصہ سے عالم اسلامی کی فکری اور عملی حالت کو تعطل کی حد تک پہنچا دیا ہے اس کے تین بڑے اسباب ہیں (۱) اعتزال (۲) رہبانیت (۳) سقوط بغداد

فقہ اسلامیہ کے تعطل پر کسی اگلے باب میں بحث کی جائے گی۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا سے بہت مستحسن سلوک کیا گیا۔ غیر مسلموں کو ثقافت اور

روایات کے تحفظ کی پوری آزادی تھی۔ ایک غیر مسلم ذمی کا خون بھی اتنا ہی قیمتی تھا جتنا ایک مسلمان کا ہو سکتا ہے۔ اسلام کے نزدیک اقلیت اور اکثریت کا تصور تعداد اور تناسب آبادی پر نہیں بلکہ اسلام کے نزدیک ثقافتی تفوق اس شے کا فیصلہ کرتا ہے بکفر مغلوب ہے۔ اسلام کے تصور میں اتنا اچھا سلوک روا رکھنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اس حسن سلوک کا انجام اس غیر مسلم عناصر کے معاشرت اسلامیہ میں انضمام پر ہوا ہے۔

غیر مسلم عناصر کو عسکری اور فوجی خدمت سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا تھا۔ اس حفاظت کے عوض میں جو سہولیات اسلامیہ غیر مسلموں کو مہیا کرتی تھی۔ ان سے ایک نہایت معمولی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اس ٹیکس کو شرعی اصطلاح میں جزیہ کا نام دیا گیا ہے۔ یورپ کے اکثر مصنفین نے جزیہ کو ایک نہایت خوفناک شے قرار دے لیا ہے جب کبھی یورپ نے دنیا کو اسلام کے مظالم کا افسانہ سنایا ہے تو جزیہ کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا ہے مگر اس کی حقیقت صرف اتنی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔

اسلام کی معاشی حکمت عملی یہ ہے اس کو نہ ہم اشتراکی کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں اور نہ قسطلائی قرار دے سکتے ہیں۔ نہ ہی اس کو ہم سرمایہ دارانہ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف اسلامی ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام دولت کے اکتناز اور ارتکاز کے سخت مخالف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (التوبہ)

"اے لوگو بہت سے علماء اور راہبان ایسے ہیں جو لوگوں کا ناحق مال کھاتے ہیں اور لوگوں کو راہ حق سے روکتے ہیں۔ نیز

و سونا اور چاندی ڈھیروں کی صورت میں جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرتے تو انہیں دکھ
ے عذاب کی بشارت دے جس دن وہ خزانہ دوزخ کی آگ میں تپایا جاوے گا پھر ان کی پیشانی، کروٹوں
ہیں اس سے داغ دیئے جاویں گے اور ان سے کہا جاوے گا کہ یہ تمہارا خزانہ ہے جو تم نے اپنی جانوں کے
یا تھا، پس اپنے خزانے کا مزہ چکھو۔"

بات مندرجہ بالا سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے۔

الف) اسلام کے نزدیک خدمت کے لئے معاوضہ کی طلب، یا مذہب کو آڑ بنا کر طلب زر
ہے۔

ب) اسلام دولت کے انقسام اور انفاق کا حامی ہے۔ اسلام اس کو نہایت حقارت
تا ہے کہ چند اشخاص کے پاس نقد دولت کے انبار، مال کے خزائن (HOLD RESER..ES)
باقی افراد فاقہ کشی کر رہے ہوں۔ دولت اور زمین ذات باری کی امانت ہے اس کو صرف
رضی کے مطابق صرف کرنا چاہئے جو اس امانت کا مالک ہے گویا اسلام دولت اور قوت
کے لئے انسان کو ترغیب دیتا ہے مگر اس دولت اور قوت کے صرف کرنے کا اس کو ذاتی
ی حق حاصل نہیں۔ اس بارے میں اختیار و تصرف صرف نوامیس شریعت کو ہے گویا اسلام
ادیات کو بھی انسان کے اخلاقی داعیات کی تکمیل کا ایک جزو بنا دیا ہے۔ اسلام کے نزدیک
ات بھی انسان کی شخصیت کے ارتقاء میں ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے
اشی سرگرمیوں کو بھی شریعت کی حد بندیوں میں جکڑ دیا گیا ہے۔

ج) اسلام انفرادی ملکیت کا حق ضرور دیتا ہے لیکن ملکیت کے استعمال کا حق اس نے
مک شریعت کی مرضی کے تابع کر دیا ہے۔ اسلام میں ایک شخص کروڑہا روپیہ کی جائداد پہ
اور تصرف رکھ سکتا ہے مگر اس روپیہ و جائداد کا ایک معمولی سے معمولی حصہ اور جزو بھی اپنی مرضی

تصرف نہیں کر سکتا۔ اس بارے میں اس کو اسلامی ریاست کے احکام کا اتباع ضروری ہے۔

اسلام اور اشتراکیت کے درمیان ایک سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اسلام کے درمیان اختلاف معیشت فکر و عمل کا اختلاف و تنوع قدرتی ہے اور یہ فطرت انسانی کا ایک لاینفک خاصہ ہے اس سے انسان کی شخصیت کی تربیت میں بہت مدد ملتی ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک رزق یا دولت کی کمی بیشی مصنوعی ہے اور یہ معاشرت کی پیدا کردہ ہے۔ اب ہم اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

(۱) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ۝ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝ (الحجر)

"قدرت الٰہی کی نشانیاں دیکھو کہ ہم نے تمہارے لئے اس میں روزیاں پیدا کیں اور جن کے لئے تم روزی دینے والے نہیں اور کوئی چیز نہیں کہ جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور ہم اسے مقررہ اندازے پر اتارتے ہیں۔"

ان آیات سے ثابت ہو گیا کہ انسان کے رزق پر ذات باری کو مکمل قبضہ اور تصرف ہے۔ نیز انسان کی ربوبیت کے لئے ذات باری نے ہر شے کے لامحدود خزانے جمع کر رکھے ہیں۔ ہر شخص کو اس کی صلاحیت اور ذات باری تعالیٰ کی ابدی مشیت کے مطابق رزق دیا جاتا ہے۔ انسان کے بارے میں ذات باری کی مشیت یہ ہے کہ مال و دولت کو وہ ایک امانت تصور کر کے اس کو اس کے مالک کی مشیت کے مطابق صرف کرے۔ اسے اپنے ذاتی قبضہ اور تصرف کی چیز نہ خیال کرے۔

قرآن کے نزدیک زندگی کا منشاء انسانی شخصیت کی تربیت ہے۔ قرآن نے جابجا انسان کو عالم النفس و عالم آفاق پر تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شخصیت کی تربیت ماحول سے الگ ہو کر نہیں ہو سکتی بلکہ فرد کی تشکیل ذات باری کے قوانین کے مطابق تکمیل میں ہے۔ قرآن نے اقتصادی اور معاشی زندگی کو بھی اس ماحول کا ایک

جزو قرار دیا ہے جو انسان کی آزمائش کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لئے اقتصادی زندگی کے عدل اور توسط کو بھی اس نے شخصیت کے ترفع کا ایک زینہ قرار دیا ہے۔ قرآن کے نزدیک ہر عمل کے خیر و شر کا معیار تزکیہ ذات ہے اور دولت کا مناسب استعمال بھی اس تزکیہ قلب کا ایک وسیلہ ہے۔

(۲) فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ۝ إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝ (الکہف)

"اور شاید تو برائے افسوس ان کے پیچھے اپنی جان گھونٹ کر مرے گا کہ وہ اس حدیث پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ زمین پر ہے ہم نے زمین کی رونق کے لئے بنایا ہے تاکہ اہل دنیا کو آزمائیں کہ ان میں سے کون نیک کام کرتا ہے۔"

ان آیات سے ثابت ہوگیا کہ اختلاف فکر و عمل اس لئے ہے کہ اس سے انسان کی آزمائش ہو جاوے۔ قدرت نے ہر شخص کو صلاحیت کار و استعداد عمل مختلف دی ہے۔ یہ اختلاف و تنوع اس لئے ہے کہ اس سے انسان کی آزمائش ہو جاوے۔ زندگی ایک امتحان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر شخص کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس مہلت عمل میں خیر کی راہ اختیار کرے یا شر کی۔ اگر یہ اختلاف معیشت جو انسانی ارادہ و تصرف کے اختیار و آزادی سے پیدا ہوا ہے نہ ہوتا تو انسانی ہستی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

(۳) وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ (البقرہ)

"اس پر ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے نیچے اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو یعنی یہ کہ تم کو اختیار ہے کہ تو یا ارضی میں کفر اختیار کرو یا ایمان۔ اس اختلاف راہ سے عداوت کا پیدا ہونا لازمی ہے تمہیں دنیا میں ایک مدت مقررہ تک ٹھہرنا ہوگا اور کام چلانا ہوگا۔"

اب اسی موضوع کی ایک دوسری آیت پر بھی غور کرو۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (البقرہ)

"پھر ہم نے ان سب کو کہا کہ یہاں سے باہر نکلو اگر میری طرف سے تم پر کوئی ہدایت نازل ہو تو اس کا اتباع کرنا۔ یہ راہ ہی اچھی ہوگی۔ اس سے خوف اور حزن کا زوال ہوگا۔"

ان آیات سے ثابت ہو گیا کہ کفر اور ایمان کی عداوت نے انسانوں کو جو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا ہے وہ اس تقدیر کا لابدی نتیجہ ہے جو ذات باری نے انسان کے لئے مقرر کی ہے۔ وہ تقدیر آزمائش حیات ہے۔ پھر یہ بھی بتلا دیا کہ یہ ارضی زندگی مہلت عمل ہے۔ اس زندگی کو قرآن نے مہلت عمل سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تصور آخرت کے اثبات کے لئے بہت اہم ہے۔

(۴) وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (النحل)

"اگر یہ ذات باری کو منظور ہوتا تو تم کو ایک واحد امت بنا دیتا۔ (یعنی یہ اختلاف و نزاع حق و باطل پیدا ہی نہ ہوتا۔ اختیار و تصرف کا معاملہ ہی نہ ہوتا) لیکن ہدایت و ضلالت کے بارے میں ذات باری کی مشیت کو یہی منظور ہوا۔ نیز اس لئے کہ تم سے پوچھا جاوے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔"

ان آیات سے ثابت ہو گیا کہ ہدایت و ضلالت کے بارے میں ذات باری نے انسان کے لئے تذکیر و موعظت کی راہ اختیار کی ہے۔ یہ زندگی آزمائش کی ایک مہلت ہے۔ اس کے نتائج تمام و کمال یہاں ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے آخرت کی زندگی ہے۔ انسانوں کی تفرق و انتشار کا باعث اختیار و تصرف کا بیجا و بے جا استعمال ہے۔ ہدایت و ضلالت کی راہ کو اختیار کرنے کا معاملہ تمام تر انسان کی مشیت پر ہے۔

(۵) اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ط اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ
خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ٥ (بنی اسرائیل)

"رزق کے بارے میں تنگی اور فراخی اللہ ہی کا کام ہے۔ وہ اپنے بندوں کو دیکھتا اور ان کی خبر رکھتا ہے۔"

ان تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ رزق کے تقسیم کرنے میں قدرت بہت دیکھ بھال سے کام لے رہی ہے۔ نیز روزی کی کمی بیشی میں اس کے خاص قوانین کارفرما ہیں۔ یہاں یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ شریعت کے مقاصد کی تکمیل میں معاشی مسائل کی کتنی اہمیت ہے۔

(۶) وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ٥ (النحل)

"اور اللہ نے تم میں سے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے۔ جنہیں فضیلت ملی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو نہیں دیتے کہ وہ سب رزق میں برابر ہو جاویں پس کیا وہ اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔"

اس آیت سے اسلام کی اقتصادی حیثیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اسلام کے نزدیک رزق معاش کے لئے ہر شخص کی صلاحیتیں مختلف ہیں لیکن جو دولت یا قوت انسان ان قدرت کی عطا کردہ قوتوں سے پیدا کرتا ہے اس کو صرف کرنے کا معاملہ تمام تر شریعت کی مشیت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ شریعت ایک ایسا نظام زندگی ہے جو تمام اراکین ریاست کے نان ونفقہ کی ضرورتوں کی کفالت کے لئے ہے۔ اس اسلوب فکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے فرد کی تخلیقی قوت کے ابھرنے کا بھی پورا موقع مل جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے سوسائٹی کے پسماندہ طبقات کی پرورش بھی ہو جاتی ہے۔ یہ تصور اشتراکیت سے زیادہ مناسب اور احسن ہے کیونکہ اشتراکی نظام عمل میں فرد کی آزادی پامال ہو جاتی ہے۔ ایک طبقہ کی آمریت بھی منظم استبداد ہے پھر اس

قسم کا شدید نظام سیاست زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا۔

اگر دنیا اپنے اقتصادی نظام کا رخ کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لے تو اس سے معاشرت کی بہت سی کمزوریوں کا سدِّباب ہو سکتا ہے۔

اب ہم ریاست اور مذہب کے (STATE AND RELIGION) فرق پر غور کرتے ہیں اسلام کے نزدیک سیاست اور مذہب میں عضوی لحاظ سے کوئی اختلاف نہیں گو تفاعل کے (FUNCTION) لحاظ سے ہے۔ اسلام کے نزدیک مذہب اور سیاست میں کامل اتحاد ہے بلکہ دونوں ایک ہی وحدت میں منضم ہیں۔ گویا اسلام ریاست ہے اور ریاست اسلام ہے۔ اسلامی ریاست میں سیاست ایک ایسا عضو ہے جو مذہب سے مل کر ایک وحدت کی تشکیل کرتا ہے۔

ریاست اور مذہب کی تفریق عیسائیت سے ہوئی جب روما میں عیسائیت کی اشاعت ہو رہی تھی تو اس وقت عیسائیت کی حیثیت ایک تبلیغی نظام کی تھی۔ اس نے کوئی سیاسی ذمہ داری قبول نہ کی تھی جب اطالیہ اور رومن امپائر میں عیسائیت کا دور دورہ ہو گیا تو ریاست اور سیاست کی زمام اقتدار اسی پرانے نظام پر تھی۔ چرچ کی خواہش یہ تھی کہ سیاست و سیادت کی قبا بھی اسی کو تفویض ہو۔ اس کے برعکس پرانے نظام کے حامی اس منصب سے مفارقت کب گوارا کر سکتے تھے اس نے اختلاف و نزاع کی ایک غیر مختتم صورت اختیار کر لی اور لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ نیز ان کا دائرہ عمل بھی جداگانہ ہے۔

اس تفریق کو جسد اور روح کی بحثوں نے اور زیادہ ہوا دے دی۔ ڈیکارٹ (DESCATES) نے روح اور جسم کے علیحدہ علیحدہ وجود کو تسلیم کیا۔ لائبنز (LIELINITZ) نے بھی اس تفریق کو جائز رکھا۔ ہابس (HABDES) نے روح کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔ اس طرح گویا اس نے

جدید دہریانہ ذہنیت کی بنیاد ڈال دی۔ اسلام اس طرزِ فکر کا سرے ہی سے منکر ہے۔ اسلام کے نزدیک روح ذات باری کی ایک تخلیقی اور محرک عالی قوت

یا امر ہے۔ اس کا تزکیہ جسم ہی کی آزمائش و ابتلا میں ہے۔ جسم اور روح ایک ناقابل تفریق وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ روح اور جسم کا فرق غیبت اور شہادت، غیر محسوس اور محسوس، باطن اور ظاہر کا فرق ہے۔ روح کی تربیت اور تزکیہ مادی اشیاء ہی کے مناسب استعمال میں ہے۔ عالم انفس اور آفاق ہی میں ہے۔ مذہب معاشرتی زندگی کو دیکھنے اور اس کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا ایک نیا اسلوب فکر و عمل ہے کسی کام کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے کے لئے صرف ذہن و عمل کی خاص حالت ہی معیار ہو سکتی ہے۔ اس لئے مذہب اسلامی ریاست کا کوئی علیحدہ جزو نہیں بلکہ اسلامی ریاست تمام و کمال اپنے اسلوب فکر و عمل میں دینی اور مذہبی ہے

اب ایک نظر ہم خلافت راشدہ کے بعض خصائص پر ڈالتے ہیں کیونکہ خلافت راشدہ اسلام کے سیاسی تصور کا ایک اسوۂ حسنہ تھی۔ خلافت راشدہ میں دین اور دنیا، مذہب اور سیاست کی کوئی تفریق ممکن نہ تھی جو لوگ خلافت اور سیادت پر مسند نشین تھے وہی مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے مسائل میں اجتہاد اور تفقہ کا کام سرانجام دیتے تھے۔ مذہب کے لئے ریاست سے علیحدہ کوئی محکمہ نہ تھا۔ اس لئے ریاست اور مذہب میں اختلاف و نزاع کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ریاست کا ہر کام مذہبی تھا۔ مذہب صرف وہ اسلوب فکر و عمل تھا جو ریاست کے ہر رکن اور عضو میں کارفرما تھا۔ نہ یورپ کی غیر محدود آزادانہ فضا تھی اور نہ اس دور کی وہ آزادی تھی جو حد اعتدال سے تجاوز کر چکی ہے اور نہ مشرق کا جمود فکر اور ذہنی تعطل تھا۔ ہر شے متحرک تھی مگر یہ نہیں کہ حرکت کا کوئی اصول کار ہی مقرر نہیں۔ اسلام کا سب سے بڑا احسان دنیا پر یہ ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کی حرکت کے لئے ایک اصول کار متعین کر دیا ہے۔ قرآن نے جہاں ایک مستقل معاشرت کا تصور پیدا کیا وہاں

اس نے اس معاشرت کو جمود اور تعطل سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی مناسب سامان کر دیئے اس نے اجماع اور شوریٰ کو بھی نافذ کر دیا تاکہ اس سے اجتہاد فکر کی قوت برقرار رہے۔ اسلامی ریاست کے ہر فرد کو احتساب کا حق دیا گیا۔ لوگ اپنے امیر سے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کر سکتے تھے۔ اس طرح گویا اسلام نے سب سے پہلے ذمہ دار حکومت RESPONSIBLE GOVERNMENT کی بنیاد ڈالی۔ اسلام کی طرز حکومت وفاقی تھی۔ ہر صوبہ اندرونی معاملات میں آزاد تھا گویا یہ دور حکومت صحیح معنوں میں مجلس اقوام کی ساخت و ترکیب کا ایک حقیقی ڈھانچہ تھا مگر افسوس کہ یہ روح زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکی اور دنیا اس کے فوائد سے بہت جلد محروم ہو گئی۔

اب ہم ان مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو عصر حاضر میں اسلامی ریاست کو درپیش ہیں۔ اس وقت ممالک اسلامیہ میں صرف ترکی ہی صحیح معنوں میں زندہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کو موجودہ دور کی مشکلات کا صحیح احساس ہے اس لئے گو اس کی سیاست بعض اوقات اعتدال سے آگے گزر جاتی ہے مگر جذبہ اصلاح جو اس کی پشت پر ہے اس کے اخلاص سے انکار ممکن نہیں۔

ترکوں نے ریاست کی اصلاح میں سب سے بڑا قدم یہ اٹھایا ہے کہ انہوں نے خلافت اسلامیہ کی تنسیخ کر دی ہے۔ ترکوں کا دعویٰ ہے کہ خلافت متعدد آدمیوں کی منتخب مجلس کو بھی تفویض کی جا سکتی ہے۔ ترکوں کا یہ اجتہاد اسلام کی روح کے عین مطابق ہے ترکوں کے اس اجتہاد فکر کو سمجھنے کے لئے ہم مقدمہ ابن خلدون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے خلافت عمومی کیلئے تین آراء پیش کی ہیں

(۱) عالمگیر خلافت ایک روحانی ادارہ ہے اور یہ ایک لاینفک جزو ایمان کی حیثیت رکھتا ہے

(۲) خلافت کا معاملہ تمام و کمال مصلحت وقت کی ایک چیز ہے۔

(۳) اس ادارہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

تیسری رائے خوارج کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے پہلی رائے چھوڑ کر دوسری رائے

اختیار کرلی ہے۔ ترکوں کا یہ کہنا ہے کہ سیاسی نظام کار کی تشکیل میں ماضی سے بصیرت حاصل کرنی بھی ضروری ہے۔ ترکوں کے نزدیک خلافت اس وقت تک ایک زندہ تصور تھی جب سلطنت اسلام برقرار تھی اب چونکہ اس سلطنت کے ٹکڑے ہوچکے ہیں اور ہر ملک میں وطنی اور مقامی رجحانات زیادہ تیز ہیں۔ اس لئے خلافت اتحاد اسلامیہ کے لئے ایک قابل عمل شئے نہیں بن سکتی پھر خلافت کی وجہ سے ایران اور ترکی کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے ہیں۔ ترک و عرب کی نزاع کا سبب بھی خلافت ہی تھی۔ مرکو نے اسی بنا پر ترکوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھا ہے۔ ترک کہتے ہیں کہ اس چیز سے نجات ہی کیوں نہ حاصل کرلی جاوے۔ یہ طرز فکر اسلامی اجتہاد کے خلاف نہیں گو یہ ایک شکست خوردہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے کیونکہ اس سے قبل قاضی ابوبکر نے تجربہ و مشاہدہ کے حقائق کو مد نظر رکھ کر خلافت کے لئے شرط قرشیت کو ترک کر دیا۔ ابن خلدون نے بھی یہی رائے دی اس کا کہنا ہے کہ چونکہ اب قریش کی سیادت ختم ہو چکی ہے اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ سب سے طاقتور آدمی کو خلافت و امامت تفویض کر دی جاوے۔ جدید ترکی کا بھی یہی رجحان ہے۔

اب چونکہ ممالک اسلامیہ میں وطنی رجحانات ترقی پذیر ہیں۔ اس لئے بہترین طریقہ یہی ہے کہ اتحاد اسلامی کے قیام کے لئے اس وقت تک ہر ملک اپنی داخلی مشکلات کے حل کرنے میں لگ جاوے جب تک کہ مغربی ملوکیت کا خطرہ اسلام کے سر پر معلق ہے اس خطرہ کے دور ہوجانے کے بعد ممالک اسلامیہ ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہوسکتے ہیں یہ خیال ترکی کے وطن پرست سیاستدان ضیا کا بھی ہے۔

" اسلامی ممالک میں حقیقی اور موثر سیاسی اتحاد پیدا کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ سب سے پہلے تمام اسلامی ممالک آزادی حاصل کریں۔ پھر وہ ایک ملک کو خلافت و سیادت کی ذمہ داری سونپ دیں۔ کیا اس وقت یہ چیز ممکن ہے؟ اگر اس وقت نہیں تو ایک وقت یہ ممکن ہو جاوے گی۔ اس عرصہ میں خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ اپنے گھر کی اصلاح کی طرف لگ جاوے اور ایک جدید

ریاست کی تشکیل کا سنگ بنیاد رکھے"۔

بین الاقوامی دنیا میں غریب اور ضعیف کے لئے کوئی ہمدردی نہیں۔ صرف طاقت ہی پرستش ہوتی ہے"۔

اس خیال کو ہم بالکل صحیح خیال کرتے ہیں۔ گو ضیا کے بعض دیگر غیر معتدل افکار سے ہم موافقت نہیں کر سکتے۔

علامہ اقبال ان رجحانات کے متعلق فرماتے ہیں۔

"اس وقت ہر مسلم قوم کو اپنی اندرونی صلاحیتوں کا جائزہ لینا چاہئے اور عارضی طور پر صرف اپنی ہی حدود تک محدود رہنا چاہئے حتیٰ کہ تمام اقوام اتنی قوت اور سیادت کی مالک ہو جاویں کہ ان سے جمہوریتوں کا ایک زندہ گھرانہ پیدا ہو سکے۔ صحیح اور حقیقی اتحاد خلافت کے کسی برائے نام نشان سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس کی حقیقی نمود آزاد اکائیوں کے ایسے تنوع میں ہے جن کے درمیان رشتہ اتحاد ایک روحانی نصب العین کی وحدت ہو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ اسلامی ممالک کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اسلام نہ ملّیت کا حامی ہے اور نہ ملوکیت کا۔ اس کا مطمح نظر ایک ایسی مجلس اقوام کا وجود ہے جو عارضی حدود اور نسلی امتیازات کو تعارفی آسانیوں کے لئے تو تسلیم کرتی ہے مگر اس کے ارکان کے معاشرتی مطمح نظر کو محدود کرنے کے لئے ہرگز قبول نہیں کر سکتی"۔

ترکوں نے خلافت عثمانی کی تنسیخ سے کوئی ایسا عمل سر انجام نہیں دیا جو اسلام کی اجتہادی روح کے مخالف ہو مگر ترکوں نے معاشرتی اصلاح کے بارے میں واقعی حق و ثواب کی راہ سے انحراف کیا ہے۔ اس بارے میں ہم علامہ اقبالؒ کی رائے نقل کرتے ہیں۔

"سوئٹیزرلینڈ کا مجلسی قانون نافذ کر کے جس میں وراثت کے قوانین بھی شامل ہیں ترکوں

نے ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ اسلوب عمل شباب زدہ جذبہ اصلاح کا پیدا کردہ ہے۔ نیز یہ طریق کار ایسے لوگوں میں قابل معافی ہے جو ترقی اور تجدد کے لئے اپنے سینوں میں زبردست تڑپ رکھتے ہوں۔ طویل المدت رہبانیت کی حکومت و سیادت سے آزادی پر جو مسرت پیدا ہوتی ہے اکثر اوقات یہ ایک قوم کو نا آشنا راستوں پر لے جاتی ہے مگر ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کو ابھی اسلامی قانون وراثت کے ان اقتصادی محاسن سے آشنائی نہیں ہوئی جو ان کے مر کے نزدیک اسلامی فقہ کا سب سے زیادہ زرخیز اور تخلیقی گوشہ ہے"۔

ان مسائل کے بعد ہم پھر ایک بار اسلامی ریاست کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اسلامی ریاست کا نظریہ جدید سیاسی اصطلاح میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"اسلامی ریاست اپنی حقیقی صورت میں حریت اور تحکم کے اصولوں کے درمیان اتحاد اور مصالحت کا نام ہے۔ اسلام نہ استبداد کو برداشت کر سکتا اور نہ حد درجہ کی بڑھتی ہوئی آزادی سے اس کو مناسبت ہے نہ اسلام اشتمالی ہے اور نہ آمرانہ بلکہ اسلامی ریاست ان تمام عناصر کا بہترین اور صالح ترین مرکب ہے۔ ان متضاد اصولوں کی یہ ابدی مصالحت اور اتحاد ایک پائدار حکومت کے قیام اور عملی جمہوریت کے نفاذ کے لئے بہت ضروری ہے۔ یہ اسلوب کار ایک الہامی قانون کی سیادت ہی سے قائم رہ سکتا ہے ایسی ریاست کی تمام پارٹیاں اگر پارٹیاں ہوں خواہ وہ حکومت والی پارٹی ہو یا مخالف، قانون کی حدود میں رہ کر کام کرتی ہیں"۔

اسلامی ریاست کی خارجی سیاست کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل تصریح کو یاد رکھو۔ یہ مسٹر برائس (BRYCE) کی کتاب بین الاقوامی تعلقات (INTERNATIONAL RELATIONS) کے صفحہ (۲۰۰-۲۰۱) سے ماخوذ ہے مسٹر برائس لکھتے ہیں -

" ریاست کو دوسری ریاستوں کو فریب دینے کی سعی نہ کرنی چاہیے۔ نہ اس کو وہ ذمہ داریاں اٹھانے کا کفیل بننا چاہیے جو یہ اٹھا نہ سکتی ہو"۔

" اس کو اپنا اعتماد نہ کھونا چاہیے"۔

" اس کو اپنے قرب وجوار کی مملکتوں پر بلا سبب ظلم وستم کے جذبات کی تسکین کے لیے حملہ آور نہ ہونا چاہیے"۔

" اس کو دوسرے ملکوں میں سازشیں کرنے سے مجتنب رہنا چاہیے۔ نہ دوسرے ملکوں میں فتنہ وفساد کو اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے برپا کرنا چاہیے"۔

" اس کو ظلم وستم کے اعمال اور کارروائیوں میں دوسری ریاستوں کی پیٹھ ٹھونکنے سے اجتناب کرنا چاہیے"۔

" اس کو جب کہ دشمن نے ریاست کی قوت عسکری پامال کر دی ہو۔ تعدی اور ظلم کرنے سے اس غرض کے لیے کہ اس سے اس کے ہوس انتقام کی تسکین ہو اجتناب کرنا چاہیے انتقام جائز حدود میں ایک آدمی کی عزت نفس کے لئے اچھا عمل ہے۔ ریاستی معاملات میں حد درجہ مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے قضیہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اور مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے تاوان اور زر فدیہ کا عائد کرنا نقصانات کی تلافی کے لئے مناسب ہے مگر اس کی فراہمی اور وصولی کا کام عدالتوں کا کام ہے لیکن اس بارے میں عفو ودرگزر بہترین راہنما ہے۔ انتقام یہاں سودمند نہیں"۔

سطور بالا میں جو تحریر کیا گیا ہے اسلامی ریاست کی خارجی حکمت عملی کے بھی تقریباً وہی اصول ہیں۔ اس بارے میں ہم اس وقت خوف طوالت کے باعث کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے سے قاصر ہیں۔

ان سطور کو پڑھئے اور پھر ایک نگاہ اس پر ڈالیے جو اس وقت یورپ کی خارجی سیاست کر رہی ہے۔ سازش وہاں ہے۔ فریب وہاں ہے۔ دوسری حکومتوں کی لوٹ کے منصوبے وہاں باندھے جا رہے ہیں۔

اس موضوع کو ہم ایک آخری تصریح کے بعد ختم کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی غائت کیا ہے (THE END OF THE ISLAMIC STATE) اس بارے میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ اسلام کے نزدیک ریاست بذات خود نصب العین (STATE AS AN END IN ITSELF) نہیں ہے بلکہ ریاست کی غایت ملت اسلامیہ کی معاشرتی زندگی کا قیام و بقاء ہے جس کو شریعت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں عبدالوہاب خلاف نے اپنی کتاب السیاستہ الشرعیۃ، عربی (صفحہ ۱۰ سے ۳۴ تک) میں بہت روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"ریاست اسلامی کا پیش نہاد انسانیت کو ایک ایسے نظام معاشرت کی تشکیل میں مدد کرتا ہے جو ایک روحانی محرک وحدت (SPIRITUAL DEFNONIC ENTITY) ہو۔ اس کا مقصد کائنات کی تسخیر اور انسانیت کی اصلاح ہے۔"

ملفوظات علامہ اقبالؒ

(مرتبہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

مَیں نے سوال کیا۔ جمہوریت کے متعلق اسلام نے کیا تعلیم دی ہے؟

علامہؒ نے فرمایا:

جمہوریت کا لفظ اصطلاح جدیدہ ہے۔ اسلام نے نظام حکومت کو شوریٰ سے تعبیر کیا ہے اور افسرِ اعلیٰ کا نام امیر ہے چنانچہ خلفائے راشدین کو امیر المؤمنین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ امیر کے لئے شرط مقدم یہ ہے کہ وہ اسلام کی حمایت کرے چونکہ اسلام نے نسبی امتیازات مٹا دیئے اس لئے ہر شخص خواہ وہ حبشی ہو یا قریشی مسلمانوں کا امیر ہو سکتا ہے۔

آج کل "IN EUROPE, DEMOCRACY IS THE ARISTOCRACY OF THE ORATORS, AND IN THIS COUNTRY (INDIA) DEMOCRACY IS BEAURUCRACY IN DISGUISE"

جمہوریت کی روح مشورہ ہے اور اسلام نے اسی چیز کو اختیار کیا۔ "وشاورھم فی الامر"

"ISLAM CREATED THE DEMOCRATIC SPIRIT AND "SHURA" IS THE METHOD"

اسی لئے اسلام نے وحی کو بند کر دیا کیونکہ آنحضرتؐ کے بعد ہم کسی انسان کے سامنے

THE CLOSING OF THE WAHY WAS ABSOLUTELY نہیں کرسکتے SURRENDE
NECESSARY FOR THE FREEDOM OF THE INDIVIDUAL. ISLAM
EMPLOYED THE FOLLOWING MEANS TO ACHEIVE THIS EN

1. ABOLITION OF POLITICAL DESPOTISM.
2. ABOLITION OF RELIGIOUS DESPOTISM.
3. ABOLITION OF PRIESTHOOD.
4. ELECTION OF THE "AMEER"

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا گویا انفرادی ذمہ داری کا اعلان ہے
تزر وازرۃ وزر اخری - امارت، مثل نکاح کے،

IS A CONTRACT BETWEEN THE AMEER AND THE PEOPLE

امۃ المسلمین نے کہا کہ تم مفصلہ ذیل شرائط کی پابندی کرو۔ اگر امیر ان کو منظور کرے تو وہ
مسلمانوں کا امیر بن سکتا ہے۔

WE HAVE THE RIGHT TO REBEL AGAINST THE اسی لئے
AMEER, IF HE DOES NOT ACT IN ACCORDANCE WITH THE SHARIA

موجودہ جمہوریت میں آپ لوگوں کو فریب دیتے ہیں کہ تم RULE کر رہے ہو۔ حالانکہ حقیقت
یہ ہے کہ موجودہ جمہوریت چند EXPERTS کی حکومت ہوتی ہے اور وہ سب ایک PRIME
MINISTER کے ماتحت ہوتے ہیں۔ LLOYD GEORGE RULES OVER
ENGLAND DURING THE GRET WAR.

اسلامی جمہوریت میں داخلہ کی شرط کلمہ طیبہ ہے "KALIMA IS THE FRANCHISE

وحی بند کرنے کا فلسفہ THIS WAS DONE IN ORDER TO TEACH MUSLIMS SELF LEGISLATION BASED UPON BROAD PRINCIPLES OF THE QURAN.

PUT TOGETHER THRE FRAUDS AND YOU GET THE INDIAN NATIONAL CONGRESS.

1. HARIJAN MOVEMENT.

2. INDIAN NATIONALISM.

3. RUSSIAN SOCIALISM.

اسلام میں شیخ الاسلام کو حق حاصل ہے کہ اگر امیر کسی معاہدہ کی خلاف ورزی کرے تو اسے معزول کر دے یا اس کی معزولی کا اعلان کر دے۔

تاریخ اسلام سے جمہوری روح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں مثلاً عبدالرحمٰن ثالث کو نماز جمعہ MISS کرنے پر قاضی نے برسرِ منبر سرزنش کی۔

الماوردی اور سیاست نامہ نظام الملک کا مطالعہ اس سلسلہ میں مفید ہوگا۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طرزِ حکومت کا CYCLE چلتا ہے۔

پہلے AUTOCRACY شروع ہوئی جب لوگ اس سے تنگ آ گئے تو REPUBLIC ہو گئی۔ آخر میں آمریت DICTATOR SHIP نمودار ہو گئی وغیرہ وغیرہ چونکہ طرزِ حکومت کوئی مستقل چیز نہیں اس لئے اسلام نے کسی خاص طرز کو RECOGNISE نہیں کیا لیکن

جو چیز ضروری ہے وہ بنیادی یعنی طرز حکومت کچھ ہو، شوریٰ ضروری ہے جس طرز حکومت میں شوریٰ نہ ہو وہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے مذموم ہے۔

اس سلسلہ میں تین سکول قابل مطالعہ ہیں:۔

۱۔ حنفی HANAFI

۲۔ شیعہ SHIA

۳۔ خوارج KHWARIJ

(۵)

عربی ریڈریں

عربی زبان کو مقبول عوام کرنے کے لئے ہم جو جدوجہد کر رہے ہیں وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ آسان اور جدید عربی زبان میں ہم نے عربی سیکھنے والوں کے لئے ریڈروں کا سلسلہ القراءۃ الاعظمیہ کے نام سے چھپوانا شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی دوسری۔ پہلی کی قیمت ۱۲؍ ہے اور دوسری کی ۱۲؍ ہے۔ نیز مدرس العربیہ کے نام سے جدید صرف و نحو کی ایک کتاب بھی تیار کرائی گئی ہے۔ اس کی قیمت بھی ۱۲؍ ہے۔ جن حضرات کو عربی سیکھنے کا شوق ہو اُن کے لئے ان کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ایف۔اے، بی۔اے اور ایم۔اے کے طالب علم بھی ان کتابوں سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس طرح دینی مدارس کے طلبہ ان ریڈروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے اور مضامین دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔

ملنے کا پتہ: منیجر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاجپورہ لاہور

اقتباسات از الہلال

اقتباس اوّل از الہلال مورخہ ستمبر ۱۹۱۲ء شمارہ ۵ تا ۹

"انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن۔ اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں جانتے ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اگر دیکھنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہے تو خدا کی دی ہوئی روشنی ہمارے پاس ہے اگر اس سے نظر ہٹالی تو ہم بالکل اندھے ہو جائیں گے۔

کتابٌ انزلناہ الیک لتخرج الناس من — قرآن ایک کتاب ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے تاکہ

الظلمٰت الی النور (۱۴:۱) — وہ انسان کو تاریکی میں سے نکال کر روشنی میں لائے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "سیاسی مباحث کو مذہب سے الگ کر دیجئے" لیکن اگر ہم ایسا کریں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کردہ ہیں ہم انہیں مذہب سے علیحدہ کیونکر کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور سیاست بھی اسی میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے مذہب اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی شکل میں نہیں دیکھا ما قدروا اللہ حق قدرہ۔ ورنہ اپنی پولیٹیکل پالیسی کے لئے نہ تو برطانیہ کے دروازہ پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتدار نے

کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھنے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام انسان کے لئے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لئے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے (بقول مولانا حسین احمد اس میں لچک نہیں) اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے، کسی دوسرے دروازہ کے سائل بنیں۔ وہ ہر زندگی کے لئے ایک اکمل قانون اپنے اندر رکھتا ہے خواہ وہ زندگی اخلاقی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشی، دینی ہو یا دنیاوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین، نورٌ و کتاب مبین، تبیاناً لکل شئیٍ، ہادی الی السبیل، بصائر للناس کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ ۱۰:۵ و ۵:۷

صراط مستقیم کی اصطلاح قرآنی زبان میں ایسی جامع اور مانع ہے کہ ساری دنیا اسی کے اندر سمجھئے۔ ۱۹:۱۲ و ۲۹:۳۹ و ۱۱۱:۱۲ و ۱۳:۸۶ و ۱۱:۳۶ و ۱:۱۰۔

الہلال کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ہر مسئلہ میں خواہ وہ تعلیمی ہو یا سیاسی .... صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔

صہ " آپ پوچھتے ہیں کہ آج کل ہندوؤں کے دو پولٹیکل گروہ موجود ہیں آپ کس کے ساتھ ہیں؟" گزارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں صرف خدا کے ساتھ ہیں اسلام اس سے بہت ارفع اور اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی سیاسی حکمت عملی کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ بلکہ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی سیاسی تعلیم کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل

ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے ہیں۔ ان کا خود اپنا راستہ موجود ہے۔ خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کے بندے اغیار کے سامنے بھی جھکیں

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ (۴ : ۱۱۶)

پس سیاسیات میں بھی الہلال کی دعوت یہی ہے کہ نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہو جیے اور نہ گورنمنٹ پر بے جا اعتماد کیجئے صرف اس راہ پہ چلیئے جو اسلام کی صراط مستقیم ہے۔

ہندوستان میں ہمارا طریق حیات

(ا) اساس اولین توحید ہے۔

(ب) مسلمان خیر الامم ہیں لہٰذا اپنے اندر خودداری پیدا کیجئے۔

(ج) زندگی عدل و اعتدال پر مبنی کیجیے۔ جعلناکم امۃ وسطا

(د) دُنیا کو امن کا پیام دیجیے۔

(ہ) تعاونوا علی البر و التقویٰ۔

(و) شخصی اقتدار کی مخالفت کیجیے۔

(ز) ید اللہ علی الجماعۃ

(ح) اسلام کے نزدیک وہی حکومت جائز ہو سکتی ہے جو شخصی نہ ہو بلکہ کسی ملت یا قوم کے ہاتھ میں ہو۔ اسی بنا پر اس نے مشورہ کا حکم دیا۔ ۲۹:۳۳ و ۳۶ : ۴۲۔ الغرض ہماری پالیسی یہ ہے ۱۴ : ۴۲ ۔

اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی پولٹیکل رہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اس کو یہی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔

اقتباس دوم از الہلال ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۵

"مسلمانوں کے لئے تمام عالم میں صرف ایک ہی ہاتھ ہے جو رہنما ہو سکتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ ۴۲:۳۹ و ۶۵ و ۲۷

مسلمانوں کی ناکامی کی علت حقیقی یہی ہے کہ جب کبھی کوئی تحریک شروع کی اور اپنے لئے کسی پالیسی کا پروگرام مرتب کیا تو قرآن کریم کو فراموش کر دیا۔

افسوس ہے کہ ان کے سامنے ہندوؤں کی سیاسی جدوجہد کے سوا کوئی مستقل اور علیحدہ راہ نہیں ہے وہ اپنی ترقی کا سدرۃ المنتہی یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کے قدم بقدم چلنا سیکھ جائیں۔ پیروان امام مبین کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مذہبی موت نہیں ہو سکتی کہ اعمال زندگی کے ایک ضروری شعبہ میں اسلام ان کو تعلیم دینے سے مجبور رہ گیا ہو اور وہ دوسری قوم کے دسترخوان کی پچوڑی ہوئی ہڈیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو مناسب ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے دنیا کو ایسے مذہب کی ضرورت نہیں جو صرف نکاح و طلاق کے موقع پر چند آیات پڑھ دینے یا البتہ مرگ پر یٰسین دہرا دینے ہی کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔

اسلام کے دامن تقدیس پر اس سے بڑھ کر بدنما دھبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ مسلمان حریت اور فلاح کا سبق دوسری قوموں سے لیں۔

جس طرح اسلام کا خدا اپنی ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے اسی طرح اس کا قرآن بھی اپنی جامعیت اور کمال تعلیم میں وحدہٗ لاشریک ہے اور اس کا رسول بھی اپنی قوت اصلاح میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ ۸/۹۲

پس مسلمان اگر زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بن کر ہی۔ آپ کے ہاں شمع کا فوری بانی

ہے تو آپ کو کسی فقیر کے گھر سے دیا جلانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے فرض کیجئے کہ کل ہندوؤں کو اپنی پالیسی بدل دینی پڑی تو کیا مسلمان بھی اپنے اماموں کے ساتھ اپنی نمازیں توڑ دیں گے؟ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے لئے ایسی راہ پیدا کریں جو مستقل ہو اور ان کی مخصوص راہ ہو اور اس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ مسلمانوں کی راہ ہے۔"

اقتباس سوم از الہلال ۱۶ اکتوبر ۱۲ء صفحہ ۵

"میری دعوت کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان محض سیاست ہی کو اپنا مقصود نہ بنائیں .... ان کو صرف اپنے اوپر نظر رکھنی چاہئے کیونکہ ان کے پاس وہ شے ہے جو اوروں کے پاس نہیں ہے اور جس کو مقصود بنا کر وہ ان تمام چیزوں کو بھی بوجہ احسن حاصل کر سکتے ہیں جو اور قومیں حاصل کر رہی ہیں پس لازم ہے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس شے کو اپنا نصب العین بنائیں جس کی تلاش میں انہیں گھر سے نکلنے کی بھی ضرورت نہیں ہے یعنی اتباع دین مبین اور اعتصام بحبل اللہ۔ ان کے لئے ان کے خدا کی طرف سے ایک دائمی نصب العین موجود ہے اور ایک مسلمان کے لئے اس کے سوا اور کوئی مقصود نہیں ہو سکتا۔

اگر انہوں نے اپنے معتقدات اور اعمال کے اندر اسلامی روح پیدا نہ کی تو ان کی تمام جدوجہد بیکار جائے گی۔ ۲: ۷۹

مسلمانوں کے لئے سیاسی پالیسی کے تغیر میں کوئی برکت نہیں ہو سکتی اگر ان کے اندر مذہبی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔

ان کو نہ تو پولیٹکل پالیسی کی تلاش میں وقت ضائع کرنا چاہئے اور نہ کانگریس کی رپورٹوں میں اپنے لئے نسخۂ فلاح ڈھونڈنا چاہئے بلکہ اپنا ہاتھ خدا کے ہاتھ میں دے دینا چاہیئے۔

ان کی اپنی کوئی خواہش نہ ہو کوئی پالیسی نہ ہو۔ ان کی خواہش اور پالیسی صرف اتباع قرآن ہو

اقتباس چہارم از الہلال ۲۳۔ اکتوبر ۱۲ء بمد ۵

مسلمانوں کے امراض کی اصلی علت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھوں نے قرآن کو چھوڑ دیا اور سعی اصلاح و ترقی کا جو قدم اٹھایا وہ مذہب سے الگ رہ کر اٹھایا۔

ہمارے لیڈروں نے دین اور دنیا کے اندر تفریق کی ایک ایسی مجنبیل حائل کر دی ہے جو روز بروز وسیع ہوتی جاتی ہے۔

بہت سے لوگ اس خیال پر متعجب ہیں کہ مسلمانوں کی سیاسی پالیسی بھی قرآنی تعلیمات پر مبنی ہونی چاہیئے۔ CF: THE ATTITUDE OF PRESENT DAY CONG-RESS MUSLIAMS PLEASE.

ہمارے اعتقاد میں سب سے بڑی یزداں فراموشی اور الحاد پرستی تو یہی ہے کہ ایک گروہ (کانگریسی علماء) مسلمانوں کی اصلاح کا دعوی کرے اور پھر اپنے کاموں کے لئے اسلام کو چھوڑ کر انسانی خیالات (گاندھی و نہرو) کے اصنام وطواغیت کو اپنا حکم بنائے! ۴ : ۴۴ : ۱

اگر یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی دین اور دُنیا دونوں ایک ہیں تو ہمارے لیڈروں کی حالت اس سے بالکل متضاد ہوتی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ ایک ایسی جماعت ہوتی جس کے دل اور زبان دونوں میں اسلام ہوتا وہ از سرتا پا مذہب کی تصویر ہوتے! ان کی زبان کھلتی تو مذہب کے لئے اور قلم حرکت کرتا تو مذہب کے نام پہ!

ہمیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ ان کے سر پہ کیا ہے (HAT OR TURBAN) مگر اس سے کیونکر غفلت کریں کہ ان کی زبان پر کیا ہے

ہاتھ پر تیل کی مالش کرنے سے مردہ میں حرکت پیدا نہیں ہو سکتی اصلی شے روح ہے...

جسمانیات کی زندگی کا بھی یہی حال ہے سیاست تمدن تعلیم اصلاح معاشرت تمام چیزیں ضروری ہیں مگر ان سب کی زندگی روح پر موقوف ہے۔ . . . اور قوموں کے لئے صرف سیاست حیات بخش ہو تو ہو مگر مسلمانوں کے لئے جن کا سارا کاروبار حیات مذہب ہی کے دم سے ہے وہ روح مذہب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی ۴۴ : ۵

ہمارے ملکی بھائی، (ہندو) اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح اور قومیں بھی لیکن مسلمانوں کی تو کوئی علیحدہ قومیت ہی نہیں جو کسی خاص نسل و خاندان یا زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہ دیں گے اس وقت تک، نہ ان میں قومیت کی روح پیدا ہو سکے گی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا قوم اور وطن کے نام میں جو تاثیر اپنے لئے رکھتی ہے مسلمانوں کے لئے وہ اثر صرف اسلام یا خدا کے لفظ میں ہے۔

مسلمان راکھ کے ڈھیر کو پھونک رہے ہیں ان کی محنت میں کوئی شک نہیں مگر اسے کیا کیجئے کہ راکھ کو پھونکنے سے آگ پیدا نہیں ہو سکتی۔ ۲۱ : ۱۷

مسلمانوں میں تعلیمی رفتار اب تک کیوں سست ہے؟ آزادی کے ولولے ان کے دلوں میں کیوں نہیں ابھرتے؟ قربانی کی مثالیں کیوں ناپید ہیں؟ ان میں آتش بیان مقرر کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ ان سب کا جواب یہی ہے کہ ملت کے جسم میں روح پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

خلاصۂ مطالب :-

(۱) مسلمانوں کے لئے ہر شے اُن کے مذہب میں ہے پس اگر وہ اپنے اندر سیاسی زندگی پیدا کرنا

چاہتے ہیں تو اس کی جگہ اس شے ہی کو کیوں نہ پیدا کریں جو نہ صرف سیاست بلکہ قومی اعمال
کی ہر شاخ کو زندہ کر دے؟

(۲) قرآن صرف نماز روزہ نہیں بلکہ زندگی کا مکمل قانون ہے اس لئے مسلمانوں کی ہر وہ
پالیسی جو قرآن مبنی نہ ہو ان کے لئے موجب فلاح نہیں ہو سکتی۔

(۳) ان کو اپنا نصب العین صرف قرآن بنانا چاہئے۔ اسلام نعمت ان کو عطا کرنا ہے۔
اسلام

اقتباس پنجم از الہلال ۹ نومبر ۱۹۱۲ء صلا
(۱) مسلمان جب تک اپنے اعمال
میں کوئی عملی مذہبی تبدیلی پیدا نہیں
کریں گے محض سیاسی یا تعلیمی تغیرات یا نظریات ان کے لئے سود مند نہیں ہو سکتیں

(۲) تعلیم، معاشرت، معیشت اور سیاست، چاروں میں ان کو بر بنائے تبدیع اقوام
کوئی راہ اختیار نہیں کرنی چاہئے بلکہ بر بنائے مذہب۔

(۳) امر تنقیح طلب یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے آئندہ کے لئے اپنا سیاسی پروگرام مذہب
کی بنا پر قرار دیا تو ایک خالص سیاسی تحریک (کانگریس) کے مقابلہ میں کیا نتائج مرتب ہونگے؟
اولین اور بنیادی شے تو یہ ہے کہ اگر راہ یقین کی دعوت آپ کے سامنے موجود ہے تو
کب تک شک اور گمان کی طرف کیوں دوڑتے ہیں؟

قرآنی پروگرام	ایمان و یقین پر مبنی ہے۔
انسانی پروگرام	ظن و تخمین پر مبنی ہے۔

نوٹ:- مولوی برکت علی صاحب بی۔اے۔ قصور
* بطانت اور ولایت جو قرآنی اصطلاح میں دوستی اور قلبی تعلق کا نام ہے ایک مسلم اور غیر مسلم میں۔ از روئے
قرآن ناممکن ہے بلکہ وہ تو اقدام بطانت کو گمراہی قرار دیتا ہے "یا ایہا الذین امنوا لا تتخذوا بطانۃ
من دونکم .... الخ

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ کفر و ضلالت اور الحاد و دہریت کو شک اور گمان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کیونکہ انسانی دماغ کی انتہائی سرحد میں بھی یقین کا پتہ نہیں چل سکتا۔

اس کے برعکس مذہب یقین کی دعوت لے کر آتا ہے وہ حقائق میں شک پیدا نہیں کرتا بلکہ یقین کی بشارت دیتا ہے۔

ھذا سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ ۔۔۔۔ الخ (۱۲ : ۱۰۸)

اس نے ہمیشہ منکرین کو یہ الزام دیا ہے۔

مالھم بذلک من علم ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئا (۱۰ : ۳۵ و ۱۱۰ ۔ ۲۰)

پس اگر مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی ان کے مذہبی اعتقاد پر مبنی ہوتی تو جب تک اُن کے دلوں میں اسلام کا اعتقاد باقی ہے اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ان کے ہمسایوں کی پالیسی بدل جائے گی مگر ان کی پالیسی نہ بدل سکے گی کیونکہ اس کی بنیاد کلام اللہ پر ہے۔

اقتباس ششم از الہلال ۲۷۔ نومبر ۱۲ء صفحہ ۱ "ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے میں سب سے زیادہ ضروری چیز ان کے کیریکٹر (طبیعت) کی درستی سمجھتا ہوں اور یہ بلا سیاسی حالت کی درستی کے ممکن نہیں اور سیاسی ترقی قرآن کی متابعت کے بغیر ممکن نہیں۔

بے نفسی جس کی ضرورت ان کو سب سے زیادہ ہے قرآن سے پیدا ہو سکتی ہے اخوت بھی اخلاقی جرأت بھی، حمیت بھی، شوق جمہوری بھی، حریت بھی، قومیت بھی اور مساوات بھی

اقتباس ہفتم از الہلال ۱۱ دسمبر ۱۲ء صفحہ ۷ پس انقیاد اسلامی کے معنی

یہ ہیں کہ اپنی جنس جان و دل کے بہت سے خریدار نہ بنائے بلکہ ایک ہی خریدار سے معاملہ کر لے۔

اسلام کے معنیٰ

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (۳۱ : ۲۱)

اقتباس ہشتم از الہلال ۱۸۔ دسمبر ۱۲ء ص ۹

اصل شئے قوموں کی معنوی طاقت ہے جو اس کے اخلاق کیریکٹر اتحاد اور ہماری اصطلاح میں خشیۃ اللہ (اعمال حسنہ) سے پیدا ہو سکتی ہے

پڑھنے کے لائق کتابیں

عربی اردو ترجمہ حصہ اول از جناب پروفیسر محمد حسن الاعظمی۔ عربی سکھلانے والی ایک جدید کتاب عمہ/

مقالات یوم اقبالؒ عا/ انتخاب الہلال (مولانا آزاد کے مضامین کا مجموعہ) بجلد عمہ/

اقبال کا مطالعہ از جناب نذیر نیازی صاحب مجلد عا/ مقالات الہلال " " " مجلد عا/

مدرس العربیہ حصہ اول از جناب پروفیسر محمد حسن الاعظمی جدید صرف و نحو کی ایک عمدہ کتاب مجلد عا/

فلسفہ عجم علامہ ڈاکٹر اقبالؒ بیجلد عہ/ جوہر اقبالؒ (اقبال نمبر) مجلد عہ/

مولانا محمد علی کے سفر یورپ مجلد عہ/ تعلیمات اقبال بےجلد عـہ

THE GREAT PROPHET	F. K. KHAN DURRANI B.A	1/8/-
MUHAMMAD THE PROPHET.	F. K. KHAN DURRANI B.A.	2/-/-
THE LAST PROPHET.	" " " "	1/4/-
SOME RECENT SPEECHES AND WRITINGS OF MR. JINNAH		4/8/-
MY LIFE . A FRAGMENT	. . . .	5/4/-
ISLAM AT THE CROSSROADS	. . . .	2/-/-
SECRETS OF THE SELF (ASRÁR-I-KHUDÍ)	. . .	3/-/-
THE POET OF THE EAST	.. ..	4/8/-
ASPECTS OF IQBAL.	. . ..	2/-/-

پارہ اول قرآن مجید مطبوعہ پیکو آرٹ پریس ۲ر

قرآن مجید مترجم مطبوعہ پیکو آرٹ پریس قسم پنجم (۳۰) دس دس پاروں کی جلدیں قیمت فی جلد پانچ روپیہ (صہ)

ملنے کا پتہ:- مینیجر اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

حقیقتِ قرآن

(جناب پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی۔ اے آنرز)

مولانا ابو الکلام آزاد نے ترجمان القرآن کے مقدمہ میں حقیقت قرآن کی نگاہوں سے مستوری اور مسلمانوں کی اس کے مطالب سے مہجوری پر نہایت فاضلانہ اور محققانہ انداز میں روحانی کا حصہ ہے) بعض نکات قلمبند فرمائے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان فہم قرآن سے کیوں بیگانہ نظر آتے ہیں۔ چونکہ قرآن فہمی ہمارے جملہ امراض کا علاج شافی ہے اس لئے میں نے سطور ذیل میں ان نکات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے تاکہ عامۃ المسلمین ان کی روشنی میں، ان موانع کا ازالہ کر کے حقیقت تعلیمات قرآن سے آگاہ ہو سکیں۔

(سلیم چشتی)

دنیائے اسلام میں مختلف اسباب کی بدولت، صدیوں سے اس طرح کے موثرات نشو و نما پاتے رہے ہیں جن کی وجہ سے بتدریج قرآن کی حقیقت نگاہوں سے مستور ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ اس کے مطالعہ کا ایک نہایت پست معیار قائم ہو گیا۔

ہر عہد کا مصنف اپنے عہد کی ذہنی آب و ہوا کی پیداوار ہوتا ہے اور اس قاعدہ سے صرف وہی دماغ مستثنیٰ ہوتے ہیں جنہیں قدرت نے مجتہدانہ نظر عطا فرمائی ہو۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرون اخیرہ تک جس قدر مفسرین پیدا ہوئے ان کا طریق تفسیر ایک رو بہ تنزل معیار فکر کی مسلسل تعبیر ہے۔

یہ صورت حال مسلمانوں کے دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھی، اور جب انہوں نے دیکھا کہ وہ قرآن کی بلندی کا ساتھ نہیں دے سکتے تو انہوں نے کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ وہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے

اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی اصل شکل میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں جو مختلف زمانوں میں، خارجی موثرات نے اس کے چہرہ پر ڈال دیئے ہیں۔ پھر ہمیں قرآن کی حقیقت قرآن ہی کے صفحات میں مل سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابلِ غور ہیں:۔

(۱) قرآن اپنی ہر بات میں (وضع، اسلوب، اندازِ بیان، طریقِ خطاب و استدلال وغیرہ میں) دنیا کے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں ہے وہ ہر بات میں بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے۔ اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا اور وہ فطرت کی سیدھی سادھی فکری حالت پر قانع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے قرآن کی معرفت میں دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

لیکن دوسری صدی میں روم و ایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور علوم و فنون وضعیہ کا دور شروع ہوا جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا، قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبائع ناآشنا ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ قرآن کی ہر بات وضعیت اور صناعیت کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی اس لئے طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہونے لگے۔

جب امام رازی نے تفسیر لکھی تو فلسفہ و حکمت کی ترویج و اشاعت کافی ہوچکی تھی چنانچہ انہوں نے بھی حتی المقدور کوشش کی کہ قرآن کا سراپا، اس مصنوعی لباس وضعیت میں سرتاپا پوشیدہ ہو جائے، اسی لئے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان کی تفسیر میں سوائے تفسیر کے اور سب کچھ موجود ہے "اگر امام صاحب اس حقیقت سے آشنا ہو جاتے تو ان کی تین چوتھائی تفسیر بیکار ہو جاتی"

قرآن کے اسلوب بیان، آیات کے مناسبات و روابط، زبان و انشاء اور طریق استدلال کی نسبت لوگوں کو جس قدر مشکلات پیش آتی ہیں، محض اس لئے کہ دمنعیت ہمارے دل و دماغ پر مستولی ہے اور فطرت کے سمجھنے کی استعداد باقی نہیں رہی ''۔

(۲) جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ تو قدرتی طور پر اُن لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے خود صاحب کتاب سے مطلب سمجھا ہو۔ لہذا مذہبی خوش عقادی کی بنا پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر، صحابہؓ کے فہم کو، بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیئے۔ لیکن بد قسمتی سے اخلاف مفسرین نے اسلاف صحابہ کے فہم کو ترجیح نہیں دی۔ بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری موثرات کے ماتحت نئی نئی کاوشیں شروع کر دیں اور اسلاف کی صریح تفسیر کے خلاف ہر گوشہ میں قدم اٹھائے گئے اور یہ کہہ کر دل کو دھوکا دیا گیا کہ ''سلف ایمان میں قوی تھے لیکن علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے ''۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت روز بروز مستور ہوتی گئی۔

مثلاً سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں حضرت ابن عباس اور ابن مسعود سے مروی ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ، الخ سے مقصود عرب کے اہل ایمان ہیں اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ سے اہل کتاب کے اہل ایمان۔

ابن جریر نے بھی یہی تفسیر اختیار کی لیکن بعد کے مفسرین اس پر قانع نہیں ہوئے۔

(۳) نو مسلم اقوام کے قصص و روایات اول دن سے مسلمانوں میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے ن میں سے اسرائیلیات کو محققین نے ہمیشہ چھانٹنا چاہا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے مخفی ثرات دور دور تک سرایت کر چکے تھے اور وہ برابر جسم تفسیر میں پیوست ہیں۔

(۴) ایک طرف تو صحابہ و سلف کی روایات سے تغافل ہوا دوسری طرف تفسیر کے غیر محتاط اصولوں نے الگ آفت بپا کر دی اور یہ تفسیر جس کا سرا کسی نہ کسی تابعی سے ملا دیا گیا سلف کی تفسیر

سمجھ لی گئی۔ متاخرین میں صرف ابن اثیر تنہا مفسر ہیں۔ جو احادیث کے التزام کے ساتھ نقد روایات کا بھی التزام رکھتے ہیں۔

(۵) اس صورت حال کا سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریق استدلال دور از کار دقیقہ سنجیوں میں گم ہوگیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے تمام بیانات کا محور و مرکز اس کا طریق استدلال ہی ہے۔ اس کے ارشادات و بصائر، اس کے قصص و امثال، اس کے مواعظ و حکم اس کے مقاصد و مہمات سب اسی چیز سے ابھرتے تھے یہ گم ہوئی تو سب کچھ گم ہوگیا۔

انبیاء کرام کا طریق استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریق پر نظری مقدمات ترتیب دیں۔ وہ براہ راست تلقین و اذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں جسے ہر دماغ وجدانی طور پر پالیتا ہے لیکن ہمارے مفسرین کو فلسفہ کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی فطری شکل میں قبول کریں۔ انہوں نے انبیائے کرام کی فضیلت اس میں سمجھی کہ انہیں منطقی اور فلسفی بنا دیا جائے اور قرآن کی عظمت اس بات میں سمجھی کہ اس کی ہر بات ارسطو کی منطق کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی نکلے۔ اس سانچہ میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے دلائل و براہین کی ساری دلنشینی نظروں سے گم ہوگئی۔ حقیقت تو گم ہو ہی چکی تھی وہ بات بھی نہ بنی جو یہ لوگ بنانی چاہتے تھے۔ شکوک و ایرادات کے بیشمار دروازے کھل گئے جن کے کھولنے میں تو امام رازی کا ہاتھ بہت تیز نکلا لیکن بند کرنے میں ویسی تیزی نہ دکھلا سکے۔

(۶) یہ آفت صرف طریق استدلال ہی میں پیش نہیں آئی بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی۔ مثلاً منطق و فلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی مصطلحات پیدا کر دی تھیں اور عربی لغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں استعمال ہونے لگے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفۂ یونانی نہیں ہے اور نہ نزول قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی پس جہاں کہیں قرآن میں

وہ لفظ آئے ہیں اُن کے معانی وہ نہیں ہو سکتے جو وضع مصطلحات کے بعد قرار پاگئے ہوں۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ اخلاف نے اُن الفاظ کے وہی معنی لئے جو مصطلحات کے بعد قرار پاگئے تھے۔ اور اس وجہ سے دور از کار بحثوں کا دروازہ کھل گیا۔ مثلاً قدم، حدوث، خلود، احدیت، تثلیث وغیرہ ان الفاظ کے معانی بیان کرنے میں، متاخرین نے وہ وہ موشگافیاں دکھائیں، جن کا صدر اوّل میں کسی سامع قرآن کو وہم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا۔

(۷) رفتہ رفتہ اسی تخم کے برگ و بار، اتباع حکمت کے رنگ میں بھی ظاہر ہوئے یعنی مفسرین نے یہ سمجھ لیا کہ قرآن کو اپنے زمانہ کی تحقیقات علمیہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلموسی، اس کے دامن سے چپکا دیا جائے، جس طرح آج کل کے دانش فروش، نظام کا پرنیکی، اور ہیئت و حکمت کے موجودہ مسائل قرآن سے نکال رہے ہیں۔

(۸) ہر کتاب اور تعلیم کے کچھ مرکزی مقاصد ہوتے ہیں۔ اور اس کی تفصیلات انہی مقاصد کے ارد گرد گردش کرتی ہیں، اور جب تک یہ مقاصد سمجھ میں نہ آجائیں، اس وقت تک دائرہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی قرآن کے بھی چند مرکزی مقاصد و مہمات ہیں، اور جب تک انہیں نہ سمجھا جائے، تفصیلات سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

لیکن متذکرہ صدر اسباب کی بنا پر جب قرآن کے مرکزی مقاصد کی وضاحت باقی نہ رہی تو پھر تفصیلات کس طرح اور کیونکر سمجھ میں آتیں؟ مثلاً آل عمران کی آیت وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ (۱۵۵) کی تفسیر نکال کر دیکھو کہ کیا کیا دور از کار بحثیں نہیں کی گئیں؟ یہود کے اس قول کی تفسیر میں کہ یَدُ اللهِ مَغْلُولَةٌ (۶۹) کن کن گوشوں میں نکل گئے۔ محل بیان، سیاق و سباق اور اقتضائے عقل، ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا

(۹) قرآن کی صحت فہم کے لئے عربی لغت و عربی ادب کا صحیح ذوق شرط اول ہے لیکن مختلف اسباب سے جن کی تشریح محتاج تفصیل ہے، یہ ذوق کمزور پڑتا گیا، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب

طالب میں الحاد محض اس وجہ سے پڑے کہ مسلمانوں میں عربیت کا ذوق سلیم باقی نہیں رہا اور جس زبان میں قرآن نازل ہوا تھا اس کے محاورات و مجازات سے بُعد ہوتا گیا۔

(۱۰) ہر عہد کا فکری اثر تمام علوم و فنون کی طرح تفسیر میں بھی کار فرما رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ تاریخ اسلامی میں یادگار رہے گا کہ علماء حق نے، وقت کے سیاسی اثرات کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے لیکن وقت کی تاثیر صرف سیاست ہی کے دروازہ سے نہیں آتی، اس کے نفسیاتی موثرات کے دروازے بیشمار ہیں۔ اور جب ایک دفعہ کھل جاتے ہیں تو پھر بند ہونا معلوم۔ اُن کے استیلا سے عقائد محفوظ رکھے جا سکتے تھے اور علماء حق نے محفوظ رکھے لیکن دماغ محفوظ نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ محفوظ نہیں رہے۔ مثلاً جب تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں غیر اسلامی نظام تصورات بھی افکار، علی الخصوص غیر اسلامی تصوف اور حکمائے اشراق کے عقائد، اسلامی تصوف میں داخل ہونے لگے تو کچھ عرصہ کے بعد قرآن مجید وحدت الوجود اور وہدانت کا سب سے بڑا وکیل بنا دیا گیا اور اس کے ہر صفحہ سے لا موجود الا اللہ کی صدا آنے لگی۔

(۱۱) چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا۔ تقلید کی رسم عام ہو گئی۔ اس وارعضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی چنانچہ کورانہ تقلید کے زیر اثر، ہر مفسر کے لئے ضروری تھا کہ کسی سلسلہ کو سامنے رکھے اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلتا رہے مطلب یہ کہ اشاعرہ و ماتریدیہ نے تقلید کا صور اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ مسلمانوں کی علمی و عملی زندگی کا ہر شعبہ تقلید میں گرفتار ہو گیا تفسیر نویسی بھی اسی ذیل میں آ گئی حتیٰ کہ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی تو ضروری تھا کہ وہ آئندہ تفاسیر میں نقل ہوتی چلی جائے۔ اسلاف پر نکتہ چینی کرنے یا شخصی مسئلہ کے متعلق، خواہ وہ مسئلہ قرآن سے تعلق رکھتا ہو یا حدیث سے۔ ذاتی تحقیق [illegible]

جبکہ ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کسی مفسر یا محدث کی یہ جرأت کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ متقدمین سے انحراف کر کے اور آفات ارضی بن جائے؟

بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ کسی نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کر لے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔"

(میں کہتا ہوں کہ وہ بیچارے تقلید سے الگ کس طرح ہو سکتے تھے جبکہ تمام دنیائے اسلام ذہنی اور علمی اور عقلی غلامی میں گرفتار تھی، تقلید بلکہ کورانہ تقلید ان کا شعار تھا اور اکثر بزرگوں نے تقلید شخصی کو واجب قرار دے دیا تھا، وہ تحقیق کرتے بھی کیوں جبکہ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ در اجتہاد قیامت تک کے لئے بند ہو چکا ہے۔ کد وکاوش اور تحقیق و تدقیق کے لئے جب کوئی محرک خارجی ہی موجود نہ تھا تو بیچارے مسلمان قرآن سے اعتنا کیوں کرتے؛ کیا اُن کے لئے انبار در انبار تفاسیر اور فقہی اور کلامیہ بحثیں کافی نہ تھی؛ انہی کی بھول بھلیوں میں سے نکلنے کے لئے عمر خضر درکار تھی، قرآن تک کیسے پہنچتے؛ میرا اپنا خیال تو یہی ہے کہ مسلمانوں کی تمام ذہنی پستی کے ذمہ وار وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے کورانہ تقلید کا جال بچھایا، اور معقول وضمائر انسانی کو اس کے اندر پھانسا۔ اسی تقلید کی بدولت چار پانچ سو سال کے بعد مسلمانوں کے اوپر جمود و خمود کی کیفیت طاری ہو گئی جو آج بھی موجود ہے اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد مولانا ثناء اللہ صاحب اکبر مرحوم، حالی، شبلی، نذیر احمد اور سب سے بڑھکر علامۃ العصر حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کے پیغام کی بدولت یہ جہالت دور ہوتی جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس بیسویں صدی کے آخر میں ایک جماعت ضرور ایسی پیدا ہو جائے گی جو قرآن کی طرف لوگوں کو بلانے کو مقصد حیات قرار دے گی۔ سلیم)

"رفتہ رفتہ تفسیر نویسوں کی ہمتیں ایسی پست ہو گئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا

دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیوں کو دیکھو کہ ایک بنے ہوئے مکان کی
لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائیگاں گئی ہے۔ اگر تقلید کا سحر کارگر نہ ہوا ہوتا
یہ لوگ خود بیضاوی سے بڑھ چڑھ کر تفسیریں لکھ سکتے تھے جس طرح ابن سینا اور ابن رشد نے
ارسطو سے بڑھ کر فلسفہ میں موشگافیاں کر سکتے تھے لیکن یہ لوگ مدت العمر اس یونانی جادوگر کے
شعبدوں میں گرفتار رہے۔

(۱۲) زمانہ کی بد ذوقی نے بھی ہر بدذوقی کو سہارا دیا، تقلید کی وجہ سے ذہنیت پست ہوئی اور
کی وجہ سے معیار حسن پست ہو گیا۔ اس پر جہالت نے طبائع کو غور و فکر کی نعمت سے محروم کر دیا
یہ ہوا کہ قرون اخیرہ میں درس و تداول کے لئے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جن میں دل خوش کن
کا کافی ذخیرہ موجود تھا یا جو قدماء کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔ وقت کا یہ سوء انتخاب ہر عہد
میں جاری رہا ہے۔ جو زمانہ جرجانی پر سکاکی کو اور سکاکی پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا، یقیناً اس
دربار سے جلالین اور بیضاوی ہی کو حسن قبول کی سند مل سکتی تھی یا مدارک و معالم کی قدر
ہو سکتی تھی۔

(۱۳) متداول تفاسیر کو اٹھا کر دیکھو جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں
اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا۔ جو اقوال نقل کریں گے
میں بہتر ہی قول موجود ہوگا، لیکن اسے نظر انداز کر دیں گے محض اس لئے کہ اخلاقی جرأت اور
تحقیق کا مادہ دونوں مفقود ہو چکے ہیں۔ ڈرتے ہیں مبادا اپنی تحقیق پیش کرنے سے کفر کا فتویٰ
لگ جائے اور عوام میں مردود ہو جائیں۔

(۱۴) اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے بھی کھل گیا، جس کے اندیشہ سے
کی روحیں لرزتی رہتی تھیں۔

تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ اس کی ممانعت سے یہ مطلب نہ تھا کہ قرآن کے مطلب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے یا اس کی تفسیر کرنے میں عقل و درایت کو دخل نہ دیا جائے کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا یہ حال ہے کہ اوّل سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ؟

تفسیر بالرائے میں "رائے" بمعنی لغوی نہیں بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری قرار دادہ رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر، اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے؟ ہم پہلے ایک بات کو بطور عقیدۂ اسلام قرار دیتے ہیں پھر آیات کو توڑ مروڑ کر، اس بات کی تائید میں پیش کر دیتے ہیں۔ قطع نظر اس امر سے کہ قرآن اس عقیدہ کا حامی ہے یا نہیں"۔

مثلاً جب باب عقاید میں ردّ و کد شروع ہوئی تو مختلف مذاہب کلامیہ پیدا ہو گئے ہر مذہب کے مناظرین نے، نصوص قرآنیہ کو اپنے مخصوص عقائد کے سانچہ میں ڈھال دیا وہ اس جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس فکر میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو اپنے خیالات کا مؤید دکھلا دیں، اسی طرح متکلّمین کے علاوہ معتدّین، متصوّفین، اور پیروان فلسفہ مشائین نے نصوص قرآنیہ کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح تحریف معنوی کا شکار بنایا کہ ان کی تفاسیر یقیناً تفاسیر بالرائے کہلانے کی مستحق ہیں۔

آج کل ہندوستان اور مصر کے دانش فروشوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زمانۂ حال کے اصول علم و ترقی، قرآن سے ثابت کئے جائیں یا اس کی ہر آیت کو فلسفہ جدیدہ کا حامل ثابت کیا جائے اور اس کے ہر لفظ میں سائنس کے کرشمہ بھر دیئے جائیں۔ گویا قرآن صرف

سی سے نازل ہوا ہے کہ جو بات افلاطون اور ارسطو نے ہیگن اور ڈیکارٹ نے کاپرنیکس اور نیوٹن نے ڈارون ورڈ ویلیس (WALLACE) نے دریافت کی ہو اُسے پہلے معموں کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرے پھر موجودہ زمانہ میں مفسرین یا متکلمین ان نکات کو بیان فرما دیں ۔ ملہ

ملہ پہلے زمانہ میں شیعوں نے اور موجودہ زمانہ میں مرزائیوں نے تفسیر بالرائے کے فن میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ شیعوں نے وہ وہ باتیں حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ سے منسوب کیں جو خود ان کی سمجھ میں نہ آئی ہوں گی اور مرزائیوں نے وہ وہ نکتے حل کئے جو خود مرزا کے خیال میں بھی نہ گزرے ہوں گے ۔ مثلاً جب مفسرین قادیاں کو مرزا کا نام قرآن میں صریحی طور پر دکھانے کی خواہش دامنگیر ہوئی تو خداوندان حل وعقد نے بیک جنبش قلم "هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ الخ" کو مرزائے قادیاں سے منسوب کر دیا کہ وہ رسول آپ ہی ہیں" یاتی من بعدا سمہ احمد" کا مصداق بھی مرزا صاحب ہی کو قرار دیا گیا یعنی اُستاد (Master Prophet) کو اُتار کر شاگرد اور امتی اور غلام کو، اس کی جگہ فائز کر دیا گیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ه

اور یہ وہ تحریف معنوی ہے جس کی جسارت خود مرزا صاحب سے بھی نہ ہو سکی، لیکن بقول شخصے ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند ۱۲

اسی طرح جب موجودہ شیخ قادیاں کو اپنے والد کی موت کے اثبات کا شوق دامنگیر ہوا تو انہوں نے نہایت خیرہ چشمی کے ساتھ "وبالآخرۃ ھم یوقنون" میں آخرت کے معنی اُس آخری وحی کے قرار دے دیئے جو آپ کے پدر بزرگوار پر نازل ہوئی تھی ۱۲ تعالی اللہ عما یصفون ه

حالانکہ قرآن کو تو کیا، خود مرزا صاحب کو بھی یہ علم نہ تھا کہ میری وفات کے صرف چند ماہ بعد میری اُمت غلو کے اصول پر چلکر آخرت کے معنی آخری وحی کرنے لگے گی۔

نکتہ | بعض مخلص مرزائی نہایت رقت انگیز پیرایہ میں شیعوں کی اس گستاخی کا ذکر کیا کرتے ہیں جس

کا ارتکاب انہوں نے سورۂ جمعہ کی ابتدائی آیات کو حضرت علی کی ذات سے منسوب کرکے کیا ہے
بیشک شیعوں نے سخت غلطی کی لیکن ان درد مندان اسلام نے تو شیعوں کے بھی کان کاٹ لئے ۔
اگر انہوں نے علی کو "رسول" قرار دیا تو ان حضرات نے غلام کو "مسیح" "آقا" بنا دیا۔ مرزا کو اسمہ احمد کا
مصداق قرار دے کر اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کے بجائے ان کو حضرت احمد
علیہ السلام" لکھتے ہیں میرا خیال ہے کہ یہ باتیں دجل و فریب، مکر و غدر اور تحریف و تدلیس کی وہ
جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ جن کی نظیر غالباً شیخ الجبل کے کارناموں میں بھی مشکل سے نکلے گی۔

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

القراءة الاعظمية

ہندوستان کے مایۂ ناز عربی ادیب پروفیسر محمد حسن الاعظمی نے جو حال ہی میں جامعہ مصریہ قاہرہ میں تاریخ و ادب اُردو کے پروفیسر تھے اور جنہوں نے مصر کے بلند پایہ ادبی پرچوں میں بے شمار مقالات اقبال اور فلسفۂ اقبال پر لکھ کر شائع کئے ہیں اور جو ہماری خوش بختی سے اس وقت ہندوستان آئے ہوئے ہیں اقبال اکیڈیمی کی فرمائش پر جدید عربی زبان میں نہایت دلچسپ ریڈریں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک ریڈر طبع ہو چکی ہے اور دوسری زیر طبع ہے علاوہ ازیں مدرس العربیہ کے نام سے جدید طرز پر صرف و نحو کی ایک کتاب بھی شائع کی گئی ہے ہمارا خیال ہے کہ ان ریڈروں کے مطالعہ سے عربی زبان بہت جلد سیکھی جا سکتی ہے یہ کتابیں ہمارے کلیۃ اللغۃ العربیہ کا نصاب ہیں جو حضرات ان کتابوں کو منگوانا چاہیں وہ پتہ ذیل سے منگوا سکتے ہیں۔

القراءۃ الاعظمیہ جزء الاول عہ۔ جزء الثانی عہ۔ مدرس العربیہ جزء الاول مجلد عہ۔

مینجر اقبال اکیڈیمی ۔ ظفر منزل ۔ تاج پورہ ۔ لاہور

مسلمانوں سے

(از جناب کامل جونپوری)

اے مسلماں اے گرفتار خودی
آ کروں کچھ تجھ سے باتیں راز کی
فکر جس ملت کی ہوتی ہے خراب
گھیر لیتے ہیں اسے صدہا عذاب

تنگ ہو جاتی ہے اس کی کائنات
وہ سکوں ہی کو سمجھتی ہے حیات
راز ہست و بود کو جانا نہیں
حیف تو نے خود کو پہچانا نہیں

باز ہو کر باز کی خو چھوڑ دی
تجھ کو نازیبا ہے ایسی بزدلی
دیکھ اک سیلاب ہے تجھ میں نہاں
جس کے آگے ہیچ ہے کوہ گراں

بندۂ حق ہو کے تو غافل نہ ہو
دیکھ یوں بیگانۂ منزل نہ ہو
اٹھ کے دنیا کو نیا پیغام دے

تازہ درس عظمت اسلام دے

مرد مومن موت سے ڈرتے نہیں
سچ تو یہ ہے وہ کبھی مرتے نہیں
مجھ کو ہوتا ہے ملال اس بات کا
ہائے کیا تھا اور تو کیا ہو گیا

اُٹھ کہ تازہ انقلاب آنے کو ہے
پھر ترا گذرا شباب آنے کو ہے
اٹھ اور اپنے عزم و استقلال سے
فکر کر دنیائے نو کے واسطے

آس نہ ٹوٹے

(از جناب ابو السلام نعیم صدیقی)

م نگاہی ! رحم، الٰہی شور، زمین ہے نم بھی نہیں ہے
وادی کمزور راہی روئیدگی یاں کم ہی کہیں ہے
کانٹے بھی ٹوٹے
پر بیج بو دے
ے پھوٹے! آس نہ ٹوٹے پھوٹے نہ پھوٹے آس نہ ٹوٹے
خاکی! آس نہ ٹوٹے آدم خاکی آس نہ ٹوٹے

مے جام میں لا   دل دام میں لا   تہذیب تازہ!   یہ دلنوازہ
مرنے سے پہلے   جاں کام میں لا   دھوکا ہی دھوکا   غازہ ہی غازہ
یہ جنس تیری   رنگوں کا جادو
موت نہ لوٹے   آس نہ ٹوٹے   سب بیل بوٹے   آس نہ ٹوٹے
آدم خاکی   آس نہ ٹوٹے   آدم خاکی!   آس نہ ٹوٹے

تو اجنبی ہے   بستی نئی ہے   آنکھوں کو سی کر   خود زہر پی کر
یاں تو نرالی   سوداگری ہے   انساں سے کہہ دو   مرنے کو جی کر
کھوٹے ہیں سکے   اب سر نہ پیٹے
مال ہیں جھوٹے   آس نہ ٹوٹے   سینہ نہ کوٹے   آس نہ ٹوٹے
آدم خاکی!   آس نہ ٹوٹے   آدم خاکی   آس نہ ٹوٹے

شرم! شرم

(از جناب ابو السلام نعیم صدیقی)

افسانہ کہہ رہے ہیں

مٹی کی گیند پر ہم   مدت سے رہ رہے ہیں
اور سیل روز و شب میں   ناچار بہہ رہے ہیں
خود آپ اپنے ہاتھوں   سو رنج سہہ رہے ہیں

ہم جب سے رہ رہے ہیں — بے زندگی رہے ہیں

اور پھر بھی جی رہے ہیں

ہر ایک در پہ جا کر

غیور آبرو کی — گردن جھکا جھکا کر
بندوں کو بندگی سے — آقا بنا بنا کر
آزادیوں کی دولت — ان پر لٹا لٹا کر
اپنا لہو پلا کر — خود زہر پی رہے ہیں

اور پھر بھی جی رہے ہیں

خود اس سر لیا بلا کو

گردن پہ خود بٹھایا — اک "پیرِ تسمہ پا" کو
انسان کو دے کے شاہی — چھوڑا گیا خدا کو
اب مشرق اور مغرب — روتے ہیں "ماسعیٰ" کو
اصنامِ بے وفا کو — پھر پوج بھی رہے ہیں

اور پھر بھی جی رہے ہیں

جنگوں کی بے پناہی

اور تاجروں کے ہاتھوں — لائی ہوئی تباہی
امن و سکوں کا حافظ — اب رہ گیا خدا ہی
بربادیوں کی ماں ہے — انساں کی پادشاہی
اپنا کفن، الٰہی! — ہم آپ سی رہے ہیں

اور پھر بھی جی رہے ہیں

جم کی شہنشہی ہو

جمہور کا ہو غلبہ قوموں کی برتری ہو
یا اپنی خواہشوں کو لوگوں نے ڈھیل دی ہو
قانون حق پہ غالب قانون آدمی ہو!
گمراہ دیں، کوئی ہو کمزور ہی رہے ہیں

اور پھر بھی جی رہے ہیں!

ہاں جان لو، عزیزو!

بحر جہاں میں اٹھا طوفان! لو، عزیزو
کاغذ کی ناؤ ہے اب حیران! لو، عزیزو
اور ناخدا اب اس کے پہچان لو، عزیزو
پہچان لو عزیزو! دشمن یہی رہے ہیں

اور پھر بھی جی رہے ہیں

چھوڑو یہ مست خوابی

اٹھو بدل بھی ڈالو اودا ر آفتابی
تڑپا رہی ہے مجھ کو باطل کی کامیابی
دنیا دہی ہے اب تک ہر سو وہی خرابی
پر سوچ انقلابی ہم کیوں وہی رہے ہیں

اور پھر بھی جی رہے ہیں